مسیحیت

ایک سفر

حقائق سے فسانہ تک

حضرت مرزا طاہر احمد

مسیحیت

ایک سفر حقائق سے فسانہ تک

Christianity—A Journey from Facts to Fiction

سیدنا حضرت مرزا طاہر احمد خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ کی معرکہ آراء
انگریزی تصنیف کا اردو ترجمہ
از مکرم مسعود احمد خان صاحب دہلوی (سابق ایڈیٹر روزنامہ الفضل)

مسیحیت۔ ایک سفر حقائق سے فسانہ تک

(*Maseehiyyat–Eik Safar Haqaaiq sei Afsanah tak*)

An Urdu rendering of
Christianity—A Journey from Facts to Fiction
by
Hazrat Mirza Tahir Ahmad[rta]
Khalifatul-Masih IV

Translated by: Masood Ahmad Khan Dehlavi

First published in English in the UK, 1994
Present Urdu translation published in the UK, 2021

© Islam International Publications Limited

Published by:
Islam International Publications Ltd
Unit 3, Bourne Mill Business Park,
Guildford Road, Farnham, Surrey, GU9 9PS
United Kingdom

Cover designed by Waqas Ahmad

Printed in the UK at:
Raqeem Press, Farnham

ISBN: 978-1-84880-247-6
10 9 8 7 6 5 4 3 2 1

فہرست مضامین

عرض ناشر vii

پیش لفظ ix

باب اوّل 1

ابنیتِ مسیح کی اصل حقیقت 1

ماں باپ بننے کی سائنسی بنیاد 2
کیا خدا کا کوئی حقیقی بیٹا ہونا ممکن ہے؟ 4
ہرمافروڈٹ ازم (Hermaphroditism) 6
پارتھینو جینیس (Parthenogenesis) 6
معجزات کیا ہوتے ہیں؟ 7
مسیح کی ابنیت سے پیدا ہونے والے اشکال (مسیح خدا کا بیٹا) 10

باب دوم 17

گناہ اور کفّارہ 17

بنی نوع انسان کی طرف سے کفّارہ کی ادائیگی 18
آدم اور حوّا کا گناہ 19
انسانی دکھوں کے تسلسل کا جاری رہنا 22
ورثہ میں ملنے والا گناہ 25
گناہوں کا آئندہ نسلوں میں منتقل ہونا 27
سزایابی کے سلسلہ کا جاری رہنا 30
عدل اور معاف کر دینے کی صفت 37
مسیح کے لئے کفارہ ادا کرنا ممکن نہ تھا 42
مجبوری اور بے دلی کی آئینہ دار قربانی 44
قربان کسے کیا گیا؟ 48
قدرتی طور پر مسیح کو لاحق ہونے والی تشویش 49
کیا "باپ خدا" نے بھی دکھ جھیلا؟ 51
آگ کی سزا 53
خدا کی قربانی اور روحانی عظمت 54
مسیح کے تعلق میں موت کا مفہوم و مطلب 55

غیر محدود گناہوں کی برائے نام سزا 57
کفارہ نے تبدیلی کیا پیدا کی؟ 59

باب سوم 61

رُوحُ القُدُس کا عمل و کردار 61

روح القدس اور تخلیق کا آسمانی منصوبہ 63
سربستہ راز یا مہمل و متناقض اچنبہ 65

باب چہارم 69

صلیب اور اس سے متعلقہ امور 69

یونس نبی کا نشان 71
اسرائیل کے گھرانہ سے مسیح کا وعدہ یا پیمان 73
صلیب دیئے جانے کے واقعات 75

باب پنجم 87

زندگی کی بحالی یا احیائے موتیٰ؟ 87

خدا کے مقدّس نبی کے خلاف جگر پاش زبان درازی 99
آسمان کی طرف اٹھایا جانا 103
مسیح کے جسم کے ساتھ کیا گزری؟ 105
احمدی مسلمانوں کا نقطۂ نظر 109
قریب المرگ لوگوں میں زندگی بحال ہونے کے بعض واقعات 110

باب ششم 115

تثلیث 115

تثلیث کے عناصر ترکیبی کے باہمی رشتہ کی نوعیت 117
ایک ہی یعنی اکیلی ہستی کی مختلف حیثیتیں یا مختلف پہلو 117
ابدیت میں شریک مختلف ہستیاں 119
مختلف خصائص و کردار رکھنے والی شخصیتیں 123
یکساں اور مساوی خصوصیات رکھنے والی مختلف ہستیاں 128

باب ہفتم 133

مسیحیت کا ارتقا 133

مسیح پر ایمان لانے والے اور ابتدائی پیرو 134

پولوس کا کردار 137
مسیح کی اصل حقیقت 139
مذہب کا تسلسل 142
مذہبی ترقی کی معراج 143

باب ہشتم 147

مسیحیت آج کے دور میں 147

مسیحیت اور نو آبادیاتی نظام 147
مسیح کی بعثت ثانی 152
بعثت مسیح موعود علیہ السلام 158
اختتامی الفاظ 166

ضمیمہ 173

عرضِ ناشر

کتاب Christianity–A Journey from Facts to Fiction کا اردو ترجمہ 'مسیحیت۔ ایک سفر حقائق سے فسانہ تک' کا اردو ترجمہ قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ کی یہ تصنیف عیسائیت کے بنیادی عقائد کا عقلی و نقلی دلائل کے ذریعہ محاکمہ ہے جس میں ابنیّتِ مسیح، کفارہ، تثلیث اور دیگر اہم موضوعات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور ان عقائد کا غلط ہونا ثابت کیا ہے۔

انگریزی میں یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۹۴ء میں انگلستان سے طبع ہوئی تھی اور اس کے مختلف زبانوں میں تراجم بھی طبع ہو چکے ہیں۔ زیر نظر اردو ترجمہ محترم مسعود احمد خان دہلوی صاحب مرحوم (سابق ایڈیٹر روزنامہ الفضل) نے تیار کیا تھا جو قبل ازیں بالاقساط الفضل انٹرنیشنل میں طبع ہو چکا ہے اور اب اس کی پہلی مرتبہ کتابی شکل میں طباعت کی جارہی ہے۔ کتاب ہذا کی پروف ریڈنگ و فارمیٹنگ کے سلسلہ میں مکرم سید تنویر مجتبیٰ صاحب نے تعاون کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر سے نوازے۔ آمین

خاکسار
منیر الدین شمس
ایڈیشنل وکیل التصنیف
مئی ۲۰۲۱ء

پیش لفظ

موجودہ دنیا کے تناظر میں مسیح کی ذات کو بوجوہ غیر معمولی اہمیت حاصل ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی ذات کی یہ غیر معمولی اہمیت صرف مسیحی دنیا تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ دوسرے مذاہب اور ان میں سے علی الخصوص یہودیت اور اسلام کے نزدیک بھی مسیح کی ذات کچھ کم اہمیت کی حامل نہیں۔ اگر مسیح کی ذات کی نوعیت وماہیت اور اس کی آمد اول اور موعودہ آمد ثانی کے بارہ میں وسیع اثرورسوخ رکھنے والے یہ مقتدر مذاہب کسی ایک مشترکہ تفہیم یا نظریہ پر باہم متفق ہو جائیں تو اس سے ان بہت سے مسائل کے حل ہونے کی راہ ہموار ہو سکتی ہے جس سے فی زمانہ نوع انسانی دوچار ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ مسیح کی زندگی سے تعلق رکھنے والے حقائق، اس کی آمد کے مقصد، اس کی نظریاتی بنیاد اور اس کی شخصیت یا ذات کو صحیح طور پر سمجھا ہی نہیں گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اس کی زندگی کے ان جملہ پہلوؤں کو عجیب وغریب معانی پہنا دیئے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ مسیح کی ذات اور زندگی کے ان سب پہلوؤں کے متعلق جملہ مذاہب کے ادراک و نظریات میں اس قدر شدید اختلاف پایا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے خود مذاہب کے مابین گہری رقابت اور مخاصمت کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔

جب ہم مسیح کو صلیب دیئے جانے کے حقائق وواقعات پر نظر ڈالتے ہیں اور جو کچھ وقوع پذیر ہوا اس پر غور کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ ایسا کیوں اور کس طرح ہوا۔ اور پھر نجات کے مسیحی نظریہ اور اس کی فلاسفی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں مختلف ابتدائی ماخذوں سے ان سب امور کے مختلف اور بسا اوقات متضاد جواب ملتے ہیں۔ میں نے کتاب ہذا میں اس سارے معاملہ کا منطقی نقطۂ نظر سے جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ منطقی نقطۂ نظر ہی ذہنی اور فکری لحاظ سے ایک ایسا پلیٹ فارم یا مقام اتصال کی حیثیت رکھتا ہے جو سب کے مابین مشترک ہے۔ اسے تعمیری اور بامقصد تبادلہ خیالات کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بصورت دیگر محض اناجیل کے بیانات اور ان کی متعدد تشریحات کی بنیاد پر کئے جانے والا کوئی بھی تبادلہ خیال مباحثہ و مجادلہ کی ایسی الجھن میں ڈالنے کا موجب بنے گا کہ اس گنجلک سے باہر نکلنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ دو ہزار سال کا عرصہ گزرنے کے باوجود اناجیل اربعہ کو بنیاد بنانے اور ان پر ہی حصر کرنے سے مذکورہ بالا امور کا کوئی ایسا حل سامنے نہیں آسکا جو سب کے لئے یکساں طور پر قابل قبول ہو۔ اس بارہ میں اشکال یہ درپیش ہے کہ

اناجیل کے بعض دعاوی ان کی مختلف النوع تشریحات کی وجہ سے مزید تصفیہ طلب بنے بغیر نہیں رہتے۔ پھر ایک مشکل باہم ٹکرانے والی ان توجیحات کی وجہ سے بھی پیش آتی ہے جو مرورزمانہ کے ساتھ رونما ہوتی اور پنپتی رہی ہیں۔ وقتاً بعد وقت ابھرنے اور پنپنے اور ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانے والی ان توجیحات نے بھی مسیح کی شخصیت کو اپنی زد اور لپیٹ میں لے کر اسے چیستاں بنا چھوڑا ہے۔ اس طرح تاریخی پس منظر دھندلا جاتا اور یکسر مبہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ کسی بھی معیار اور پیمانہ کی رو سے کیوں نہ دیکھا اور پرکھا جائے دور مسیح کے زمانہ بعید سے تعلق رکھنے والے واقعات کو جانچنے اور پرکھنے کی راہ میں دو ہزار سال کے فاصلہ کا حائل ہونا کوئی معمولی رکاوٹ نہیں ہے۔ انسانی منطق اور استدلال کو (جبکہ نئے سائنسی علوم کی معاونت بھی اسے حاصل ہو چکی ہے) ایک ایسی منطق اور استدلال کی حیثیت حاصل ہے جس کا نہ کوئی عقیدہ ہے اور نہ کسی مذہبی ملک کا وہ پابند ہے اور نہ ہی کسی مخصوص رنگ و نسل کی آمیزش کا دخل اس میں ممکن ہے۔ اسی لئے جملہ اقوام اور مذاہب کے مابین اسے ایک مشترکہ قدر کی حیثیت حاصل ہے۔ لہٰذا ایک ایسے متفقہ نظریہ تک پہنچنے کے لئے جو سب کے نزدیک قابل قبول ہو صرف اور صرف منطقی استدلال ہی واحد بنیاد کا کام دے سکتا ہے۔

میں مسئلہ کا متعدد جہتوں سے جائزہ لینے کی کوشش کروں گا تاکہ اس کے مختلف پہلو پورے طور پر نگاہ میں آسکیں۔ میں اپنی اس کوشش کا پہلے مسیحیت کے نقطۂ نظر سے ہی آغاز کرتا ہوں۔ میں مسئلہ کا پہلے اسی نقطۂ نظر سے جائزہ لوں گا جس نقطۂ نظر سے مسیحی حضرات اسے دیکھنے کے عادی ہیں۔ پھر میں عقل کے محدّب شیشہ کی مدد سے اس نقطۂ نظر کا تنقیدی تجزیہ پیش کروں گا۔ تاہم میں یہ بات بہمہ طور پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ تنقیدی تجزیہ پیش کرنے کے دوران اس امر کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا کہ میں کسی لحاظ سے بھی مسیحی حضرات یا خود یسوع مسیح کی شخصیت کے ادب و احترام کو مجروح کرنے کا خیال بھی دل میں لا سکوں۔ وجہ اس کی ظاہر و باہر ہے اور وہ یہ کہ میں ایک مسلمان ہوں اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے یسوع مسیح کی صداقت پر ایمان لانا اور انہیں غیر معمولی عزت و احترام کا حامل پیغمبر تسلیم کرنا اور انبیائے بنی اسرائیل میں انہیں فی ذاتہٖ لاثانی درجہ و مقام رکھنے والا نبی یقین کرنا میرے عقائد کا ایک بنیادی جزو ہے۔ لیکن اس امر کو تسلیم کرنا بھی ضروری ہے کہ جب سچائی کھل جائے اور حق بات واضح ہو کر سامنے آجائے تو پھر منطقی استدلال، عقل عمومی اور فہم و ادراک کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ

مروّجہ مسیحیت کے بارہ میں اپنے نظریات کا نظر ثانی کے رنگ میں از سر نو جائزہ لے سکتا ہے۔ اپنے اس حق کی رُو سے وہ نظریات کو مختلف زاویۂ نگاہ سے جانچنے اور پرکھنے سے رک نہیں سکتا۔ میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں ہرگز مسیحیوں اور مسیح کے مابین کوئی ایسی روک یا پچر حائل نہیں کرنا چاہتا کہ جو انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنے والی ہو۔ برخلاف اس کے میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ مسیحی حضرات مسیح کی اصل ماہیت و حقیقت کے قریب آکر اس کا صحیح عرفان حاصل کریں اور اس کی ذات کے گرد جو افسانوی خول چڑھا دیا گیا ہے اسے اتار ڈالیں۔

اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ مرورِ زمانہ سے حقیقت بگڑ کر افسانوں اور قصے کہانیوں کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ ایسے قصے اور افسانے انسان کو زندگی کے اصل حقائق سے دور لے جانے کا موجب بن جایا کرتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں مذہب یکسر ایسے خیالی اور تصوراتی روپ میں ڈھل جاتا ہے جس کا اصل حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے حقیقی اور اصلی مذہب کی جڑیں تاریخی حقائق اور سچائیوں میں پیوست ہوتی ہیں اسی لئے اصلی اور حقیقی مذہب انسانی معاشرہ میں نمایاں تبدیلیاں لانے کی اہلیت اپنے اندر رکھتا ہے۔

اس لحاظ سے مسیح کے اہل مذہب اور اس کی تعلیم کو جاننے اور سمجھنے کے لئے حقیقت کو کہانیوں سے اور سچائی کو افسانوی قصوں سے جدا اور پاک کرنا ضروری ہے۔ میری اس کوشش اور کاوش کا اصل مقصد بھی تلاش کرکے حق تک پہنچنا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ مسیحی حضرات ٹھنڈے دل اور پوری توجہ سے میری بات سنیں گے اور یہ بات سمجھ جائیں گے کہ میں ہرگز کسی کے عقائد یا جذبات کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتا۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ عیسائیت اخلاقی گراوٹ کے چنگل میں پھنسنے کے بعد اس لحاظ سے مسلسل پستی کی طرف جا رہی ہے اور اس اخلاقی گراوٹ کو روک کر اسے دوبارہ اخلاقی بلندیوں کی سمت میں گامزن کرنا خود مسیحیوں کے لئے کارِ دارد بنا ہوا ہے۔ اس ناگوار صورت حال سے نکلنے کی خاطر عیسائی دنیا کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس صورت حال کی اصل وجوہات کا تنقیدی نظر سے جائزہ لے۔ میرے تجزیہ کے مطابق اس زمانہ کے نوجوانوں کا خدا کی ہستی پر سے ایمان تیزی سے اٹھتا جا رہا ہے۔ ایک وقت تھا کہ جب سائنس دانوں میں خدا سے انحراف کا رجحان اس لئے پیدا ہوا کہ انہوں نے دیکھا اور اس امر پر غور کیا کہ نیچر اور کائنات کے متعلق بائبل میں جو کچھ درج ہے اس کا اصل حقائق سے کوئی واسطہ نظر نہیں آتا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ بائبل پر ایمان رکھنے والے عیسائیوں کی تفہیم حقیقت پسندانہ نہیں ہے۔ وہ یہ دیکھ

کر بہت حیران ہوئے کہ بائبل سے مستنبط ہونے والی تفہیم اور سائنسی دریافتوں پر مبنی حقائق ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد واقع ہوئے ہیں۔ یہ سب سائنسی حقائق اس وقت منظر عام پر آئے جب دنیائے عیسائیت میں نشاۃِ ثانیہ کے رنگ میں اصلاح عیسائیت یعنی کی Reformation کی تحریک شروع ہوچکی تھی۔ سائنسی ترقی کی رفتار تیز ہونے اور اس طرح نیچر کی اصل ماہیت کو سمجھنے میں انقلابی تبدیلی آنے کے ساتھ ساتھ کائنات کے بارہ میں بائبل اور جدید طبیعاتی دریافتوں کے منظر ناموں میں اختلاف وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ بعض دوسرے عوامل کے ساتھ ساتھ اس اختلاف نے معاشرہ کے سمجھ بوجھ رکھنے والے طبقوں میں سرے سے خدا کی ہستی ہی کے انکار کے مہلک رجحان کو جنم دیا۔ بعد ازاں جب تعلیم کا دور دورہ ہوا اور اس کی روشنی دور دور تک پھیلی۔ بڑی بڑی یونیورسٹیاں، جامعات اور مراکز علوم افزائش دہریت کے مراکز میں تبدیل ہوتے چلے گئے کائنات اور اس کے نظام کو سمجھنے میں یہودیوں اور عیسائیوں کو جس الجھن سے دوچار ہونا پڑا وہ یہ تھی کہ خدا کے قول (بائبل) اور خدا کے فعل (نیچر اور اس کے نظام) میں تضاد واضح سے واضح تر ہوتا چلا جارہا تھا۔ خدا کی ہستی کے خلاف دماغوں میں جڑ پکڑنے والے استدلال نے یہ نوعیت اختیار کی کہ اگر کائنات اور اس میں پائے جانے والے جُملہ اَجسام و اَجرام کا خالق خدا ہے اور انسانی دماغ کے دریافت کردہ قوانین قدرت کو وضع کرنے اور نظام قدرت چلانے والا بھی وہی ہے تو وہ ان تمام چیزوں کا خالق ہوتے ہوئے ان حقائق سے خود اس قدر نابلد اور لاعلم کیوں تھا کہ وہ بائبل کے ذریعہ یکسر متضاد باتیں انسانوں پر ظاہر کرتا چلا گیا۔

جب ہم بائبل میں درج شدہ یہ باتیں پڑھتے ہیں کہ زمین و آسمان کس طرح پیدا کئے گئے اور یہ کہ آدم کو مٹی سے کیسے تخلیق کیا گیا اور پھر آدم کی پسلی سے حَوّا کو کیونکر معرضِ وجود میں لایا گیا؟ (خدا کے قول یعنی بائبل اور اس کے فعل یعنی نیچر میں تضاد کی بے شمار مثالوں میں سے ہم نے یہاں ان دو مثالوں کے ذکر پر ہی اکتفا کیا ہے) تو ابتدائے آفرینش سے متعلق سائنسی نظریات اور اس بارہ میں عہد نامہ قدیم کے باب پیدائش میں درج شدہ تفصیلات کے مابین واضح، بین اور کھلے کھلے تضاد کو دیکھ کر حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔

سائنسی دریافتوں سے میل نہ کھانے والی بائبل کی ایسی بے جوڑ اور متضاد باتوں نے کلیسیا کو اس کے کلی اور ہمہ جہتی سیاسی اقتدار کے زمانہ میں ظالمانہ روش اپنانے کی طرف مائل کر دیا۔ اس کی جانی پہچانی ایک معروف مثال وہ قضیہ ہے جو کلیسیا اور گلیلیو (Galileo) نامی سائنس دان کے مابین رونما ہو کر بہت ناگوار

صورت حال پر منتج ہوا۔ جب گلیلیو (Galileo) (۱۵۶۴ء تا۱۶۴۲ء) نے نظام شمسی سے متعلق اپنی دریافت پر مبنی نظریات شائع کیے تو اس پر کلیسیا بھڑک اٹھا کیونکہ اس کے دریافت کردہ نظریات نظام شمسی سے متعلق کلیسیا کے اعتقاد و تصورات سے متصادم تھے۔ قید و بند اور انتہائی شدید دباؤ اور دھاندلی و دھونس کے تحت اسے اپنی سائنسی دریافتوں کی علی الاعلان خود تردید کرنے پر مجبور کیا گیا حتٰی کہ اس کے لئے تردید کرنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اسے عذاب دے دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ اس کے باوجود اسے پابند کر دیا گیا کہ وہ بقیہ زندگی خود اپنے گھر میں نظر بند رہ کر گزارے۔ عرصۂ دراز کے بعد کہیں ۱۵۹۱ء میں جا کر کلیسیا گلیلیو (Galileo) کے خلاف نظر بندی کا فیصلہ واپس لینے پر آمادہ ہوا اور آمادہ بھی ہوا پوپ جان پال ثانی کی قائم کردہ ایک کمیٹی کے بارہ سال تک جاری رہنے والے طویل غور و خوض کے بعد کی جانے والی سفارش پر۔

بنابریں ابتدا میں سائنس اور بائبل کے درمیان رونما ہونے والے یہ تضادات معاشرہ کی عوامی سطح تک سرایت نہ کر سکے اور عوام میں ان کا کوئی اثر ظاہر نہ ہو سکا۔ ایک عرصہ تک یہ تضادات دانشوروں کے مختصر سے حلقہ تک محدود رہے۔ بالآخر سیکولر علم کی روشنی پھیلنے کے ساتھ ساتھ اس وقت کے مروّجہ مسیحی عقائد کی نام نہاد روشنی مدھم پڑنا شروع ہوئی اور ایک متقابل ظلمت و اندھیرے میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ پندرھویں صدی میں شروع ہونے والی کلیسیا کی اصلاحی تحریک کے ابتدائی زمانہ میں سائنس دانوں کی تحقیقی سرگرمیاں بالعموم خود اپنے ہی روشن خیال حلقوں کے اندر جاری رہیں۔ ان حلقوں سے باہر دوسروں کو ان کی ہوا بھی نہیں لگنے دی گئی۔ وہ وسیع رابطہ اور تعلق جو سائنس دانوں اور عوام الناس کے درمیان آج ہمیں نظر آتا ہے وہ اس زمانہ میں ناپید تھا اس لئے سائنس دانوں کے دہریت پر مبنی ملحدانہ خیالات بحیثیت مجموعی معاشرہ کو زیادہ متأثر نہ کر سکے لیکن جب بین الاقوامی سطح پر تعلیم کا چرچا عام ہوا اور ترقی کی راہ پر گامزن ہونے والی قوموں کے نوجوانوں نے بکثرت تعلیم حاصل کرنی شروع کی تو پھر مذہبی صورت حال متأثر ہونے لگی اور رونما ہونے والی تبدیلی غلط سمت اختیار کرتی چلی گئی۔ اس کے نتیجہ میں خالصۃً فلسفے اور عقلیت پسندی کے دور کا آغاز ہوا۔ سائنس کے ساتھ ساتھ معاشرتی زندگی اور انسانی نفسیات سے تعلق رکھنے والے فلسفیانہ خیالات بھی اُبھرتے اور عوام میں پھیلتے چلے گئے۔

خاص طور پر اُنیسویں اور بیسویں صدی میں ان نت نئے فلسفوں نے خوب زور پکڑا۔ مادی فلسفے،

سیکولرازم کی ترقی اور سیکولر خیالات کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ایک دوسرے میں مدغم ہوتے رہے۔ اس نئی صورت حال نے مذہب کی اصل بنیاد یعنی خدا کی ہستی پر ایمان کو ہلا کر رکھ دیا اور اس طرح مغربی معاشرہ میں خدا پر ایمان تباہی کی نذر ہو گیا۔

انسان میں اخلاقی اقدار کی پاسداری اور احترام کا اس کے ایمان باللہ سے براہ راست تعلق ہوتا ہے۔ یہ ایمان باللہ ہی ہوتا ہے جو انسان کی اخلاقی حالت کو سنوارتا اور پھر اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اگر ایمان باللہ کمزور یا ناقص ہو یا اس میں کوئی خامی پائی جاتی ہو تو اسی نسبت سے انسان کی اخلاقی حالت بھی متأثر ہو رہی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک طرف ایمان باللہ اور دوسری طرف نظام قدرت سے متعلق دی جانے والی سیکولر تعلیم یا عقل عمومی کے تقاضوں میں تصادم کی کیفیت رُونما ہو رہی ہو تو پھر رفتہ رفتہ اور درجہ بدرجہ ایسے لوگوں کے ایمان باللہ کی کیفیت کو گھن لگنا شروع ہو جاتا ہے اور اسی نسبت سے ان کی اخلاقی حالت پر بھی منفی اثر پڑنے لگتا ہے اور لگتا چلا جاتا ہے۔ اندریں صورت اس امر کے باوجود کہ ان میں سے بعض افراد کا ایمان باللہ سلامت بھی ہو بالعموم اجتماعی بگاڑ کے زیر اثر ہوتے ہوتے من حیث المجموع عملاً پورا معاشرہ دہریت کے رنگ میں رنگین ہو جاتا ہے۔ نوع انسانی کی زندگیوں میں کارفرما اس اصول کے پیش نظر کسی بھی معاشرہ یا سوسائٹی کے ایمان باللہ کی کیفیت کا اندازہ لگا کر اس کی اخلاقی حالت کے بارہ میں فیصلہ کرنا یا اخلاقی حالت کی روشنی میں ایمان باللہ کی کیفیت کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں ہے۔ ایمان باللہ جتنا کمزور یا ناقص ہوتا ہے لوگوں کے اخلاقی کردار پر اس کی گرفت اتنی ہی زیادہ کمزور پڑ جاتی ہے۔ جب ان دونوں کے تقاضوں میں تصادم کی کیفیت رونما ہوتی ہے تو کمزور ایمان باللہ غیر اخلاقی رجحانات کی کشش کے آگے بند باندھنے میں ناکام رہتا ہے اور ان رجحانات کو کھل کھیلنے کا راستہ دے دیتا ہے۔

دنیا بھر میں کہیں بھی کسی مذہبی سوسائٹی یا معاشرہ پر اس اصول یا معیار کا اطلاق کر کے ہم اس کے ایمان باللہ اور اخلاقی حالت کے بارہ میں صحیح اور قابل اعتماد نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ بظاہر خدا کی ہستی پر یقین رکھنے والی کسی عیسائی سوسائٹی کو امتحان کے رنگ میں اگر جانچنا ہو تو صرف اتنا ہی دیکھنا اور معلوم کرنا کافی ہے کہ آیا اس سوسائٹی میں عملاً مسیحی اقدار کا دور دورہ ہے یا نہیں۔ مثال کے طور پر کیا ان لوگوں کا اپنے پڑوسیوں کے ساتھ سلوک اور برتاؤ بالکل ویسا ہی ہے کہ جیسے سلوک کا توریت کے دس احکام ان سے تقاضا کرتے ہیں؟ کیا جنگ یا جھگڑے وغیرہ کی صورت میں کسی قومی بحران کے وقت وہ اپنے حریفوں سے معاملہ

کرنے میں مسیحی اقدار کو ملحوظ رکھتے ہیں؟ کیا تشدد اور حملہ کا نشانہ بننے والے معصوم اور بے گناہ عیسائی ایک گال پر تھپڑ کھانے کے بعد تشدد کرنے والے کے سامنے اپنا دوسرا گال بھی پیش کر دیتے ہیں؟ سوچنے اور جاننے والی بات یہ ہوتی ہے کہ زندگی میں ایک شخص اپنے عمل و کردار کے روپ میں اپنے ایمان کی کیا تصویر دکھاتا ہے یا اس کی کیا جھلک پیش کرتا ہے۔ اگر اس کا عمل و کردار اس کے ایمان کی عکاسی نہیں کرتا تو یہ بعینہٖ ہمارے اس قول کی بڑی معنی خیز تصدیق ہوگی کہ اس کا ایمان باللہ انسانی حوائج اور ان کے پر کشش تقاضوں سے متصادم ہے۔ اگر ان کے مابین تصادم کے وقت ایمان باللہ بہر طور سر بلند رہتا ہے یعنی وہ نفسانی خواہشات اور میلانات کو اس کی خاطر قربان کر دیتا ہے تو پوری دیانت داری سے کہا جاسکتا ہے کہ اس کا ایمان باللہ کسی بھی نوعیت کا ہو وہ بہر حال اپنی جگہ مستحکم ہے اور خلوص اور اصلیت و حقیقت سے ہرگز عاری نہیں ہے۔

اگر دنیائے عیسائیت کی موجودہ حالت پر نظر ڈالی جائے اور مذکورہ بالا امتحان میں سے گزار کر اس کے ایمان باللہ کی کیفیت کو جانچا جائے تو ایسی کوشش بہت ہی افسوس ناک اور دل شکن تجربہ ثابت ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ اس کوشش کے نتیجہ میں سابقہ جس صورت حال سے پڑتا ہے وہ خدا پر ایمان سے کھلی کھلی بغاوت کے مترادف نظر آتی ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ بعض اوقات یہ بغاوت اس قدر خاموش اور غیر محسوس نوعیت کی ہوتی ہے کہ اسے کھلا انکار قرار دینا بھی مشکل ہوتا ہے۔ وجہ یہ کہ نظریہ بظاہر محسوس یہ ہورہا ہوتا ہے کہ یہ صورت حال ایمان باللہ کے اقرار اور عمل میں تضاد کی وجہ سے رونما ہوئی ہے۔ اس لئے دھوکہ یہ لگتا ہے کہ وہ خدا پر ایمان رکھنے والے لوگوں کا ہی معاشرہ ہے حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ یہ بات بڑی حد تک دوسرے معاشروں پر بھی صادق آتی ہے لیکن اس معاملہ میں اصل غور طلب بات یہ ہے کہ ہر ایسے معاشرہ کے معاملہ میں ایک ہی وجہ کارفرما نہیں ہوتی، ہر معاشرہ کی بظاہر یکساں صورت حال کی وجہ مختلف ہوتی ہے۔ مزید برآں ہر معاشرہ کی صورت حال کو اس کے اپنے مخصوص احوال و کوائف کی روشنی میں جانچنا ضروری ہوتا ہے۔ اسی لئے تو اس امر کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے کہ مختلف معاشروں کے افراد کے عقائد و اعمال میں پائے جانے والے تضادات کا ان کے اپنے مخصوص حالات کے پیش نظر جداگانہ انداز میں ٹھنڈے دل و دماغ سے بغور تجزیہ کیا جائے۔ پھر اس امر کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ کسی مخصوص معاشرہ کا عقیدہ خود اپنی ذات میں پیچیدہ اور غیر فطری ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر غیر یہودی اقوام اور لوگوں کے بارہ میں طالمود کی تعلیم کے بعض حصے اور اسی طرح اچھوت اقوام کے بارہ

میں منو سمرتی کی ہندو تعلیمات ایسی ہیں کہ ان معاشروں کے لئے ان پر عمل نہ کرنا ہی ان کے حق میں نیک فال کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیز بعض معاشروں کا عقیدہ توفی ذاتہٖ اچھا ہوتا ہے اور اس پر کماحقّہٗ عمل پیرا ہونا فائدہ مند ہوتا ہے لیکن خود لوگوں کے اندر بے اعتدالیوں کی وجہ سے بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ عقیدہ کو مشکل اور مالایُطاق سمجھ کر اس کے بارہ میں سنجیدہ نہیں رہتے اور اسے عملاً ترک کر بیٹھتے ہیں۔

مسیحیت کے موضوع کی طرف واپس لوٹتے ہوئے ہم جس بات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ مسیحیت کے بنیادی عقائد ہی نظام قدرت کی اصل حقیقتوں سے متصادم ہیں۔ بنابریں وہ معقولیت پسندی اور عقل عمومی پر مبنی انسانی توقعات سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اس صورت حال کے تناظر میں مسیحیوں کے لئے یہ ناگزیر تھا کہ وہ رفتہ رفتہ اپنے عقائد کو سنجیدگی سے لینے کی روش اور ان عقائد کے وضع کردہ سانچوں کے مطابق اپنی زندگیاں ڈھالنے کے عزم سے منحرف اور بیگانہ ہوتے چلے جائیں۔ سو ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا۔

بابِ اوّل

ابنیتِ مسیح کی اصل حقیقت

مسیحیت میں خدا اور یسوع مسیح کے درمیان "باپ بیٹے" کے رشتہ کو بنیادی اور مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ آیئے پہلے ہم یہ جاننے اور سمجھنے کی کوشش کریں کہ "حقیقی بیٹا" ہونا کس مفہوم کا حامل ہے، یعنی یہ کہ حقیقی بیٹا ہونے کے معانی کیا ہیں؟ جب ہم حقیقی باپ کا حقیقی بیٹا ہونے کے معانی پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں تو اس کی بعض ایسی تفاصیل ابھر کر سامنے آتی ہیں جو ہمیں ابنیتِ مسیح کے بارہ میں اپنی رائے یا نظریہ کا نظرِ ثانی کے رنگ میں دوبارہ جائزہ لینے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ ہم پہلے اس امر کو لیتے ہیں کہ حقیقی بیٹا کیا ہوتا ہے؟ اس زمانہ میں جب کہ ابھی سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی اور یہ حقیقت ابھی دریافت نہیں ہوئی تھی کہ ایک بچہ کی تخلیق یا پیدائش کیسے اور کس طرح ظہور میں آتی ہے؟ اس سوال کا بہت مبہم اور غیر واضح جواب دیا جاسکتا تھا۔ ازمنۂ قدیم کے لوگوں کے نزدیک یہ بات عین ممکنات میں سے تھی کہ انسان کے ہاں نئے بچوں کی پیدائش کے مانند خدا کا بھی اپنا نسلی اور اصلی بیٹا ہو سکتا ہے۔ یہ نظریہ یا اعتقاد دنیا کے مختلف حصوں میں آباد قریباً تمام ملحدانہ سوسائٹیوں اور معاشروں میں ایک مُسلّمہ حقیقت کے طور پر عام پھیلا ہوا تھا۔ اگر یونانی علم الاصنام پر نظر ڈالیں تو وہ دیوی دیوتاؤں کی اولادوں کی پیدائش کے دیومالائی قصے کہانیوں سے بھرا پڑا ہے۔ اور اسی طرح ہندو دیومالائی سلسلہ بھی اس بارہ میں یونانی علم الاصنام سے کسی لحاظ سے بھی پیچھے نہیں ہے۔ اس قدیم زمانہ کے انسانوں کا نظریہ یہ تھا کہ ان کے نام نہاد دیوی دیوتا جتنی تعداد میں چاہیں اپنے بیٹے بیٹیوں کو انسانوں کی طرح ہی خود جنم دے سکتے ہیں۔ اس زمانہ میں انسانی دماغ نے اپنے اس نظریہ کے مالہ وماعلیہ کے بارہ میں کبھی سوچا ہی نہ تھا اور نہ کبھی اس پر کسی اعتراض کی گنجائش کا سوال ہی پیدا ہوا تھا۔ اسے پہلے سے مروّج ایک مُسلّمہ حقیقت کی حیثیت حاصل تھی لیکن اب تو سائنس نے اس درجہ ترقی کرلی ہے کہ بچوں کی شکل میں نئے انسانوں کی تخلیق اور پیدائش کے پورے نظام اور طریق کار کو کسی ابہام کے بغیر اتنے حتمی اور واشگاف انداز میں پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے کہ قبل ازیں انسان کے لئے اس کا تصور بھی ممکن نہ تھا۔ جدید تحقیق کی رُو سے حتمی طور پر ثابت شدہ یہ سارا نظام اپنی جُملہ

تفاصیل کے ساتھ بہت باریکیوں کا حامل ہے۔ جو لوگ اب بھی اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ خدا خود اپنے وجود سے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو جنم دے سکتا ہے ان کا اس بارہ میں بہت ہی گھمبیر اور پیچیدہ مسائل سے دوچار ہونا ناگزیر ہے۔ اور ان پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے سوالات کا حل پیش کریں اور نت نئے اشکال دور کرکے دکھائیں۔

ماں باپ بننے کی سائنسی بنیاد

اولاً تو اس امر کو ذہن میں مستحضر رکھنا ضروری ہے کہ ایک بچہ کو معرض وجود میں لانے کا ذریعہ بننے میں ماں اور باپ دونوں کو اس پورے عمل میں مساوی حیثیت سے شریک ہونا اور حصہ دار بننا پڑتا ہے۔ انسانی جسم کے خلیوں (Cells) میں بعض مخصوص نوعیت کے بنیادی اجزاء ہوتے ہیں جو کروموسومز (Chromosomes) کہلاتے ہیں۔ ان کی تعداد 46 ہوتی ہے۔ ان کروموسومز نے تواثری عنصر یا جینز (Genes) کو اپنے اندر سنبھالا ہوا ہوتا ہے۔ یہ تواثری عنصر انسانی کردار کو تشکیل دینے والے موروثی خصائل کا حامل ہوتا ہے اور یہ ہوتا بھی ہے انتہائی مہین اور باریک دھاگوں کی شکل میں۔ اسی عنصر کے ذریعہ موروثی خصائل اگلی نسل میں منتقل ہوتے ہیں۔ قدرت نے ایسا انتظام کیا ہے کہ جب انسانی ماں کا افزائشی جرثومہ یا بیضۂ تولید تشکیل پاتا ہے تو تمام دوسرے خلیوں کے برخلاف اس میں پورے 46 کروموسومز نہیں ہوتے۔ اس میں ان کی تعداد صرف 23 ہوتی ہے۔ سو گویا بیضۂ مادر میں جو کروموسومز ہوتے ہیں وہ ہر آدمی اور ہر عورت کے خلیوں میں موجود 46 کروموسومز کا نصف ہوتے ہیں۔ جب مرد کے ساتھ ملاپ کے نتیجہ میں مرد کا نطفہ بیضۂ مادر میں جا شامل ہوتا ہے اور بیضۂ مادر تخم کے طور پر اسے اپنے اندر قبول کرلیتا ہے تو مرد کا نطفہ بقیہ 23 کروموسومز کی کمی کو پورا کرکے بیضۂ مادر میں کروموسومز کی تعداد کو 46 کردیتا ہے۔ دونوں کے تیئس تیئس کروموسومز کے باہم ملنے سے بیضۂ مادر میں زرخیزی پیدا ہوجاتی ہے اور بچہ بننے کی اہلیت سے وہ ہمکنار ہوجاتا ہے۔ بیٹے کی شکل میں ایک نئے وجود کے پیدا ہونے کا یہ ہے خدائی منصوبہ۔ اگر خدا ایسا نظام وضع نہ کرتا تو ہر نئی نسل کی پیدائش میں کروموسومز کی تعداد پہلے سے دوگنا ہوتی چلی جاتی یعنی دوسری نسل میں 46 کی بجائے 92 کروموسومز ہوتے اور نتیجۃً نسل در نسل ہوتے ہوتے انسان دیوہیکل وجود میں تبدیل ہوتے چلے جاتے۔ الل ٹپ اور بے حساب نمو پانے، بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا یہ سلسلہ بے قابو ہوکر نہ جانے تباہی و بربادی کی شکل میں کیا گل کھلاتا۔ بقائے نوع انسانی کے

پورے منصوبے کو خدا نے ایسی عمدگی، حسن وخوبی اور پر حکمت انداز میں وضع کیا ہے کہ افزائش نسل کی سطح پر آتے ہی زندگی کو جنم دینے والے خلیوں میں کروموسومز کی تعداد یک دم نصف ہو جاتی ہے۔ یعنی بیضۂ مادر میں کروموسومز کی تعداد 23 تک محدود رہتی ہے اور اسی طرح باپ کے نطفہ میں بھی ان کی تعداد 23 سے آگے نہیں بڑھنے پاتی۔ اس لحاظ سے باقتضائے معقولیت توقع کے رنگ میں باور کیا جاسکتا ہے کہ نوزائیدہ بچہ میں توراثی خصائل کے حامل آدھے عناصر (Genes) ماں کی طرف سے مہیا ہوتے ہیں اور آدھے مرد شریک حیات کی طرف سے۔ ثابت شدہ سائنسی حقائق کے رُو سے یہ ہیں معنے اصلی اور حقیقی بیٹا ہونے کے۔ حقیقی بیٹا ہونے کی کوئی اور تعریف ایسی نہیں ہے جسے انسانی پیدائش پر چسپاں کیا جاسکتا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ رَدِّ عمل آنے اور طریق کار کے انداز میں کسی قدر تبدیلی یا اختلاف کی گنجائش تو ہوتی ہے لیکن قدرت کے وضع کردہ جن اُصولوں اور قواعد وضوابط کا سطور بالا میں ذکر کیا گیا ہے ان میں کسی استثنا کی گنجائش نہیں ہے۔

اپنی توجہ کو مسیح کی پیدائش کے واقعہ پر ہی مرکوز رکھتے ہوئے ہم اِس اَمر کو ذرا تصور میں لاتے ہیں کہ مسیح کی ذات کے معرض وجود میں آنے کے سلسلہ میں واقعۃً ہوا کیا ہوگا اور پھر تصور میں آنے والے ممکنات کی بنا پر ایک خیالی منظر نامہ کا خاکہ تیار کرتے ہیں۔

پہلا امکان جسے سائنسی بنیادوں پر زیرِ غور لایا جاسکتا ہے یہ ہو سکتا ہے کہ مریم کے غیر زرخیز شدہ افزائشی جرثومہ یا بیضۂ تولید نے بچہ بننے والے لوتھڑے یا بالفاظ دیگر جنین کی تیاری میں ماں کے حصہ کے طور پر 23 کروموسومز مہیا کر دیئے ہوں گے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ایسا ہوا ہوگا تو سوال یہ پیدا ہوگا کہ بیضۂ مادر میں زرخیزی کیسے پیدا ہوئی؟ اور اس زرخیزی کو ممکن بنانے کے لئے لازمی اور اہم بقیہ 23 کروموسومز کہاں سے آئے؟ یہ کہنا یا فرض کرنا ناممکنات میں سے ہے کہ مسیح کے جسمانی خلیوں میں صرف 23 ہی کروموسومز کہاں سے آئے؟ یہ کہنا یا فرض کرنا ناممکنات میں سے ہے کہ مسیح کے جسمانی خلیوں میں صرف 23 ہی کروموسومز تھے۔ 23 کا عدد تو کروموسومز کی اصل تعداد کا ہے ہی نصف اس کا تو ذکر ہی کیا کوئی انسانی بچہ 45 کروموسومز کے ساتھ بھی زندہ پیدا نہیں ہو سکتا؟ اگر کسی انسان کو 46 کروموسومز میں سے (جن کا انسانی جسم کی ساخت اور بناوٹ کے لئے موجود ہونا لازمی اور ضروری ہے) صرف ایک کروموسوم سے محروم کر دیا جائے تو اس کے جسم میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل ظاہر ہونے سے اس کا جو حشر ہوگا اس کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مریم اکیلی 46 کے 46 کروموسومز مہیا نہیں کر سکتی تھی۔ ضروری تھا کہ 23 کروموسومز کہیں اور سے آتے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ خدا خود مسیح کا باپ تھا تو کئی امکان ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ایک امکان یہ ہو سکتا ہے کہ خدا بھی انسانوں جیسے کروموسومز اپنے وجود میں رکھتا ہے اور اس کے یہ کروموسومز کسی نہ کسی طور مریم کے رحم میں منتقل کیے گئے ہوں گے۔ ایسا ہونا اس درجہ ناقابل یقین ہے کہ اسے کسی صورت بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ خدا انسانوں والے کروموسومز رکھتا ہے اور وہ اس کے وجود کا حصہ ہیں تو ایسا وجود خدا نہیں کہلا سکتا۔ کیونکہ جسے انسانی مجبوری لاحق ہو وہ خدا ہو ہی نہیں سکتا۔ بنا بریں اس بات پر ایمان لانے یا یہ اعتقاد رکھنے سے کہ مسیح خدا کا حقیقی بیٹا ہے خود باپ کی اُلوہیت معرضِ خطر میں پڑے بغیر نہیں رہتی۔ دوسرا امکان یہ ہو سکتا ہے کہ خدا نے مطلوبہ تعداد کو پورا کرنے کی غرض سے زاید یا بقیہ کروموسومز اپنی صفتِ خلق کے ایک غیر معمولی مظہر کے طور پر پیدا کر دکھائے تھے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ کروموسومز خدا کی اپنی ذات یا وجود کا حصہ نہ تھے بلکہ اس نے انہیں معجزانہ طور پر پیدا کیا تھا۔ یہ امکان ازخود ہمیں اس امر کا مستلزم ٹھہراتا ہے کہ ہم خدا اور مسیح کے درمیان حقیقی معنوں میں باپ بیٹے کے رشتہ کو یکسر مسترد کر دیں اور نتیجہ یہ اخذ کریں کہ پوری کائنات کا جو ہمہ گیر رشتہ اپنے پیدا کرنے والے خدا کے ساتھ ہے وہی رشتہ مسیح کا بھی خدا کے ساتھ تھا اور یہ ایسا عمومی رشتہ ہے جو جملہ مخلوقات کا اپنے خالق کے ساتھ پہلے ہی ابتداء سے چلا آرہا ہے۔

کیا خدا کا کوئی حقیقی بیٹا ہونا ممکن ہے؟

یہ امر ظاہر و باہر ہے کہ کسی کا خدا کے ساتھ حقیقی ابنیت کا رشتہ قائم ہونا ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ حقیقی بیٹا ماں اور باپ دونوں کے وجودوں سے حصہ لے کر معرضِ وجود میں آتا ہے۔ حقیقی بیٹے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا اپنا امتیازی کردار آدھا باپ کے کردار کا عکس ہو اور آدھا ماں کے کردار کا آئینہ دار۔ اندریں صورت خدا کے ساتھ حقیقی ابنیت کے تعلق کے نتیجہ میں یہ مشکل سر اٹھائے بغیر نہیں رہتی کہ ایسا بیٹا لازماً آدھا انسان ہو گا اور آدھا خدا۔ اس واضح اور کھلی حقیقت کے باوجود جو لوگ مسیح کی حقیقی ابنیت کے قائل ہیں وہ باصرار یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مسیح کامل انسان اور ساتھ ہی کامل خدا بھی تھا۔ ابنیت کا تصور اس دعوے کو ازخود باطل کر دیتا ہے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ جو کروموسومز مسیح کی پیدائش میں کام آئے وہ اصل مطلوبہ تعداد سے نصف یعنی صرف 23 ہی تھے تو ثابت شدہ سائنسی حقیقت کی رو سے مسئلہ کوئی رہتا ہی نہیں کیونکہ ایسی صورت میں

کسی بچہ کے پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ تاہم بعض ممکنہ پہلوؤں کی وضاحت کی خاطر ہم فرض کر لیتے ہیں کہ واقعۃً ایسا ہی ہوا یعنی محض 23 کروموسومز کے ساتھ ہی بچے نے جنم لیا تو صاف ظاہر ہے کہ کروموسومز کی تعداد نصف ہونے کے باعث ایسا بچہ پورا نہیں بلکہ صرف آدھا انسان ہو گا۔ پھر سوچنے والی بات یہ بھی ہے کہ 23 مکمل کروموسومز کا کم ہونا تو بہت بڑی بات ہے میڈیکل سائنس کی رو سے صرف ایک کروموسوم کا ایک ناقص توارثی جرثومہ (جسے انگریزی میں "جین" کہتے ہیں) بچہ میں پیدائشی نقص کا موجب بن کر اس کے حق میں قیامت ڈھا سکتا ہے۔ ایسا بچہ اندھا یا گونگا بہرا یا اعضا کی وجہ سے اپاہج ہو سکتا ہے۔ ایسے افسوس ناک حادثہ کے ساتھ وابستہ خطرات کا کوئی شمار ممکن نہیں۔ انسان کو حقیقت پسندی سے کام لینا چاہیے جس طرح 23 کروموسومز سے بچہ نہیں بن سکتا اسی طرح یہ سمجھنا کہ خدا کے بھی کروموسومز ہوتے ہیں خدا کی شان اقدس میں بہت بڑی گستاخی ہے۔

مسیح کی پیدائش میں خدا کی ذاتی اور جسمانی شرکت بہر طور خارج از مکان قرار پاتی ہے۔ اور اگر بچہ صرف اور صرف مریم کے جسم میں موجود انسانی خصائل کے حامل توارثی جینز کے ساتھ ہی پیدا ہوا تو وہ خدا کا بیٹا نہیں ہو سکتا تھا۔ مزید برآں وہ پورا نہیں بلکہ محض آدھا انسان ہی قرار پا سکتا تھا اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ ایسے نامکمل انسان نما عجوبہ کو خدا کا بیٹا کہا جاتا تو یہ کیسا مکروہ فعل شمار ہوتا۔

اب رہا یہ سوال کہ پھر مسیح محض یک طرفہ طور پر مریم کے بطن سے پیدا ہوا کیسے؟ اس بارہ میں ہم سب جانتے ہیں کہ مرد کی شرکت کے بغیر ایک کنواری ماں کا اکیلے ہی بچہ کو جنم دینا ایک ایسا معاملہ ہے جس کے متعلق فی زمانہ دنیا بھر کے ترقی یافتہ ممالک میں ریسرچ ہو رہی ہے۔ تاہم اس بارہ میں انسانی علم ابھی تک ایک حد سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے اور تحقیق سر دست اس فیصلہ کن مرحلہ تک نہیں پہنچی ہے کہ اس امر کے ناقابل تردید دلائل و شواہد فراہم ہو سکیں کہ فی الواقعہ مرد کی شرکت کے بغیر کنواری ماؤں کے بطن سے از خود بچے پیدا ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ سارا معاملہ ہنوز زیر تحقیق ہے اور ہر قسم کے امکانات کا راستہ کھلا ہے۔ ابھی محققین اس کے حق میں یا خلاف کسی حتمی یا آخری نتیجہ پر نہیں پہنچے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ یہ معاملہ بھی سائنسی بنیادوں پر دو اور دو چار کی طرح پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے۔

زندگی کی نچلی سطح پر یعنی کیڑوں مکوڑوں وغیرہ کی افزائش کے بارہ میں قدرت کے دو مظاہر ایسے ہیں جنہیں ثابت شدہ سائنسی حقائق کے طور پر تسلیم کیا جا چکا ہے۔ ان میں سے افزائش نسل کا ایک طریق ہرمافروڈٹ ازم (Hermaphroditism) کہلاتا ہے اور دوسرے طریق کے لئے پارتھینو جینس

(Parthenogenesis) کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے مریم کے بطن سے مسیح کی معجزانہ پیدائش ایسے ہی بہت کمیاب نوعیت کے کسی غیر معمولی مظہر قدرت کے ذیل میں آتی ہے۔

ذیل میں افزائش نسل کے ثابت شدہ دو مظاہر قدرت (1) ہرمافروڈٹ ازم (2) پارتھینوجینیسس کی کسی قدر وضاحت درج کی جارہی ہے ایسے قارئین جو اس موضوع کی سائنسی بنیادوں پر مزید وضاحت میں دلچسپی رکھتے ہوں وہ کتاب ہذا کے ضمیمہ سے صفحہ 2 سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

ہرمافروڈٹ ازم (Hermaphroditism)

یہ اصطلاح بعض جانوروں میں ایسی غیر معمولی صورت حال پر دلالت کرتی ہے کہ جب اکیلی مادین (مؤنث) میں نر اور مادہ دونوں کے جنسی اعضا قدرتی طور پر پائے جاتے ہیں اور کروموسومز میں نر اور مادہ دونوں کی خصوصیات پہلو بہ پہلو ایک ساتھ موجود ہوتی ہیں۔ لیبارٹری میں کیے جانے والے تجربات سے ظاہر ہوا کہ ایک خرگوش نے جس کے اندر نر اور مادہ دونوں کے جنسی اعضا موجود تھے۔ بہت سی مادین خرگوشوں کی جنسی خواہش کو پورا کیا اور اس طرح وہ نر اور مادہ دونوں جنسوں کے 250 خرگوشوں کا مورث اعلیٰ بنا اور پھر ایک مرحلہ ایسا آیا کہ علیحدگی میں خود اس خرگوش کو حمل ٹھہر گیا اور اس نے نر اور مادہ دونوں جنسوں کے سات صحت مند خرگوش بچوں کو جنم دیا۔ اب جب بعد از مرگ اس کا پوسٹ مارٹم کیا گیا تو پتہ چلا کہ حالت حمل میں اس کی دو کارآمد بیضہ دانیاں اور غیر زرخیز اور بانجھ قسم کے دو خصیے تھے۔ جدید مطالعہ ومشاہدہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ قدرت کی طرف سے ایسا غیر معمولی وقوعہ شاذ کے طور پر انسانوں میں بھی ظہور میں آسکتا ہے۔

پارتھینوجینیسس (Parthenogenesis)

”پارتھینوجینیسس“ کی اصطلاح افزائش نسل سے متعلق قدرت کے غیر معمولی نوعیت کے اس نظام کے لئے بولی جاتی ہے جس کے تحت کسی جنسی اختلاط کے بغیر ہی مادین (مؤنث) کا بیضۂ تولید از خود زرخیز ہوکر نسل کی افزائش کا موجب بن جاتا ہے۔ افزائشِ نسل کا یہ غیر معمولی طریق زندگی کی کمتر درجوں کی شکلوں جیسے کھٹمل، پسو وغیرہ نیز مچھلیوں میں کارفرما نظر آتا ہے۔ اس بات کے بھی شواہد ملے ہیں کہ یہ نظام کم بارش والے علاقوں اور ایسے خطوں میں جن کے موسمی حالات غیر یقینی ہوں اور بارش وغیرہ کے متعلق کسی قسم کی پیش بینی ممکن نہ ہو چھپکلیوں اور اسی نوع کے دوسرے جانوروں میں افزائش نسل کے ایک

کارگر ذریعہ کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ مزید برآں اس بارہ میں لیبارٹریز (سائنسی تجربہ گاہوں) میں بھی بعض تجربات کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر چوہیوں اور مادہ خرگوشوں میں جنسی عمل کے بغیر مصنوعی طریقہ سے جنین پیدا کرکے اس کو نصف مدت حمل تک نشوونمادی گئی اور بعد ازاں حمل کا اسقاط کردیا گیا۔ حالیہ ریسرچ کے مطابق کبھی کبھی انسانی جنین کو بھی غیر جنسی عمل افزائش کے رنگ میں Calcium Ionophore کو اضافی مادہ کے طور پر استعمال کرکے متحرک کیا جاسکتا ہے۔ ایسی تحقیقات سے اس بات کا امکان ظاہر ہوتا ہے کہ زمانۂ قدیم کے انسانی اسقاط حمل بیضہ کے مصنوعی طریق پر جنین پیدا کرنے کی صلاحیت کے ارتقا کا سبب ہے۔

جدید تجرباتی تحقیق کے مطابق اس بات کا امکان ثابت ہے کہ کنواری سے بچہ کی پیدائش ممکن ہے۔ Nature Genetics اکتوبر1995ء کی ایک حیران کن رپورٹ کے مطابق ایک تین سالہ بچے کی پیدائش ایک ایسے بیضہ سے ہوئی جس کا جنسی اختلاط نہیں ہوا تھا۔ DNA کی تحقیق سے یہ پتہ چلا کہ بچے کی جلد اور خون میں موجود x کروموسوم والدہ ہی کی طرف سے تھے۔ اسی طرح خون میں موجود دیگر بائیس کروموسوم کے دونوں جوڑے والدہ کے کروموسوم سے مشابہ تھے اور مکمل طور پر والدہ سے ودیعت ہوئے تھے۔

معجزات کیا ہوتے ہیں؟

جب کسی مرد سے ملاپ کے بغیر کسی کنواری ماں کے بطن سے ولادت کا ہوسکنا قوانین قدرت کی رُو سے ناممکن نہیں بلکہ ایسا ہونا عین ممکنات میں سے ہے تو یہ سارا معاملہ قوانین قدرت سے ماورا اور بالکل ناممکن کیسے قرار پاسکتا ہے اور اس امر کی گنجائش ہی کہاں باقی رہتی ہے کہ ولادتِ مسیح کو ضرور مافوق الفطرت قرار دیا جائے۔ اور پھر اس معاملہ کو اس انتہا تک پہنچایا جائے کہ مسیح کی انسانی ولادت کو خدا کے حقیقی بیٹے کی ولادت یقین کیا جائے اور اس کے حقیقی ابن اللہ ہونے پر باقاعدہ ایمان بھی لایا جائے۔ جب قوانینِ قدرت کی ایک زندہ حقیقت کے طور پر اس نوع کی ولادت کے بعض شواہد منظر عام پر آچکے ہیں تو پھر اس بات پر یقین کرنے میں قباحت ہی کیا ہے کہ مسیح کی ولادت ایک غیر معمولی واقعہ تو ضرور ہے لیکن یہ رُونما ہوا ہے قدرت کے بعض ایسے قوانین کے تحت جن پر سے ابھی پورے طور پر پردہ نہیں اُٹھا ہے۔ مریم میں درآنحالیکہ کسی مرد نے اسے چھوا تک نہ تھا خاص خدائی منصوبہ اور تصرف کے تحت اندرونی طور پر

کوئی نہ کوئی ایسی قدرتی تبدیلی ضرور واقع ہوئی جو اس کے ہاں ہونے والی ولادت کو ایک معجزانہ ولادت بنانے کا موجب بنی اور یہ تبدیلی قوانینِ قدرت کے تحت ہی وقوع میں آئی۔ ولادت مسیح کے بارہ میں احمدی مسلمانوں کا بعینہٖ یہی عقیدہ ہے اور یہ ایک ایسا پختہ عقیدہ ہے جس میں کوئی جھول یا کمزوری نہیں۔ کوئی سائنس دان اسے نامعقول یا معلومہ قوانینِ قدرت کی خلاف ورزی قرار دے کر اسے مسترد نہیں کر سکتا۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اسلام کی رُو سے جو واقعات معجزات قرار پاتے ہیں وہ قوانینِ قدرت سے ماوراء اور مافوق الفطرت نہیں ہوتے۔ وہ قدرت کے ایسے غیر معمولی واقعات ہوتے ہیں کہ اس وقت تک ان کے اسباب و علل تک انسانی علم کی رسائی نہیں ہوئی ہوتی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کی حکمت و دانائی پر کئی طرح کے اعتراضات کا وارد ہونا ناگزیر ٹھہرتا۔ ظاہر ہے کہ اگر قوانین قدرت خود خدا کے وضع کردہ ہیں تو پھر اُس نے اِس امر کی بھی گنجائش رکھی ہے کہ وہ انہیں توڑے بغیر کسی بھی مسئلہ کا مطلوبہ حل نکال لیتا ہے۔

پھر اِس امر کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ انسان کا علم تمام قوانین قدرت پر محیط نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اسے قوانین قدرت کا رفتہ رفتہ علم ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قوانین قدرت کئی درجوں میں منقسم ہیں اور بلند ہوتی ہوئی مختلف سطحوں اور درجوں میں ان کی کارفرمائی جاری وساری ہے۔ بعض اوقات انسان کو صرف ایک سطح پر روبعمل آنے والے قوانین کا علم ہو پاتا ہے۔ اس سے آگے اس کی نگاہ کام نہیں کر رہی ہوتی۔ جوں جوں وقت گزرتا اور آگے بڑھتا ہے انسان کے علم میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور اسی نسبت سے ایسے قوانین قدرت میں جھانکنے اور انہیں دریافت کرنے کی اہلیت اس میں بڑھتی رہتی ہے جو پہلے اس کے لئے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ سائنسی ترقی کے ہر نئے دور میں نئی دریافتوں کی وجہ سے بعض ایسے مزید قوانین قدرت انسان کے علم میں آتے ہیں جو گروپس کی شکل میں جاری وساری رہ کر اپنی کارفرمائی دکھا رہے ہوتے ہیں۔ اس طرح انسان نہ صرف ان کے وسیع پیمانہ پر متحرک رہنے کو بہتر رنگ میں سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے بلکہ یہ امر بھی اس کے علم میں آجاتا ہے کہ کس طرح باہم ایک دوسرے پر اثر انداز ہو رہے ہوتے ہیں۔

انسانی علم میں رفتہ رفتہ اضافہ کی وجہ سے جو واقعات ابتدائی ادوار میں معجزے نظر آتے ہیں بعد ازاں وہ انسان کی نظر میں معجزے نہیں رہتے کیونکہ ان کے اسباب کا اسے علم ہو جاتا ہے۔ ایک مخصوص زمانہ میں انسان نے علم میں جس حد تک ترقی کی ہوئی ہوتی ہے اس کی نسبت سے ہی بعض واقعات معجزہ قرار پاتے

ہیں۔ خدا تعالیٰ جب اپنی قدرت کاملہ کی کوئی نئی تجلی ظاہر کرتا ہے تو اس وقت انسان کو بظاہر کسی معلومہ قانون قدرت کی خلاف ورزی ہوتی نظر آتی ہے لیکن فی الاصل ایسا نہیں ہو رہا ہوتا وہ نئی تجلی ایک ایسے قانون قدرت کے تحت ظہور میں آتی ہے جو ظہور کے وقت ان معنوں میں انسان کی نظر سے پوشیدہ ہوتا ہے کہ ابھی اسے اس کا علم نہیں ہوا ہوتا۔ خدا تعالیٰ اپنے ارادہ، حکم اور تصرف سے اس قانون قدرت کو رُوبعمل لے آتا ہے۔ اس زمانہ کے لوگ اسے سمجھ نہیں پاتے کیونکہ وہ اس وقت تک ان کے فکر اور علم کی رسائی سے بالا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر چند ہزار سال پہلے تک انسان کو مقناطیسی قوت کا کوئی علم نہ تھا۔ اگر اس زمانہ میں کوئی شخص اسے اتفاقی طور پر دریافت کر لیتا اور کوئی ایسی ترکیب نکال لیتا جس سے وہ بعض چیزوں کو ہوا میں کھینچ کر دکھا سکتا۔ اور دوسرے لوگوں کو بظاہر اس کا کوئی ایسا سبب نظر نہ آتا جسے وہ اپنی ننگی آنکھ سے دیکھ سکتے تو وہ شخص سب لوگوں کو یہ کہہ کر دیکھو! میں تمہیں ایک معجزہ دکھاتا ہوں ورطۂ حیرت میں ڈال سکتا تھا۔ آج ایسے کرتب سب کو معمولی نظر آتے ہیں اور وہ انہیں روزمرہ مشاہدہ میں آنے والی عام چیزیں محسوس ہوتی ہیں۔ انسان کا علم بظاہر خواہ کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو بہرحال محدود ہوتا ہے جبکہ علم الٰہی کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ اس لئے جب کوئی ایسا قانون قدرت رُوبعمل آجائے جو انسان کے اپنے محدود دائرہ علم سے باہر ہو تو وہ اسے معجزہ کی طرح ہی نظر آتا ہے۔ لیکن جب بعد ازاں مزید علم حاصل ہونے پر ہم پیچھے مڑ کر انہی چیزوں پر دوبارہ نظر ڈالتے ہیں تو ہم قوانین کی ایسی تمام نام نہاد خلاف ورزیوں کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ وہ سب تو قدرتی مظاہر تھے جنہیں اس زمانہ کے لوگ اپنی لاعلمی سے سمجھ نہیں سکے تھے اسی لئے میں نے کہا کہ مسیح کی بن باپ ولادت قدرت خداوندی کا ایک مظہر ہی تھی۔ یعنی بعض قوانین قدرت کی کارفرمائی کے نتیجہ میں ہی ایسا ظہور میں آیا تھا جن کا اس زمانہ کے لوگوں کو قطعاً کوئی علم نہ تھا اور آج کے زمانہ کے لوگوں کو بھی جزوی علم کے سوا اس کا پورا علم ابھی حاصل نہیں ہو سکا ہے۔ البتہ سائنسی بنیادوں پر اس سمت میں مسلسل پیش رفت ہو رہی ہے اور معلومات میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس لحاظ سے ایک وقت ایسا آسکتا ہے کہ جب کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ مسیح کی پیدائش قانون قدرت سے ماورا ایک معجزہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ جو لوگ آج یہ کہتے ہیں انہیں بالآخر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ شاذ کے طور پر رُونما ہونے والا ایک قدرتی واقعہ تھا یعنی تھا تو یہ ایک قدرتی واقعہ ہی لیکن تھا اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایسا کمیاب کہ انسانی تجربہ کی رُو سے ایسا بہت کم ہوا کرتا ہے۔

مسیح کی ابنیت سے پیدا ہونے والے اشکال (مسیح خدا کا بیٹا)

یسوع مسیح کی ذات، مقام اور خدا سے اس کے تعلق کے بارہ میں عیسائی حضرات کی تفہیم کچھ اس نوعیت کی ہے کہ اسے تسلیم کرنے سے کئی لاینحل مسائل سر اٹھائے بغیر نہیں رہتے۔ مسیحی عقیدہ کے مزید تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ سے جو بات ابھر کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ خدا کا ایک بیٹا ہے جو بیک وقت مکمل انسان اور مکمل خدا دونوں کی خصوصیات اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ عیسائیوں کے عقیدہ کی رو سے اگر دیکھا جائے تو باپ بعینہٖ بیٹے جیسا نہیں ہے۔ باپ اپنی ذات میں ایک مکمل خدا ہے لیکن وہ مکمل انسان نہیں ہے۔ جبکہ بیٹا مکمل خدا بھی ہے اور مکمل انسان بھی۔ اس لحاظ سے اس کی دو شخصیتیں ہیں اور بلحاظ خصوصیات دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

یہ بات قابل غور ہے کہ یہ خصوصیات ایسی ہیں جو باہم ایک دوسرے میں منتقل نہیں ہو سکتیں۔ بعض مادوں میں ایسے خواص ہوتے ہیں جو قابل انتقال ہونے کے باعث مختلف شکلوں میں منقلب ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر پانی ہی کو لے لیں۔ یہ اپنی اصلیت اور اجزائے ترکیبی میں کوئی فرق لائے بغیر برف اور اسی طرح بخارات میں تبدیل ہو سکتا ہے لیکن خدا اور مسیح کے امتیازی اوصاف (جبکہ ان دونوں میں سے ایک میں بعض اوصاف کا اضافہ کر دیا گیا ہے) باہم ایک دوسرے سے آگ اور پانی کی طرح میل کھا ہی نہیں سکتے۔ ان میں سے ایک کے لئے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ دوسرے جیسی قلب ماہیت اختیار کر سکے یا اس کی طرح اپنی کایا پلٹ سکے اور پھر بھی مسیحی عقیدہ کی رو سے یہ ماننا ضروری ہے کہ دونوں باہم اس طرح ایک جیسے ہیں کہ ان میں فرق کرنا ممکن نہیں۔

ایک مسئلہ اور بھی ہے اور وہ فی ذاتہٖ ہے بھی بہت گھمبیر۔ وہ یہ ہے کہ کیا واقعی مسیح مکمل خدا ہونے کے ساتھ ساتھ مکمل انسان بھی تھا۔ یہ سوال اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ واقعی ایسا ہی تھا تو ماننا پڑتا ہے کہ وہ باپ سے مختلف تھا کیونکہ باپ نے تو بیٹے کی طرح کبھی مکمل انسان کا روپ اختیار کرنے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوا۔ یہ کس قسم کی رشتہ داری تھی دونوں کے مابین؟ کیا بیٹا درجہ میں باپ سے بھی بڑا تھا؟ اگر بیٹے کو مکمل انسان ہونے کے اضافی وصف نے کسی بڑائی یا فضیلت سے ہمکنار نہیں کیا تو پھر یہ اضافی وصف، وصف نہ رہا بلکہ ٹھہرا ایک نقص۔ اس لحاظ سے بیٹا خدا کے مقابلہ میں ناقص ثابت ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ یہ امر ظاہر و باہر ہے کہ خدا کے ناقص بیٹے کا تصور نہ صرف مسیحی عقیدہ اور دعویٰ کے برخلاف ہے بلکہ خود خدا کے بیٹے

کا تصور ہی خدا کی ہستی کے عالمگیر تصور یا نظریہ سے قطعاً کوئی میل نہیں کھاتا۔ پس عیسائیت کے ایسے سراسر متناقض عقیدہ کو کوئی کیسے درست سمجھ سکتا ہے جو ہم سے اس بات پر ایمان لانے کا تقاضا کرتا ہے کہ "ایک میں تین" اور "تین میں ایک" کے درمیان کوئی فرق نہیں بلکہ یہ دونوں ہو بہو ایک ہی ہیں۔ ایسا اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ جب کسی عقیدہ کی تمام تر بنیاد حقیقت کی بجائے سراسر بے اصل قصے کہانیوں پر اٹھائی جائے۔

اسی پر بس نہیں حل طلب مسئلہ ایک اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر مریم کے بطن سے پیدا ہونے کی وجہ سے مسیح خدا کا بیٹا بن گیا تھا تو اس نئی پیدائش سے قبل اس کی حیثیت کیا تھی؟ اگر وہ مریم کے بطن سے پیدا ہونے سے پہلے بھی خدا کا ازلی بیٹا تھا تو اسے جسمانی جسم میں مقید کر کے ولادت کے چکر میں ڈالنا کیوں ضروری تھا؟ اور اگر ایسا ہونا ضروری تھا تو یہ اس امر پر دال ہے کہ اس کے بیٹا ہونے کی کیفیت و ماہیت ازلی نہ تھی بلکہ جب وہ انسانی جسم کو خیرباد کہہ کر آسمان کی طرف واپس لوٹ گیا تو وہ اضافی وصف بھی جاتا رہا۔ پس اگر دیکھا اور غور کیا جائے تو اس مسیحی عقیدہ سے ایک نہیں کئی الجھنیں جنم لیتی ہیں اور ان الجھنوں کی وجہ سے عقل عمومی اسے رد کیے بغیر نہیں رہتی۔ میں پھر سب مسیحی حضرات کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ ان الجھنوں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے ولادت مسیح کے ایک باعزت اور حقیقی منظر نامہ کو قبول کر لیں اور اس کی رو سے وہ اس حقیقت پر ایمان لے آئیں کہ خدا نے اپنے بعض مخفی قوانین قدرت کو بروئے کار لا کر تخلیق کے ایک غیر معمولی اور خاص ذریعہ سے مسیح کو ولادت بخشی۔ مسیح تمثیلی اور استعارہ کے رنگ میں خدا کا بیٹا تھا نہ کہ حقیقی رنگ میں۔ حقیقی بیٹے کا تصور اس کی الوہیت اور وحدانیت کے سراسر منافی ہے۔ تمثیلی رنگ میں اس کا بیٹا ہونے کی وجہ سے خدا نے اسے اپنی محبت خاص کا سزاوار ٹھہرایا۔ اپنے اس امتیاز کے باوصف وہ ایک انسان ہی تھا نہ کہ خدا۔ رہا اس کا ابن اللہ ہونے کا تصور سو اس کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسیح کے قریباً تین سو سال بعد اس تصور کو اس کی ذات کے ساتھ اس لئے منسلک کیا گیا تا کہ ایک مافوق الفطرت طلسماتی داستان کے طور پر اس کا تذکرہ آئندہ بھی زندہ رہے۔ حیات مسیح کے اس پہلو پر ہم بعد میں روشنی ڈالیں گے۔

باپ خدا اور مریم کے درمیان ازدواجی رشتہ کا سوال ایک ایسا ناگوار سوال ہے جس پر کھلے بندوں بحث کرنے سے کون ہے جو کراہت محسوس نہ کرے تاہم باپ اور بیٹے کے مابین مریم کی درمیانی واسطہ والی حیثیت کو سمجھنے کی کوشش ایک ایسا معاملہ ہے کہ اس کے ذکر کو ناپسندیدہ ہونے کے باوجود یکسر نظر انداز

کرنا بھی مشکل ہے۔ غالباً یہی وہ سوال تھا جو مشہور جرمن فلاسفر نطشے (Nietzsche) کے لئے بہت خلجان کا موجب بنا اور آخر کار اس نے اس بارہ میں اپنی گھٹی اور دبی ہوئی بے اطمینانی کے اظہار کا ذریعہ ان الفاظ کو بنایا:

”زرتشت جب جادوگر سے مخلصی حاصل کر چکا تو ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اس نے دیکھا کہ جس راستہ پر وہ جا رہا ہے اس کے ایک طرف پھر کوئی بیٹھا ہوا ہے وہ کالے رنگ والا ایک لمبے قد کا آدمی تھا جس کے تکان سے اُترے ہوئے چہرہ کا رنگ زرد پڑ رہا تھا۔ اس نے دل میں کہا ”افسوس انسان کے روپ میں یہ ایک اور آفت میرا راستہ روکے کھڑی ہے۔ وضع قطع سے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ کوئی پادری یا راہب قسم کا آدمی ہے۔ اس یعنی زرتشت نے کہا ”اے راہ گیر! تو جو کوئی بھی ہے ایک ایسے شخص کی مدد کر جو راستہ سے بھٹک کر ادھر آنکلا ہے یعنی مجھ ایسے بوڑھے کی جو اپنے آپ کو دکھ اور مصیبت میں مبتلا کرنے یہاں آوارد ہوا ہے۔“

(راہ میں بیٹھے اس تھکے ماندے بوڑھے نے کہا) ”یہاں کی دنیا مجھ بوڑھے کے لئے دور دراز کی ایک اجنبی دنیا ہے۔ یہاں جنگلی جانوروں کی آوازیں مجھے سنائی دے رہی ہیں۔ وہ جو مجھے پناہ دے سکتا تھا وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ میں ایک آخری پارسا انسان، روحانی بزرگ اور راہب کو تلاش کر رہا تھا جس نے اس جنگل میں رہنے کی وجہ سے وہ کچھ نہیں سنا جو ساری دنیا جانتی ہے۔“

زرتشت نے پوچھا ”ساری دنیا کیا جانتی ہے؟ کیا تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ وہ قدیم خدا جس پر ساری دنیا ایمان رکھتی تھی اب زندہ نہیں رہا۔“ بوڑھے نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ”ہاں بات یہی ہے۔ میں نے اس قدیم خدا کی اس کے آخری لمحات تک خدمت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اب میں اپنے آقا کی عدم موجودگی کے باعث خدمت گزاری کے فریضہ سے ریٹائر ہو چکا ہوں لیکن آزاد میں اب بھی نہیں ہوں اور نہ گھنٹہ بھر کے لئے بھی خوشی میرے قریب پھٹکتی ہے سوائے اس کے کہ میں پرانی یادوں میں ہی مگن رہتا ہوں۔ میں ان پہاڑوں پر اس لئے چڑھ آیا تھا کہ میں آخر میں ایک بار پھر روحانی جشن منالوں کیونکہ ایک بوڑھے پوپ اور کلیسیا کے فادر کو یہی زیب دیتا ہے کہ وہ نیک یادوں اور مقدس عبادتوں کا جشن منائے

لیکن یاد رکھو! میں آخری پوپ ہوں۔"
"مگر انسانوں میں سے سب سے پارسا انسان اور وہ روحانی بزرگ جو اس جنگل میں گنگنا گنگنا کر خدا کی حمد کے ترانے گایا کرتا تھا (اور جس کی تلاش میں میں یہاں آیا تھا) وہ بھی اب مر چکا ہے۔"
"جب تلاش بسیار کے بعد مجھے اس کی جھونپڑی ملی تو میں نے اسے اس میں موجود نہ پایا۔ اس میں اگر کوئی ملا تو دو بھیڑیئے ملے۔ وہ آوازیں نکال نکال کر اس کی موت پر رو رہے تھے کیونکہ جانور اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ میں جلدی سے وہاں سے نکل آیا۔"
"کیا میں ان جنگلوں اور پہاڑوں میں یونہی بے کار بھٹکنے اور مارا مارا پھرنے کے لئے آیا تھا؟ اس خیال کے آنے پر میرے دل نے فیصلہ کیا کہ میں ان تمام لوگوں میں سے جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے ایک اور سب سے زیادہ پارسا انسان کو تلاش کروں یعنی زرتشت کو ڈھونڈ نکالوں۔"
اس بوڑھے آدمی نے یہ کہا اور گھسنے اور اندر اتر جانے والی نظروں سے اسے گھورنے لگا جو اس کے سامنے کھڑا تھا۔ زرتشت نے اس بوڑھے پوپ کا ہاتھ تھام لیا اور احتراماً دیر تک اس کی تعریف کرتا رہا۔ پھر اس نے کہا: "اے محترم شخص دیکھ تیرا ہاتھ کیسا لمبا اور خوبصورت ہے لیکن اب اس ہاتھ نے اسے مضبوطی سے تھاما ہوا ہے جس کا تو متلاشی تھا یعنی تو نے مجھ زرتشت کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے رکھا ہے۔"
"یہ میں ہی ہوں خدا کی ہستی پر یقین نہ رکھنے والا زرتشت! وہی زرتشت جو یہ کہتا ہے کہ مجھ سے زیادہ خدا کا منکر اور کون ہے کہ میں اس کی تعلیم میں مگن اور خوش رہوں۔"
زرتشت نے یہ کہا اور پھر اپنی گہری اور اندر اتر جانے والی نظر سے اس بوڑھے پوپ کے خیالات اور مخفی جذبات کو بھانپنے اور جاننے کی کوشش کی۔ آخر کار اس (بوڑھے پوپ) نے کہنا شروع کیا:
"جو اس کے ساتھ سب سے زیادہ محبت کرتا تھا اور جس نے اس کو سب سے زیادہ اپنایا ہوا تھا اسی نے اب اس کو سب سے زیادہ گمشدہ کر کے فراموش کر دیا ہے۔"
دیکھو! کیا اب میں ہم دونوں میں سے زیادہ خدا کا منکر نہیں ہوں۔"

زرتشت نے گہری خاموشی کے بعد بڑے فکر انگیز لہجے میں کہا: "تم نے آخر تک اس کی خدمت کی۔ کیا تمہیں پتہ ہے کہ اس کی موت کیسے واقع ہوئی؟ کیا وہ جو لوگ کہتے ہیں، صحیح ہے کہ اس کی رحم دلی نے خود اس کا اپنا گلا گھونٹ کر رکھ دیا۔

"اور یہ کہ اس نے دیکھا کہ آدمی کیسے صلیب پر ٹنگا ہوا تھا۔ وہ اس تکلیف کو برداشت نہ کر سکا۔ لوگوں سے محبت اس کے لئے جہنم بن گئی اور آخر کار اس کی موت پر منتج ہوئی۔"

بوڑھے پوپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اس حال میں کہ چہرے پر دکھ اور ملال کے آثار ہویدا تھے خفت کے رنگ میں ایک اور ہی سمت گھورنے لگا۔

زرتشت نے کافی غور و فکر میں ڈوبے رہنے کے بعد جس کے دوران وہ بوڑھے شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورتا رہا تھا۔ آخر کار کہا "اب مجھے چلنا چاہیے۔"

"اسے جانے دو وہ کبھی کا ختم ہو چکا۔ اور یہ امر تیرے معزز ہونے پر دلالت کرتا ہے کہ تو اس مرے ہوئے خدا کو اچھے رنگ میں یاد کرتا ہے۔ ویسے تو بھی جانتا ہے اور میں بھی جانتا ہوں کہ وہ کون اور کیا تھا اور یہ کہ اس نے عجیب راہوں کی پیروی کی۔"

بوڑھے پوپ نے خوشی کے عالم میں کہا: "یہ آپس کی بات ہے اور میں آنکھوں تلے کہہ سکتا ہوں (کیونکہ وہ ایک آنکھ سے اندھا تھا) مقدس روحانی امور میں خود زرتشت سے زیادہ روشن ضمیر ہوں اور اے کاش ایسا ہی ہو۔"

میں نے از راہِ محبت بہت سالوں تک اس کی خدمت کی اور اپنی مرضی کو اس کی مرضی کے تابع کر کے میں اس کی رضا کی تمام راہوں پر چلا۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک اچھا خدمت گزار سب کچھ جانتا ہے اور وہ کچھ بھی جانتا ہے جسے اس کا آقا خود اپنے آپ سے چھپایا کرتا تھا۔"

وہ ایک پوشیدہ خدا تھا اور سربستہ راز کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ اپنے ایک بیٹے کے روپ میں آیا اور آیا بھی خفیہ اور بالواسطہ ذرائع سے۔ اس پر ایمان لانے کی راہ کے دروازہ میں بدکاری ایستادہ ہے۔"

"جو کوئی محبت کے خدا کی حیثیت سے اس کی تعظیم کرتا ہے وہ خود محبت کو عظیم درجہ نہیں دیتا

اور محبت کا اچھے لفظوں میں ذکر نہیں کرتا۔ کیا یہ خدا یہ نہیں چاہتا کہ خود اس کا بھی محاسبہ کیا جائے؟ لیکن محبت کرنے والا تو جزا سزا کے خیالات سے بالا ہو کر محبت کرتا ہے۔"

"یہ مشرقی خدا جب حیوان تھا تو یہ بہت سخت گیر اور منتقم مزاج تھا۔ اس نے اپنے پسندیدہ لوگوں کی خوشی کی خاطر خود ایک جہنم تیار کی۔"

"لیکن آخر کار وہ خدا بوڑھا ہو گیا اور اس عمر میں وہ باپ سے زیادہ ایک دادا کے مانند بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ایک لڑکھڑاتی اور ہپہپاتی بوڑھی دادی کی طرح بہت نرم خو، شیریں و دلکش اور محبت کرنے والا بن گیا۔"

"پھر وہ خدا اپنے کمرے کی چمنی کے ایک کونہ میں جر مر اور حلوہ حریسہ ہو کر بیٹھ رہا اور اپنی کمزور ٹانگوں پر اپنے آپ کو سنبھالے بیٹھا جھنجھلاتا رہا۔ وہ دنیا اور اس کے کاروبار سے تھک ہار کر اس حال کو پہنچا تھا اور اپنی مرضی چلانے سے اکتا چکا تھا اور پھر آخر ایک دن اپنے حد سے زیادہ بڑھے ہوئے رحم کے ہاتھوں دم گھٹنے سے مر گیا۔"[1]

---

[1] (Thus Spoke Zarathustra by Friedrich Nietzsche p. 271-273. Translation published by Penguin Books 1969)

"زرتشت یوں گویا ہوا" مصنفہ فریڈرک نطشے، صفحات 271 تا 273 بکس پنگوئن شائع کردہ ترجمہ۔ 1969ء)

باب دوم

گناہ اور کفّارہ

اب ہم مسیحیت کے دوسرے بہت ہی اہم رکن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ تاہم میں ایک بات شروع میں ہی واضح کر دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اس دوسرے رکن کی جو تفصیل یہاں بیان ہو گی وہ ہو گی تو مستند عیسائی کتب سے ماخوذ لیکن اب سارے کے سارے عیسائی حضرات اس پر من و عن اسی طرح ایمان نہیں رکھتے۔ بعض جداگانہ کلیسیائی نظاموں سے تعلق رکھنے والے فرقے ایسے بھی ہیں جو اس بارہ میں اصل کلیسیا کی درشت اعتقادی روش سے متفق نہ ہوتے ہوئے اس روش سے قدرے ہٹ گئے ہیں اور انہوں نے اپنے رویہ میں کسی قدر نرمی پیدا کر لی ہے۔ اس کے باوصف یہ بات اپنی جگہ سولہ آنے درست ہے کہ "گناہ اور کفارہ" کے عقیدہ میں کارفرما فلاسفی کو مسیحی مذہب میں راسخ الاعتقادی کے اعتبار سے بنیادی اصول یا رکن رکین کی حیثیت حاصل ہے۔

"گناہ اور کفّارہ" کی مسیحی تفہیم اور اس کی تشریح کے اجزائے ترکیبی میں سے پہلا جزو یہ ہے کہ خدا بہرحال منصف مزاج اور عدل پرور ہے۔ وہ کانٹے کی تول پورے اور بہر طور پر مکمل انصاف کا نفاذ ضرور عمل میں لاتا ہے۔ وہ ازروئے عدل پوری سزا دیئے اور عدل کا تقاضا عملاً پورا کیے بغیر انسانوں کے گناہ معاف نہیں کیا کرتا کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرے یعنی سزا دیئے بغیر ہی گناہ بخش دیا کرے تو اس کا یہ فعل عدل کا خون کرنے کے مترادف ہو گا۔ مسیحیوں کے نزدیک خدا تعالیٰ کی صفت عدل اس امر کو ناگزیر اور لابُدّی بنا دیتی ہے کہ کفارہ اور مسیحی نظریہ کو سو فیصد درست تسلیم کیا جائے۔

"گناہ اور کفّارہ" کی مسیحی توجیہ کا دوسرا جزو یہ ہے کہ انسان گناہ گار ہے یعنی وہ پیدا ہی گناہ گار ہوتا ہے۔ وجہ اس کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ آدم اور حوّا کے پہلے اور ابتدائی گناہ کی وجہ سے ان کی نسل کو گناہ ورثہ میں ملنا شروع ہوا اور اس وقت سے ملتا چلا آرہا ہے۔ یعنی نسل آدم کے توارثی جرثوموں (Genes) میں گناہ منتقل ہوتا چلا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت سے ہی آدم کی تمام اولاد فطرتاً گناہگار پیدا ہوتی چلی آرہی ہے۔

اس عقیدہ کا تیسرا جزو یہ ہے کہ ایک گناہ گار انسان دوسرے گناہ گار انسان کا کفارہ ادا نہیں کر سکتا۔

کفارہ صرف اور صرف وہ ادا کر سکتا ہے جو فی نفسہٖ گناہ سے پاک ہو۔ کفّارہ کی اس بنیاد سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عیسائیوں کی اپنی سمجھ اور تفہیم کے مطابق خدا کا کوئی نبی یا رسول خواہ وہ نیکی اور پارسائی میں درجۂ کمال کے کتنا ہی قریب پہنچا ہوا تھا بنی نوع انسان کو گناہ سے پاک نہیں کر سکتا تھا۔ بالفاظ دیگر وہ انہیں گناہ اور اس کے نتائج و عواقب سے چھٹکارا نہیں دلا سکتا تھا۔ وہ نبی یا رسول ہونے کے باوجود بیٹا تو بہرحال آدم ہی کا ہوتا تھا اس لئے وہ خود فطرت میں رچے ہوئے گناہ کے اثر سے بچا ہوا نہیں ہوتا تھا۔ جب وہ پیدا ہوتا تھا تو گناہ کا بیج اس کے اندر پہلے سے موجود ہوتا تھا۔

سادہ الفاظ میں یہ ہے اس سارے عقیدہ کا لبّ لباب۔ اب رہا یہ سوال کہ پھر انسان گناہ سے نجات کیسے حاصل کرے؟ سو مسیحی عالموں کی طرف سے اس کا جو حل پیش کیا جاتا ہے اب ہم اس کی طرف آتے ہیں۔

بنی نوع انسان کی طرف سے کفّارہ کی ادائیگی

اس عقدۂ لاینحل کو حل کرنے کے لئے مسیحی عقیدہ کی رُو سے خدا نے بالکل ایک نئی اُپَج کا آئینہ دار منصوبہ اختیار کیا۔ یہ بات واضح نہیں ہے کہ اس نے اس بارہ میں اپنے ”بیٹے“ سے بھی مشورہ کیا تھا یا نہیں یا یہ کہ ”باپ بیٹا“ دونوں کو ایک ساتھ ہی یہ منصوبہ سوجھا یا پھر یہ کہ یہ منصوبہ تمام تر ”بیٹے“ ہی کی سوچ کا نتیجہ تھا اور بعد میں ”باپ خدا“ نے اسے قبول کر لیا۔

اس منصوبہ کے جو نمایاں خدوخال مسیح کے اس دنیا میں آنے پر منکشف ہوئے وہ یہ ہیں۔

دو ہزار سال پہلے خدا کے بیٹے نے جو ازلی ہونے میں اس کا برابر کا شریک تھا ایک انسانی ماں کے بطن سے جنم لیا۔ ”خدا کا بیٹا“ ہونے کی حیثیت میں وہ کامل انسان اور کامل خدا ہر دو کی جملہ خصوصیات کو اپنے وجود میں جمع رکھتا تھا۔ مزید برآں ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ایک پاکدامن اور پارسا خاتون جس کا نام مریم تھا خدا کے بیٹے کی ماں بننے کے لئے منتخب کی گئی۔ وہ خدا کے اشتراک سے حاملہ ہوئی۔ اس لحاظ سے خدا کا حقیقی بیٹا ہونے کی حیثیت میں مسیح گناہ کے بغیر پیدا ہوا۔ اس کے باوجود کسی نہ کسی طرح اس نے اپنی انسانی شخصیت کو برقرار رکھا۔ اور پھر اس نے رضاکارانہ طور پر اپنے آپ کو پیش کر دیا کہ وہ تمام انسان جو اس پر ایمان لے آئیں گے اور اسے اپنا نجات دہندہ تسلیم کر لیں گے وہ ان کے موروثی گناہ کا تمام تر بوجھ خود اٹھا لے گا۔ دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ ذہانت کی آئینہ دار اس پر حکمت تدبیر سے خدا کو اپنے کامل عادل ہونے کی ازلی صفت کے بارہ میں مفاہمت کے رنگ میں کسی تخفیف و تنقیص سے دوچار نہ ہونا پڑا۔

یہ یاد رہے کہ اس طریقۂ واردات اور طرزِ عمل کے اختیار کرنے کے نتیجہ میں اصلاً یہ صورت حال پھر بھی قائم رہتی ہے کہ انسان خواہ کسی درجہ کا گنہگار ہو وہ بہر حال سزا کا مستوجب ٹھہرے گا اور خدا اپنے عدل کے تقاضوں میں سرِ مُو فرق لائے بغیر گناہ گار سے اس کے گناہ کا بدلہ لینے کا مجاز رہے گا۔ پہلی صورت حال میں اور ڈرامائی تبدیلی لانے والی بعد کی صورت حال میں فرق صرف یہ ہے کہ سزا تو ملی مگر آدم کے بیٹوں اور بیٹیوں کو نہیں بلکہ "خدا کے بیٹے" مسیح کو ملی اور یہ مسیح کی رضاکارانہ قربانی ہی ہے جو اولاد آدم کا کفّارہ ادا کرنے میں آلہ کار ثابت ہوئی۔ ورنہ نسل انسانی کے لئے خدائے منتقم کی مقرر کردہ سزا سے بچنے کا کوئی امکان نہ تھا۔

یہ منطق کتنی ہی عجیب کیوں نہ نظر آئے عقیدہ اور اس کی تشریح کے مطابق واقعۃً ہوا یہی کہ مسیح نے رضاکارانہ طور پر اپنے آپ کو پیش کر دیا جس کے نتیجہ میں نسل آدم تو سزا سے بچ گئی لیکن مسیح کو ان گناہوں کی سزا بھگتنا پڑی جن کا اس نے سرے سے ارتکاب ہی نہیں کیا تھا۔

آدم اور حوّا کا گناہ

آیئے ہم اس عقیدہ کی روشنی میں آدم اور حوا کے قصہ پر دوبارہ نظر ڈال کر اس کا شروع سے ایک دفعہ پھر جائزہ لیں۔ اس عقیدہ کا کوئی ایک پہلو بھی ایسا نہیں ہے جسے انسانی ضمیر اور منطق قبول کر سکے۔

سب سے اوّل تو نظریہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ آدم اور حوّا نے گناہ کیا اس لئے ان کی اولاد نسلاً بعد نسلٍ ابد الآباد تک کے لیے گناہ گار قرار پاتی چلی گئی۔ گویا آدم اور حوا کا گناہ حیاتیات کے قدرتی نظام کے تحت یکدم ہی اگلی نسلوں میں منتقل ہونا شروع ہو گیا اور نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا چلا گیا۔ ابتدائے آفرینش سے جاری سلسلہ توالد و تناسل (Genetics) کی سائنس کی رو سے فوری طور پر ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس سائنس نے اس امر کا انکشاف کیا ہے کہ اگر ایک انسان زندگی بھر نیک یا بد خیالات و اعمال کا پوری طرح پابند رہے اور اس میں کوئی فرق نہ آنے دے تو بھی وہ خیالات و اعمال نسل انسانی کی افزائش کے تناسلی نظام میں من و عن منتقل ہو کر اس میں اپنا دائمی نقش قائم نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر انسان کا اپنا انفرادی عرصۂ حیات اتنا مختصر ہوتا ہے کہ وہ توالد و تناسل کے قدرتی نظام میں یکدم گہری اور انمٹ تبدیلیاں نہیں لا سکتا۔ انسانوں کے توارثی جرثومے یا عنصر Gene میں نئے خواص مرتسم ہونے اور پھر ان کے دائمی جڑ پکڑنے کے لئے لاکھوں سال درکار ہوتے ہیں۔

اسی پر بس نہیں اگر تخیل کی کسی انتہائی نامعقول اور ناقابل قبول کھینچا تانی کے ذریعہ انسان اس امر کو ذہن میں لے ہی آئے کہ ایسا عجیب و غریب اور بے ڈھب واقعہ حقیقتاً رُونما ہوا تھا تو اسی انوکھی منطق کی رو سے یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس سے الٹ اور یکسر متضاد واقعہ بھی رونما ہو سکتا ہے۔ یعنی اگر گناہ اس قدر فوری اور دیرپا اثر دکھا کر ابدالآباد تک کی نسلوں کو گناہگار بنا سکتا ہے تو پھر اس کے بالمقابل نیکی کو ایسے انقلاب انگیز اثر سے عاری کیوں قرار دیا جائے۔ اسی طرح یہ بھی تو تسلیم کرنا چاہیے کہ اگر ایک گناہ گار انسان توبہ کر کے نیکی کے راستہ پر پوری استقامت کے ساتھ گامزن ہو جائے اور انجام کار صحیح معنوں میں پاک صاف اور مطہر ہو جائے تو اس کی یہ نیکی نظام توالد و تناسل میں یک دم ریکارڈ ہو کر نوع انسانی کے تمام سابقہ گناہوں کے اثرات کو ہمیشہ ہمیش کے لئے محو کر سکتی ہے۔ اگرچہ سائنسی طور پر تو ایسا ہونا ممکن نہیں لیکن یہ خلاف حقیقت ہونے کے باوجود ایک نسبتاً متوازن تصور ہے اور زیادہ منطقی ہے بہ نسبت اس نظریہ کے کہ صرف گناہ کے میلان میں ہی یہ قوت اور تاثیر ہے کہ وہ نظام توالد و تناسل میں منتقل ہو کر اپنے اثر کو دوام بخش سکتا ہے جبکہ نیکی کا میلان قوت تاثیر سے عاری ہے۔

دوسرے یہ امر بھی قابل غور ہے کہ آدم اور اس کی ایک لغزش کا مسئلہ حل کرنے کی خاطر تجویز یہ کیا گیا کہ آدم کا گناہ سلسلہ توالد و تناسل کے ذریعہ آدم کی نسل میں منتقل ہوتا چلا گیا اور پھر خدا نے ہزاروں سال بعد "اپنے بیٹے" کی قربانی کے ذریعہ اس کا کفارہ ادا کر کے انصاف اور عدل کے تقاضا کو پورا کیا۔ سزا دہی اور کفارہ کے اس سلسلہ دراز سے حاصل کیا ہوا؟ اس پر غور کیا جائے تو اس کا ماحصل یہ نکلتا ہے کہ اس سے گناہ اور کفارہ کی اصل بنیاد از خود منہدم ہو جاتی ہے۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ اگر خدا کامل عادل اور پورا پورا انصاف کرنے والا ہے تو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آدم اور حوا نے جو عارضی اور وقتی نافرمانی کی اور پھر دونوں اس سے تائب بھی ہوئے اس کی پاداش کے طور پر ان کی بعد میں آنے والی تمام نسلوں کو مرڈود بنا چھوڑا۔ جو گناہ آدم اور حوا نے کیا تھا اس پر انہوں نے ندامت کا اظہار کر کے توبہ بھی کر لی تھی اور پھر اپنے اس گناہ کی انہیں سزا بھی مل گئی تھی اور وہ سزا تھی بھی بہت سخت کیونکہ انہیں بڑی ذلّت کے ساتھ جنت سے نکال دیا گیا تھا۔ اب یہ کہاں کا اور کیسا انصاف ہے خدا کا کہ آدم اور حوّا کے ذاتی گناہ کی انہیں سزا دینے کے باوجود اس کا انتقام کا جذبہ اس وقت تک ٹھنڈا نہیں پڑتا جب تک کہ پوری نسل انسانی کو کمال بے بسی سے دوچار کر کے انہیں اس قعرِ مذلّت میں نہیں گرا دیتا کہ نظام توالد و تناسل کے تحت بلا استثنا سب کے

سب گناہ گار پیدا ہوتے چلے جائیں۔ کون سا موقع یا امکان باقی چھوڑا گیا تھا نسل آدم کے لئے کہ وہ گناہ اور اس کے اثر سے بچ سکے؟ اگر والدین کوئی غلطی کرتے ہیں تو ان کے معصوم بچے کیوں ہمیشہ کے لئے دکھ اٹھائیں اور ابد الآباد تک کے لئے خُسرانِ مبین میں مبتلا رہیں؟

جب یہ صورت احوال ہو تو کہنے والے کیوں نہ کہیں کہ خدا کیسے ناقص جذبۂ انصاف کا مالک ہے کہ وہ ان لوگوں کو بھی سزا دیتا ہے جنہیں اس نے بنایا ہی ایسا ہے کہ وہ خواہ گناہ سے کتنی ہی نفرت کریں وہ گناہ کے ارتکاب سے بچ ہی نہیں سکتے۔ گناہ کو تو ان کی خلقت اور ساخت و پرداخت کا جُزوِ لاینفک بنا دیا گیا ہے۔ آدم کے کسی بچے کے لئے کوئی موقع یا امکان ہے ہی نہیں کہ وہ معصوم بن سکے۔ اگر گناہ ایک جرم تھا تو منطق کی رو سے یہ مخلوق کا نہیں خالق کا جرم شمار ہونا چاہیے۔ ایسی صورت میں وہ کیسا انصاف ہے جو جرائم کو دوام بخشنے والے کی بجائے معصوموں کو سزا دینے کا تقاضا کرتا ہے؟

گناہ اور اس کے نتائج و عواقب کی مسیحی تفہیم سے کس قدر مختلف ہے قرآن کا اعلان جو کہتا ہے۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی

(فاطر:19)

اور کوئی بوجھ اٹھانے والی جان دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا

(البقرۃ:287)

اللہ کسی شخص پر سوائے اس (ذمہ داری) کے جو اس کی طاقت میں ہو کوئی ذمہ داری نہیں ڈالتا۔

گناہ اور کفارہ کے مسیحی نظریہ سے اگر موازنہ کیا جائے تو قرآن مجید کے یہ اعلانات روح انسانی کیلئے سرمدی نغمگی سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔

اب ہم بائبل کے اس بیان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کا تعلق آدم اور حوا کے گناہ اور بطور پاداش انہیں ملنے والی سزا سے ہے۔ چنانچہ بائبل میں لکھا ہے۔

”پھر اس نے عورت سے کہا کہ میں تیرے دردِ حمل کو بہت بڑھاؤں گا۔ تو درد کے ساتھ بچے جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہو گی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔ اور آدم سے اس نے کہا چونکہ تو نے اپنی بیوی کی بات مانی اور اس درخت کا پھل کھایا جس کی بابت میں نے تجھے حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا اس لئے زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی۔ تکلیف دہ مشقت

کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس کی پیداوار کھائے گا۔ وہ تیرے لئے کانٹے اور اونٹ کٹارے اگائے گی اور تو کھیت کی سبزی کھائے گا۔ تو اپنے منہ (چہرہ) کے پسینہ کی روٹی کھائے گا جب تک کہ تو پھر زمین میں لوٹ نہ جائے اس لئے کہ تو اس سے نکالا گیا ہے۔ تو خاک ہے اور خاک میں پھر لوٹ جائے گا۔"

(پیدائش باب 3 آیات 16 تا 19)

اس کے بالمقابل جدید تحقیق کی رو سے جب آدم اور حوا پیدا ہوئے اس سے بہت پہلے سے بنی نوع انسان زمین پر موجود تھے۔ خود مغربی سائنس دانوں نے زمانہ قبل از تاریخ سے تعلق رکھنے والے انسانوں کی بعض نعشیں یا ان کے بچے کھچے حصے دریافت کیے ہیں اور انہیں بعض نام دیئے ہیں تاکہ وہ ان کی شناخت اور امتیاز کا ذریعہ بن سکیں۔ ان میں سے سب سے معروف وہ انسان ہیں جنہیں ننڈر تھل (Neanderthal) کا نام دیا گیا ہے جو آج سے ایک لاکھ سال قبل سے لے کر 35 ہزار سال قبل کے زمانہ میں اس زمین پر آباد تھے۔ ان کی آبادیاں زیادہ تر یورپ، مشرق قریب اور وسطی ایشیا کے علاقوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اسی طرح پوری نشوونما پا کر بڑا ہونے والے ایک انسانی وجود کا ڈھانچہ دریافت ہوا ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب آدم اور حوا نے جنت میں اپنے عارضی اور مختصر قیام کا آغاز کیا وہ اس زمانہ سے بھی ۲۹ ہزار سال قبل اس زمین پر گھومتا پھرتا تھا۔ اس زمانہ کے انسان جسمانی ساخت کے لحاظ سے بالکل ہماری طرح کے تھے اور وہ یورپ، افریقہ اور ایشیا میں رہتے تھے۔ بعد ازاں زمانہ برف Ice age میں وہ شمالی اور جنوبی امریکہ میں بھی پھیل گئے۔ اسی طرح آسٹریلیا میں وہاں کے قدیم باشندوں کی مستند ثقافتی زندگی کا سراغ چالیس ہزار سال قبل کے زمانہ تک ملتا ہے۔

یہ تو ہمارے اپنے زمانہ سے نسبتاً قریب کے زمانوں کا ذکر ہے ورنہ حبشہ کے مقام پر ہیڈار Hedar سے ایک عورت کا ڈھانچہ ملا ہے جو بیس لاکھ نوے ہزار سال پرانا ہے۔ بائبل کے بیان کردہ سلسلہ وار تاریخی ادوار کی رو سے آدم اور حوا آج سے چھ ہزار سال پہلے گزرے تھے۔ آدمی جب پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھتا ہے تو اپنے ہی جیسے انسانوں کی جنہیں سائنس کی مخصوص اصطلاح میں ہوموسیپیئنز Homo Sapiens کہا جاتا ہے تاریخ قدامت دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔

انسانی دکھوں کے تسلسل کا جاری رہنا

اس بارہ میں کہ آدم اور حوا کو کیوں اور کس طرح سزا ملی تھی انسان بائبل کا بیان پڑھ کر حیران ہوئے

بغیر نہیں رہتا اور گہری سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ کیا واقعی آدم اور حوا کا دور شروع ہونے سے قبل عورتیں بچے کی پیدائش کے وقت اٹھنے والی دردوں اور دیگر متعلقہ تکلیفوں سے بالکل ناآشنا تھیں اور کیا واقعی ان دردوں اور تکلیفوں کا آغاز آدم اور حوا کو ملنے والی سزا کے وقت سے ہوا۔ کوئی سائنس دان ایسا نہیں مل سکتا جو تخیل کی ایسی بے تکی پرواز پر یقین رکھتا ہو۔ سائنسی دریافتوں کے بعد سے ہمارے پاس اس امر کی وافر اور ناقابل تردید شہادتیں موجود ہیں کہ آدم اور حوا سے بہت پہلے ہی انسان کرۂ ارض کے تمام براعظموں حتیٰ کہ بحرالکاہل کے دور دراز جزیروں پر قابض ہو چکا تھا اور وہ اپنی بقا کے لئے سخت مشقت اٹھا رہا تھا۔ لٰہذا یہ کہنا کہ آدم اور حوا اس زمین پر سکونت اختیار کرنے والے پہلے انسان تھے اور یہ کہ انہوں نے گناہ کیا اور اس کی پاداش کے طور پر یہ سزا مقرر ہوئی کہ عورت دکھ درد میں مبتلا ہو کر بچہ جنے تاریخی طور پر غلط ثابت ہو چکا ہے۔ کرّۂ ارض پر زندگی کے آغاز اور اس کے بعد کے ادوار کے بارہ میں جو بہت گہری اور وسیع ریسرچ منظرعام پر آچکی ہے اس نے اس نظریہ کی تردید کا کافی مواد مہیا کر دیا ہے۔ بچہ کی پیدائش کے وقت دکھ اٹھانا ایک بدیہی امر ہے حتیٰ کہ جانور بھی جو زندگی کی درجہ بندی میں بہت کمتر درجہ کی مخلوق شمار ہوتے ہیں درد کی کیفیت میں سے گزر کر بچے جنتے ہیں۔ اگر انسان گائے بچھڑا جنتے دیکھے تو وہ مشاہدہ کر سکتا ہے کہ جس تکلیف میں سے وہ گزر رہی ہوتی ہے وہ بچہ جننے والی عورت کی تکلیف کے عین مشابہ ہوتی ہے۔ اب کون ہے جو یہ نہیں جانتا کہ ایسے بہت سے جانور آدم اور حوا سے لاکھوں لاکھ سال پہلے اس زمین پر آباد تھے؟

اب رہا محنت اور مشقّت سے روزی کمانے کی سزا کا معاملہ۔ سو اس بارہ میں بھی روئے زمین کے انسانوں کا بہ تسلسل روزمرہ یہ مشاہدہ ہے کہ انسان شروع ہی سے محنت اور مشقت سے روزی کماتا چلا آرہا ہے۔ یہ کسی کے لئے بھی قطعاً کوئی اچنبہ کی بات نہیں ہے۔ عورتیں بھی اپنے گزر اوقات کے لئے محنت کی اول دن سے عادی ہیں اور ان سے بھی پہلے ہر زندہ شے اپنی خوراک محنت کے ذریعہ ہی حاصل کرتی چلی آرہی ہے۔ محنت سے روزی کمانا یا خوراک حاصل کرنا ایک ایسی مبرہن حقیقت ہے جو زندگی کے ارتقا میں بنیادی محرّک کی حیثیت رکھتی ہے۔ تنازع للبقا یعنی زندگی کو قائم اور برقرار رکھنے کی جدّوجہد غالباً زندگی کا ابتدائی اور پہلا امتیازی نشان ہے جو اسے از قسم جمادات جملہ بے جان چیزوں سے ممیز و ممتاز کرنے والا ہے۔ یہ امتیازی نشان کارخانۂ قدرت کا ایک نمایاں اور درخشندہ مظہر ہے۔ اس کا گناہ اور اس کی سزا کے ساتھ سرے سے کوئی تعلق یا واسطہ ہے ہی نہیں۔

پھر یہ امر بھی غور طلب ہے کہ اگر یہ سب کچھ آدم اور حوا کے گناہ کی سزا کے طور پر ظہور میں آیا تھا تو انسان اس تحیر آمیز سوچ میں پڑے بغیر نہیں رہتا کہ کفارہ ادا ہونے کے بعد ہزاروں سال قبل مقرر کی جانے والی سزا کا کیا بنا؟ اگر مسیح نے گناہگار انسانوں کا کفارہ ادا کر دیا تھا تو کیا وہ سزا جو گناہ کی پاداش کے طور پر مقرر کی گئی تھی مسیح کے صلیب پانے کے بعد موقوف کر دی گئی؟ جو لوگ مسیح کے خدا کا بیٹا ہونے پر ایمان لے آئے تھے ان میں سے جو عورتیں تھیں کیا انہوں نے دردوں کی تکلیف میں سے گزرے بغیر ہی بچے جننے شروع کر دیئے تھے؟ اور اسی طرح کیا ایمان لانے والے مردوں کے لئے یہ ممکن ہوا کہ وہ جسمانی مشقت اٹھائے بغیر روزی حاصل کر سکیں؟ کیا مستقبل میں آنے والی نسلوں میں گناہ کی طرف میلان کا سلسلہ بند ہوا؟ اور ماؤں کے ہاں واقعی منزہ عن الخطا معصوم بچے پیدا ہونے لگے؟ اگر ان تمام سوالوں کا جواب اثبات میں دینا ممکن ہے تو پھر یقیناً اس امر کا کچھ نہ کچھ جواز ضرور مہیا ہو جاتا ہے کہ گناہ اور کفارہ کی مسیحی فلاسفی پر سنجیدگی سے غور کیا جائے لیکن کیا کیا جائے ان سوالوں کا ایک ہی جواب ہے کہ نہیں نہیں اور بالکل نہیں۔ اگر مسیح کے مصلوب ہونے کے بعد عیسائی دنیا اور غیر عیسائی دنیا دونوں کے ہاں اس نوعیت کی کوئی بھی تبدیلی نہیں آئی پھر کفارہ ادا ہونے کا مطلب کیا ہوا؟

مسیح کے مصلوب ہونے کے بعد بھی عقل عمومی روئے زمین کے تمام انسانوں کی یہی رہنمائی کرتی ہے کہ اگر کوئی شخص گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کی سزا بھی اسی شخص کو ملے گی کسی اور کو ہرگز نہیں۔ ضروری ہے کہ ہر شخص اور ہر عورت الغرض سب اپنے اپنے گناہوں کے نتائج خود بھگتیں۔ بچے ہمیشہ ہی معصوم پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ سچ نہیں تو خدا کی صفت عدل رغت ربود ہوئے بغیر نہیں رہتی۔

ہم مسلمان ہونے کی حیثیت میں اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ تمام آسمانی کتابیں ازلی صداقتوں پر مبنی ہوتی ہیں۔ کوئی بھی اس کے برخلاف دعوٰی نہیں کر سکتا۔ کسی ایسی کتاب میں جس کے متعلق اس کے ماننے والوں کا دعوی یہ ہو کہ وہ خدا کی طرف سے نازل شدہ ہے جب ہمیں خامیاں یا متضاد باتیں نظر آتی ہیں تو ہم اس بارہ میں یہ رویہ اختیار نہیں کرتے کہ اسے منجانب اللہ نازل شدہ تسلیم نہ کرتے ہوئے یکسر مسترد کر دیں۔ ہم محتاط رویہ اختیار کرتے ہوئے ہمدردانہ غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید کی بہت سی باتیں اور بیانات ہمیں نیچر کی ثابت شدہ حقیقتوں سے متصادم نظر آتے ہیں تو ہم ان کتابوں کو کلی طور پر مسترد نہیں کرتے۔ اوّل تو ہم بعض پیچیدہ و مبہم عبارتوں نیز تمثیلوں اور استعاروں پر مبنی پیغامات میں

نظر آنے والے تضادات کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر تضادات کے دور ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آئے تو ہم متن کے ایک حصہ کو انسانی دست برد کا نتیجہ سمجھ کر رد کر دیتے ہیں۔ ابتداءِ عیسائیت فی ذاتہٖ صداقت کی آئینہ دار تھی۔ یہ منجانب اللہ ہونے کی وجہ سے خلاف عقل باتوں، ناقابلِ قبول حقائق یا نیچر کو جھٹلانے والے عقائد پر مشتمل نہیں ہو سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے ہم نے بائبل کے متن پر بحث کی بجائے ان بنیادی اعتقادات سے گفتگو کا آغاز کیا ہے جنہیں کئی صدیوں کے سوچ بچار کے دوران مسیحی فلاسفی کے متفق علیہ اجزائے ترکیبی کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ ان میں سے بنیادی اہمیت رکھنے والا ابتدائی مسئلہ گناہ اور کفارہ کی بابت مسیحی تفہیم سے تعلق رکھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مسیحی تاریخ کے کسی نہ کسی دور میں، کہیں نہ کہیں کسی نے بعض باتوں کو غلط نقطۂ نظر سے دیکھا اور انہیں سمجھنے میں اس نے لغزش کھائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اپنے علم اور سمجھ کے مطابق انہیں غلط معانی پہنا کر ان کی بالکل نئی توجیہات پیش کرنے کی کوشش کی اور اس طرح وہ بعد میں آنے والی نسلوں کو گمراہ کرنے کا موجب بنا۔

ورثہ میں ملنے والا گناہ

بحث و تمحیص جانچنے اور پرکھنے کی خاطر ہم فرض کر لیتے ہیں کہ عہد نامہ قدیم کے رو سے آدم اور حوا گناہ کے مرتکب ہوئے اور اس کی انہیں پوری پوری سزا دی گئی جیسا کہ بائبل میں مذکور ہے سزا ان دونوں کو ہی نہیں دی گئی بلکہ مقررہ حد سے تجاوز کر کے بعد میں آنے والی پوری کی پوری نسل آدم کو سزا کا مستوجب ٹھہرایا گیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب قرار واقعی سزا کا نفاذ عمل میں آ گیا تھا تو پھر سزا کو مزید بڑھانے اور طول دینے کی سرے سے ضرورت ہی کیوں محسوس کی گئی۔ جب کسی گناہ کی سزا دے دی جاتی ہے تو باز پرس، جواب طلبی اور سزا دہی کا معاملہ اپنے اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔ جب فیصلہ سنا کر سزا کا اعلان کر دیا جاتا ہے تو کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اعلان کردہ سزا میں مزید سزاؤں کا اضافہ کرتا چلا جائے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ آدم و حوا کے معاملہ میں بات اتنی ہی نہیں ہے کہ انہیں سخت سرزنش کی گئی اور یہ کہ جو گناہ انہوں نے کیا تھا اس سے کہیں زیادہ انہیں سزا دی گئی بلکہ اس سے بڑھ کر محل نظر بات یہ بھی ہے کہ ان کی تمام نسلوں کو گنہگار قرار دے کر انہیں جو سزا دی گئی اس کی نوعیت خود اپنی جگہ بے انتہا قابل اعتراض ہے۔ اس بارہ میں ہم پہلے ہی بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ سردست ہم جس پہلو کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ اس انتہائی قابل اعتراض سزا کی نوعیت حقیقی عدل کی ظالمانہ خلاف ورزی پر دلالت کرتی ہے۔

ہمارے آباو اجداد کے گناہوں کی پاداش میں ہمیں مسلسل سزا ملتے چلے جانا ایک قابل اعتراض بات ہے لیکن کسی کو اس کے آباو اجداد کی غلطیوں کی وجہ سے اس مجبوری میں مبتلا کرنا کہ وہ مسلسل گناہوں کا ارتکاب کرتا چلا جائے محض قابل اعتراض ہی نہیں بلکہ بدیہی طور پر نا قابلِ نفرین بھی ہے۔

ہمیں انسانی تجربہ کی ٹھوس حقیقتوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اس لئے ضروری ہے کہ ہم روزمرہ کے تجربہ کی رو سے جرم اور سزا کی مسیحی فلاسفی کو پرکھنے کی کوشش کریں۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ایک مجرم کے خلاف فیصلہ سنایا جاتا ہے جو جرم کے تناسب سے کہیں بڑھ کر سختی اور شدّت کا حامل ہے۔ ہر سمجھدار انسان ایسی حد سے بڑھی ہوئی سراسر غیر متوازن سزا کی مذمّت کرے گا۔ اس واضح حقیقت کے پیش نظر ہمارے لئے یہ تسلیم کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ آدم کو جو سزا ملی وہ ایک منصف خدا کی طرف سے دی گئی تھی۔ یہ تو ایک ایسی غیر محدود سزا تھی جو خدائی طرز عمل کے مسیحی تفہیم کے مطابق آدم اور حوا کے عرصۂ حیات سے بھی متجاوز ہو کر نسلاً بعد نسلٍ آگے بڑھائی جاتی رہی یہاں تک کہ ابد الآباد تک پیدا ہونے والی تمام نسلوں پر محیط کر دی گئی۔ آباو اجداد کے گناہوں کی سزا بھگتنے پر آنے والی نسلوں کو بھی مجبور کرنا عدل کی خلاف ورزی کو عدل کی آخری اور انتہائی حدود سے بھی ماورا ممتد کرتے چلے جانے کے مترادف ہے۔ ہم عدل کی ایسی بے مثال خلاف ورزی سے زیادہ اس کے نتیجہ میں رونما ہونے والی بدقسمتی کی آئینہ دار صورت حال کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ اس صورت حال کو ذہن میں مستحضر رکھتے ہوئے ذرا تصور میں لائیے کہ موجودہ زمانہ کا ایک جج فیصلہ سناتا ہے کہ مجرم کے علاوہ اس کے بیٹوں، پوتوں پڑپوتوں اور علیٰ ہذاالقیاس ان کے بعد آنے والی نسلوں کے تمام مردوں اور عورتوں کو ازروئے قانون اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ تا ابد گناہوں اور جرائم کا ارتکاب کرتے اور اس کی سزائیں بھگتتے چلے جائیں۔ تو سوچئے ہم عصر معاشرہ جو تہذیب و تمدن میں ترقی کے طفیل عدل و انصاف کے ایک عالمگیر تصور اور اس کے بھرپور شعور سے بہرہ ور ہو چکا ہے ایسے فیصلہ کے خلاف کس ردِّ عمل کا اظہار کرے گا؟

قاری کو یہاں باور کروانا ضروری ہے کہ ورثہ میں گناہ کا ملنا پولوس کی گھڑت ہے۔ اس کو عہد نامہ قدیم کے ساتھ جوڑا نہیں جا سکتا کیونکہ اس تصور کے برعکس بہت سارا مواد عہد نامہ قدیم میں موجود ہے۔

پانچویں صدی عیسوی میں ہپو(Hippo) کے بشپ آگسٹائن (Augustine) اور پلیگئن تحریک (Pelagian Movement) کے مابین زبردست تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آگسٹائن نے اس تحریک کو ایک بدعتی تحریک قرار دے کر اس کی شدید مذمت کی۔ اس تحریک کے بانی اور اس کے پیروؤں کا کہنا یہ تھا کہ

آدم کا گناہ ایک شخصی گناہ تھا اس گناہ کا اثر اس کی ذات تک محدود تھا۔ اس سے پوری نوع انسانی ہر گز متاثر نہیں ہوتی تھی۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہر شخص گناہ سے پاک پیدا ہوتا ہے اور ہر شخص کے اندر یہ صلاحیت موجود ہوتی ہے کہ وہ اگر چاہے تو گناہ سے پاک زندگی بسر کر سکے اور ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے گناہ سے پاک زندگی بسر کی۔ اس تحریک کے تمام لوگوں کو بدعتی قرار دے کر اسے کچلنے کی پوری کوشش کی گئی۔ سو گویا انہوں نے دن کو رات قرار دے کر اسے ملامت کا سزاوار ٹھہرایا اور رات ان کے نزدیک دن قرار پاکر قابل ستائش ٹھہری۔ بدعت حق قرار پائی اور حق کو بدعت کا درجہ دے دیا گیا۔

گناہوں کا آئندہ نسلوں میں منتقل ہونا

اب ہم اس نظریہ کا دوبارہ جائزہ لیتے ہیں کہ خدا گناہگار کو سزا دیئے بغیر معاف نہیں کرتا کیونکہ سزا دیئے بغیر معاف کرنا اس کے کانٹے کی تول پر پورا اترنے والے جذبۂ عدل کے منافی ہے۔ انسان یہ دیکھ کر دل گرفتہ اور خوف زدہ ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ صدیوں پر صدیاں گزرتی چلی آرہی ہیں اور مسیحیوں نے ایک ایسی بات کو اپنا جزو ایمان بنا رکھا ہے جو یقینی اور حتمی طور پر انسانی فہم و ادراک سے بالا اور انسانی ضمیر سے یکسر مخالف و متضاد ہے۔ دنیا ہو یا آخرت ایسا عادل خدا کس طرح محض اس بنا پر ایک گناہگار کو بخش سکتا ہے کہ ایک بے گناہ اور معصوم انسان نے اس گناہگار کے گناہوں کی سزا کو بھگتنے کے لئے اپنے آپ کو رضاکارانہ طور پر پیش کر دیا ہے۔ جونہی خدا ایسی رضاکارانہ پیشکش کو قبول کر کے اس بے گناہ و معصوم انسان کو سزا دینے پر آمادہ ہو گا وہ خود انصاف کے بنیادی اصولوں کو پامال کرنے والا بن جائے گا۔ یہ ایک عام فہم بات ہے اور ہے بھی عین قرین انصاف کہ ایک گناہ گار کو ہی اس کے اپنے گناہوں کی سزا ملنی چاہیے اور سزا خود گنہگار کو بھگتنی چاہیے نہ کہ اس کی بجائے ایک بے گناہ اور معصوم کو۔ اگر سزا کو گنہگار کی بجائے کسی بے گناہ کی طرف منتقل کر دیا جائے تو بے شمار پیچیدہ مسائل اور الجھنیں اٹھ کھڑی ہوں گی۔

مسیحی دینیات کے ماہرین کا کہنا یہ ہے کہ سزا کی اس منتقلی سے انصاف کے کسی اصول کی خلاف ورزی اس لئے لازم نہیں آتی کہ بے گناہ انسان پر کسی گنہگار شخص کی سزا زبردستی ٹھونسی نہیں جارہی ہے بلکہ وہ معصوم رضاکارانہ طور پر از خود اسے قبول کر رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ اس کی مثالیں دنیا میں بھی عام دیکھنے میں آتی ہوں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص پر اتنا قرض چڑھا ہوا ہے کہ اسے ادا کرنا اس کے بس میں نہیں ہے۔ فلاحی کاموں میں پیش پیش رہنے والا ایک خدا ترس انسان فیصلہ کرتا ہے کہ وہ

اس کا تمام قرضہ ادا کر کے اسے قرض کے بوجھ سے نجات دلا دے۔ اب بتائیے اس پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ ہمارا جواب یہ ہے کہ اگر بات اتنی ہی ہو تو ہم ہمدردی، فراخدلی اور سخاوت کے ایسے کام کی یقیناً داد دیں گے۔ لیکن اگر ایک آدمی آپ کے سامنے یہ سوال کرتا ہے کہ کسی شخص نے لاکھوں کروڑوں پاؤنڈ کا قرضہ ادا کرنا ہے اور وہ سرے سے اس قابل نہیں ہے کہ اس کی ادائیگی کر سکے۔ فلاحی کام کرنے والے ایک صاحب تشریف لاتے ہیں اور کمال ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی جیب سے ایک پینی کا سکہ نکالتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ازراہ مہربانی پیش کی جانے والی اس پینی کے عوض اس مقروض کو اس کے بھاری بھرکم قرضہ کی ادائیگی سے بری الذّمہ قرار دیا جائے۔ اپنے مذکورہ بالا جواب کی روشنی میں اب فرمائیے اس پیشکش پر آپ کا رَدِّ عمل کیا ہو گا؟ اگر دیکھا جائے تو مسیح کا تمام بنی نوع انسان کے گناہوں کی مجموعی سزا کو بھگتنے کے لئے اپنے اکیلے وجود کو پیش کرنا کروڑوں پاؤنڈ کا قرضہ بے باق کرنے کے لئے محض ایک پینی پیش کرنے سے بھی زیادہ مضحکہ خیز ہے۔ کہاں تمام کے تمام بنی نوع انسان کے بے حد و بے حساب گناہوں کا کفارہ اور کہاں ان سب کے عوض ایک اکیلے انسان یعنی تن تنہا فرد واحد کا اپنی جان کا نذرانہ! فلک بوس و ہیبت ناک سلسلہ ہائے کوہ اور رائی کے ایک ننھے سے دانہ کے درمیان کبھی کسی تناسب و توازن کا سوال پیدا ہو سکتا ہے؟ یہ امر فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ یہاں کسی مقروض یا ایک نسل کے مقروضوں کی بات نہیں ہو رہی بلکہ بات ہو رہی ہے ان کھرب ہا کھرب، پدم ہا پدم قرضہ نادہندگان کی جو ابتدائے آفرینش سے پیدا ہو ہو کر راہیٔ مُلکِ عدم ہوتے چلے جا رہے ہیں اور پھر بات ہو رہی ہے ان نادہندگان کی جنہوں نے ابھی قیامت تک پیدا ہونا اور ہوتے چلے جانا ہے۔ کوئی اندازہ لگا سکتا ہے اللہ کی اس مخلوق ناپیدا کنار ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ درپیش مسئلہ اپنی بے انداز گہرائی و گیرائی کی وجہ سے ایسا نہیں ہے کہ جس پر ایک نادار نادہند مقروض اور ایثار کا مظاہرہ کرنے والے ایک ہمدرد مالدار کی بے حیثیت مثال صادق آ سکے۔ جرم و سزا کے زیر غور معاملہ میں مسیحی عالموں کا ایک ایسے نادار مقروض کی مثال پیش کرنا جو قرضہ ادا کرنے کے قابل نہیں ہے بہت سادہ لوحی کا مظاہرہ کرنے کے مترادف ہے۔ سادگی کی آئینہ دار ایسی بے جوڑ مثال شاید ہی پہلے کبھی پیش کی گئی ہو۔ جس صورت حال کا یا منظر نامہ کی ایک بے جوڑ مثال کے ذریعہ وضاحت کی گئی ہے وہ اس امر کی متقاضی ہے کہ ہم جرم و سزا کے بعض دوسرے پہلوؤں کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے ابھی اپنی توجہ کو مزید کچھ وقت نادہند مقروض والی مثال پر مرکوز رکھیں۔

آیئے ہم ذرا غور کریں قرضے اور اس کی واپسی کے ایک مفروضہ پر۔ فرض کیجیے ایک مقروض نے جس کا نام الف ہے ایک ب نامی شخص کے ایک لاکھ پونڈ دینے ہیں۔ اگر عوامی فلاح کے کاموں میں حصہ لینے کا ایک خواہش مند مالدار شخص جس کے ہوش و حواس درست ہیں اور جو واقعی اس مقروض کو قرض کے بوجھ سے نجات دلانے میں سنجیدہ ہے تو ہر جگہ کے مروّجہ قانون اور عام دستور کا تقاضا یہ ہے کہ ب نے جو رقم الف سے لینی ہے وہ مالدار شخص پوری کی پوری وہ رقم ب کو اپنے پاس سے ادا کر دے۔ فرض کیجئے غریبوں اور ناداروں کا وہ بہی خواہ کو قرضہ کی پوری رقم دینے کی بجائے آگے آکر کہتا ہے الف نے ب کو قرضہ کی جو رقم ادا کرنی ہے اس کے بوجھ سے الف کو توسبکدوش کر دیا جائے لیکن اس کے عوض مجھ سے اتنی ہی رقم کا مطالبہ کرنے کی بجائے مجھے مارنے پیٹنے کی شکل میں کچھ جسمانی سزا دے دی جائے یا زیادہ سے زیادہ مجھے تین دن رات کے لئے قید خانہ میں ڈال دیا جائے۔ یہ تو ہے ایک فرضی قصہ لیکن اگر ایسا واقعہ حقیقتاً اس دنیا میں پیش آہی جائے تو کیا حیرت زدہ جج اور بھونچکا ہو جانے والے غریب قرض خواہ ب کی حالت دیکھنے والی نہ ہو گی لیکن غریبوں کے جس بہی خواہ اور ہمدرد کا قصہ ہم بیان کر رہے ہیں اس کی گزارش ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ وہ مزید مطالبہ پیش کرتے ہوئے کہتا ہے اے میرے آقا! اپنی اس قربانی کے عوض میں یہی کچھ نہیں مانگنا چاہتا بلکہ میری گزارش یہ بھی ہے کہ اے آقا! تیری مملکت میں جتنے بھی مقروض موجود ہیں یا آئندہ آخری زمانہ تک مزید پیدا ہونے ہیں ان سب کو میری تین دن رات کی دکھ تکلیف کے عوض قرضوں کی ادائیگی سے بری الذمہ قرار دے دے۔ کیسا انوکھا مطالبہ ہے! اسے سن کر دماغ گھوم نہ جائے تو اور کیا ہو۔

گناہ اور کفارہ کی مسیحی تفہیم پر یہ سارا معاملہ ہو بہو صادق آتا ہے۔ اس پر غور کر کے جی چاہتا ہے کہ مسیحیوں کے عادل اور منصف خدا سے عرض کیا جائے کہ جن لوگوں کو ان کی محنت کے ثمرات سے محروم کر دیا گیا تھا اور جن سے ان کی زندگی بھر کی جمع پونجی چھین لی گئی تھی انہیں پورا نہ سہی کچھ نہ کچھ معاوضہ تو ملنا چاہیے تھا۔ لیکن معمولاً ایسا ہوتا ہے کہ مسیحی خدا ان معصوموں کے مقابلہ میں جو مجرموں کے ہاتھوں دُکھ اٹھاتے اور صدمے سہتے ہیں الٹا مجرموں پر زیادہ مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔

بلاشبہ یہ بہت ہی عجیب و غریب تصور ہے عدل کا جس کے نتیجہ میں ڈاکوؤں، بچوں سے ناروا سلوک کرنے والوں، معصوموں کو اذیتیں دینے والوں اور انسانیت کے خلاف ہر قسم کے وحشیانہ جرائم کا ارتکاب

کرنے والوں کو معافی دے دی جاتی ہے بشرطیکہ وہ مرتے وقت زندگی کے آخری لمحوں میں یسوع مسیح پر ایمان لے آئیں۔ انہوں نے جن انسانوں کو بے انداز ظلم و ستم کا نشانہ بنایا اس کا حساب چکانے کا کوئی ذکر نہیں۔ نسل در نسل جاری رہنے والے زندگی بھر کے وحشیانہ جرائم اور خطاؤں سے انہیں پاک و صاف اور مطہر بنانے کے لئے مسیح کے دوزخ میں گزارے ہوئے چند لمحے کافی سمجھ لئے گئے۔

سزا یابی کے سلسلہ کا جاری رہنا

آیئے اب ہم ایک اور جرم اور اس کی نہایت خطرناک نوعیت پر غور کریں۔ یہ جرم ایسی خطرناک نوعیت کا ہے کہ جس کے نتائج و عواقب کے بارہ میں انسانی فطرت یہ تسلیم ہی نہیں کر سکتی کہ وہ آگے بھی منتقل ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک شخص بڑی بے دردی سے ایک بچہ کے ساتھ زیادتی کرتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ بدفعلی کا مرتکب ہوتا ہے اور پھر اسے قتل کر ڈالتا ہے۔ یقیناً یہ ایسا مکروہ اور بھیانک جرم ہے جس سے انسانی احساسات و جذبات کو ناقابل برداشت صدمہ اور اذیت پہنچے گی۔ فرض کر لیں کہ ایک ایسا بدکردار اور سفّاک شخص ہر طرف اس سے بھی بڑھ کر قبیح جرائم کے ارتکاب سے لوگوں کو اذیتیں پہنچاتا پھرتا ہے۔ وہ پکڑا نہیں جاتا اور اس طرح ازروئے عدل اس کے کیفر کردار کو پہنچنے کی نوبت نہیں آتی۔ وہ انسانی ہاتھوں سے سزا پائے بغیر اس دنیا میں زندگی گزار کر اس کے اختتام کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ وہ جزا سزا کے دن کی جواب دہی اور مُہیب تر سزا سے بچ نکلنے کا تہیّہ کرتے ہوئے زندگی کے آخری لمحوں میں مسیح کے نجات دہندہ ہونے پر ایمان لے آتا ہے۔ کیا آخری لمحات میں ایمان لے آنے سے اس کے تمام گناہ یکدم کالعدم ہو کر رہ جائیں گے؟ کیا اسے آزاد چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ ایک نوزائیدہ بچہ کی طرح گناہوں سے یکسر مبرّا ہونے کی حالت میں بڑی سہولت اور آرام سے اگلے جہان کی طرف رحلت کر جائے؟ اس طرح تو ایسا شخص جو مسیح پر ایمان لانے کو موت کا وقت آنے تک ٹالتا چلا جاتا ہے اس شخص کی نسبت زیادہ سمجھ دار اور عقل مند ثابت ہو گا جو زندگی کے اوائل حصہ میں ہی ایمان لے آتا ہے۔ ایمان لانے میں جلدی کرنے والے کے لئے یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ ایمان لانے کے بعد کہیں شیطان کی خفیہ ترغیبات کے جال میں پھنس کر گناہوں کا ارتکاب نہ کرنے لگے۔ بایں صورت حال انسانوں کو یہ ترغیب ملتی ہے کہ کیوں نہ ہم موت کا وقت قریب آنے تک رکے رہیں اور اس طرح شیطان کو یہ موقع ہی نہ دیں کہ وہ ہمارے ایمان پر ڈاکہ ڈال کر اسے لوٹ لے۔ وہ سوچ سکتے ہیں کہ یہ کیا ہی سستا سودا ہے کہ اس دنیا میں عیش و آرام

کی زندگی گزارو اور اس کے باوجود آخر وقت میں ایمان لا کر اگلے جہان میں نجات یافتہ کے طور پر دوبارہ جنم لے لو۔ کیا یہی ہے حکیمانہ عدل کی وہ صفت جسے مسیحی صاحبان خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں؟ عدل کا ایسا تصور بلکہ ایسا خدا خود خدا ہی کے پیدا کردہ انسانی ضمیر کے لئے یکسر ناقابل قبول ہے یا پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ افسوس! خود خدا نے انسانی ضمیر کو صحیح اور غلط یا نیکی اور بدی میں تمیز کی اہلیت سے عاری بنایا ہے۔

اس سارے معاملہ کا انسانی فہم و ادراک کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تو انسان محسوس کرتا ہے کہ اسے ایسی مسیحی فلاسفی کو بے معنی اور بے اصل قرار دے کر مسترد کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ گناہ اور کفارہ کی اس فلاسفی کی نہ کوئی حقیقت ہے اور نہ کوئی ٹھوس بنیاد۔ انسانی تجربہ ہمیں یہ باور کراتا ہے کہ دوسروں کے ہاتھوں دکھ اور تکلیف اٹھانے اور مصائب جھیلنے والے مظلوموں کا ہمیشہ سے خصوصی استحقاق چلا آرہا ہے کہ مواخذہ کے وقت اگر چاہیں تو ظلم ڈھانے والوں کو معاف کر دیں اور ایسا نہ کرنا چاہیں تو معاف نہ کریں۔ بعض مواقع پر حکومتیں قومی خوشی کے طور پر جشن مناتی ہیں۔ ایسے مواقع پر یا اس سے ملتی جلتی بعض اور وجوہات کی بنا پر وہ بلا تفریق و امتیاز مجرموں کے لئے عام معافی کا اعلان کیا کرتی ہیں۔ ایسا خصوصی حالات کی وجہ سے کیا جاتا ہے لیکن ایسے خصوصی حالات خود اپنی ذات میں اس امر کا جواز مہیا نہیں کرتے کہ ان لوگوں سے جو بے گناہ شہریوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچاتے اور دائمی مصائب میں مبتلا کرنے کا موجب بنتے ہیں ان سے باز پرس نہ کی جائے اور انہیں معاف کر دیا جایا کرے۔ یہ بات فراموش یا نظر انداز کرنے والی نہیں ہے کہ بعض مخصوص حالات میں حکومتوں کا بلا تفریق و امتیاز سب مجرموں کے لئے معافی کا اعلان کرنا کسی نہ کسی معیار کی رو سے جائز قرار پاتا ہے۔ خود مسیحی علما حکومتوں کے ایسے اعلانوں کو انصاف کے تقاضوں کے منافی نہیں سمجھتے تو پھر ایسا ہی حسن ظن وہ خدا کے متعلق روا رکھنے کے کیوں قائل نہیں ہیں۔ اور اس کے اس اختیار کو کیوں تسلیم نہیں کرتے کہ اگر وہ چاہے تو خطا کاروں کو معاف بھی کر سکتا ہے۔ بہر حال وہ تو سب حاکموں سے بڑا حاکم اور ہر شئے کا خالق و مالک ہے۔ اگر وہ کسی کا ایسا جرم معاف کر دیتا ہے جو اس نے اپنے ساتھیوں کے خلاف کیا ہو تو اس آقاؤں کے آقا اور سب مالکوں کے مالک کو یہ غیر محدود قوت و قدرت بھی حاصل ہے کہ جنہیں دکھ دیا گیا ہے ان کے ساتھ ایسے جود و سخا کا سلوک کرے اور ایسے رنگ میں انہیں اپنے فضلوں سے نوازے کہ اس کے فیصلہ سے وہ بھی پوری طرح مطمئن ہو جائیں۔ اندریں حالات اس امر کی کہاں ضرورت باقی رہتی ہے کہ وہ اپنے معصوم "بیٹے" کو قربان

کرے۔ یہ توبذات خود انصاف کا مذاق اڑانے والی بات ہے۔ ہم خدائی صفات کے پر تو کے زیر اثر انہی کی ہم رنگ یا ملتی جلتی صفات کے ساتھ پیدا کئے گئے ہیں۔ خود مسیحیوں کے عقیدہ کی رو سے بھی خدا نے یہی بتایا ہے اور بائبل میں اس امر کا ہی اعلان کیا ہے۔ چنانچہ بائبل میں آتا ہے:

”پھر خدا نے کہا ہم انسان کو اپنی صورت پر اپنی شبیہ کی مانند بنائیں گے“

(پیدائش باب اول آیت 26)

اور اسی تعلق میں خدا تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا

(الروم:31)

تو اللہ کی پیدا کی ہوئی فطرت کو اختیار کر۔(وہ فطرت) جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔

یہ عقیدہ جو عیسائیوں اور مسلمانوں میں مشترک ہے بتاتا ہے کہ انسانی ضمیر کسی بھی موقع پر خدائی فعل کو اپنے اندر منعکس کرنے والا بہترین آئینہ ہے۔ یہ ہمارے روز مرہ کے تجربہ کا ایک حصہ ہے کہ بہت دفعہ ہم انصاف کے تقاضے میں خفیف سا رخنہ ڈالے بغیر قصور واروں کو معاف کر دیا کرتے ہیں۔ اگر ذاتی طور پر ہمیں دکھ پہنچایا گیا ہے تو ایسے جرم میں جو ہمارے خلاف روا رکھا گیا ہے ہم معاف کرنے میں جتنا چاہیں آگے بڑھ سکتے ہیں اور اپنے معاف کرنے کے جذبہ کو اونچے سے اونچے معیار تک لے جاسکتے ہیں۔ اگر کوئی بچہ اپنے ماں باپ کی نافرمانی کر کے یا گھر کی بعض قیمتی چیزیں خراب کر کے یا اپنی بعض حرکتوں سے ان کے لئے بدنامی کا موجب بن کر انہیں دکھ پہنچاتا ہے تو وہ ان کی نگاہ میں خطاکار اور ان کا قصوروار ہوتا ہے۔ اس کے والدین چاہیں تو وہ اسے معاف کر سکتے ہیں۔ اور جب وہ معاف کر دیتے ہیں تو ایسا کرنے میں وہ اپنے ضمیر میں کوئی کھٹک محسوس نہیں کرتے اور نہ ان کا ضمیر انہیں ملامت کرتا ہے کہ انہوں نے کسی لحاظ سے بھی انصاف کے تقاضے کی خلاف ورزی کی ہے۔ برخلاف اس کے اگر ان کا بچہ کسی ایسی چیز کو توڑ پھوڑ کر تباہ کر دیتا ہے جو ان کے پڑوسی کی ملکیت ہے یا وہ کسی اور شخص کے بچہ کو زخمی کر دیتا ہے تو وہ اپنے بیٹے کے اس فعل کو جس کی رو سے وہ دوسروں کو دکھ پہنچانے کا موجب ہوا ہے خود کیسے معاف کر سکتے ہیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو ان کا ضمیر خود ان کے اس فعل کو ناانصافی قرار دے گا۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ جرم اور سزا کے درمیان پائے جانے والے تعلق یا رشتہ کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔ ان دونوں کے درمیان پائے جانے والے تعلق کی نوعیت علت اور معلول کے باہمی تعلق کے عین

مطابق ہوتی ہے۔ ضروری ہوتا ہے کہ دونوں کے مابین کسی نہ کسی حد تک توازن و تناسب موجود ہو۔ جرم اور سزا میں توازن و تناسب کے پہلو کو ہم قبل ازیں بھی خاصی تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ اگرچہ ہم نے مالی قرضوں سے متعلق کی جانے والی بے ضابطگیوں کے ضمن میں اس پہلو پر روشنی ڈالی تھی لیکن تناسب و توازن کی دلیل ایک ایسی محکم دلیل ہے جو دوسرے جرائم مثلاً بے گناہ شہریوں کو زخمی یا اپاہج کرنا یا انہیں قتل کرنا یا کسی لحاظ سے بھی انہیں بے عزت کرنا وغیرہ جرائم پر اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ اطلاق پاتی ہے۔ جرم جتنا زیادہ شدید نوعیت کا ہوگا متوقع سزا کی نوعیت اور شدت بھی اسی کے مطابق ہوگی۔ جرم و سزا کے ایک پہلو کا تعلق معافی سے بھی ہے۔ میں اس بات پر ایمان رکھتا ہوں کہ خدا اگر چاہے تو انسانوں کو تمام خطائیں معاف کر سکتا ہے۔ اس پہلو سے اگر دیکھا جائے تو ایک بے گناہ اور سراسر معصوم انسان کو سزا دینے کے ذریعہ جملہ بنی نوع انسان کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاہم اگر اس پہلو کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک مجرم کی سزا کو کسی دوسرے معصوم انسان کی طرف منتقل کرنا مقصود ہو اور سزا کے انتقال کے لئے اس امر کو بنیاد بنایا گیا ہو کہ اس معصوم نے رضاکارانہ طور پر اس سزا کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی ہے تو یقیناً ایسی صورت میں انصاف کا تقاضا یہ ہوگا کہ سزا میں تخفیف کیے یا اس میں معمولی سی بھی نرمی پیدا کیے بغیر پوری کی پوری سزا کو اس دوسرے شخص کی طرف منتقل کیا جائے۔ اس بارہ میں بھی ہم پہلے ہی بہت کچھ روشنی ڈال چکے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسیحی حضرات اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ "باپ خدا" نے اپنے "بیٹے" مسیح کے معاملہ میں انصاف کے تقاضے کو بھرپور انداز میں پورا کیا؟۔ اگر پورا کیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیائے عیسائیت کے وہ تمام مجرم جو مسیح کے وقت میں پیدا ہوئے اور وہ تمام مجرم بھی جو بعد کے زمانوں میں پیدا ہوئے اور جو جزا سزا کے دن تک پیدا ہوتے چلے جائیں گے ان سب کو جو سزا ملنی چاہیے تھی اسے مجتمع اور مرتکز کر کے اس میں جہنم کی سی شدّت کو اس درجہ تک پہنچا دیا گیا تھا کہ مسیح کو محض تین دن رات جو اذیّت اٹھانا پڑی اس میں ان تمام سزاؤں کی تعذیب بھی سموئی ہوئی تھی جس کے تمام کے تمام مذکورہ بالا گناہگار سزاوار تھے۔ اگر واقعۃً ایسا ہی ہوا تو پھر کسی عیسائی حکومت کو نہیں چاہیے کہ وہ کسی عیسائی کو کسی بھی جرم کی کوئی سزا دے کیونکہ کفارہ کی ادائیگی کے باوجود سزا دینا انتہائی ناانصافی کے مترادف ہوگا۔ تمام قانونی عدالتوں کو معاملہ کی تہہ تک پہنچنے نیز جرم اور مجرم کی نشاندہی اور تصدیق کرنے کے بعد فیصلہ یہ

دینا چاہیے کہ مجرم کا فرض ہے کہ وہ اپنی نجات اور مخلصی کے لئے "خدا کے بیٹے" یعنی خداوند یسوع مسیح سے دعا کرے۔ اس کے بعد مقدمہ ختم کر کے معاملہ کو وہیں ٹھپ کر دینا چاہیے۔ عدالت گستری کا سارا کام ایک کھاتہ کے مندرجات کو دوسرے کھاتہ میں منتقل کرنے تک محدود قرار دینا چاہیے۔ اس لحاظ سے مجرم کے کھاتے میں سے اس کی سزا کا حساب کتاب مسیح کے کھاتے میں منتقل ہو جائے گا۔

آیئے ہم بات واضح کرنے کی خاطر اپنی توجہ کو کچھ وقت کے لئے ریاست متحدہ امریکہ پر مرکوز کریں۔ وہاں جرائم کی جو صورت حال ہے اسے ذرا ذہن میں لائیں۔ راہ گیروں کو زدوکوب کرنے انہیں لوٹنے اور قتل کرنے واقعات اس درجہ عام ہیں کہ روزانہ ہی اس کثرت سے رونما ہو رہے ہوتے ہیں کہ انہیں شمار کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ میں نے نیویارک میں ریڈیو کا بٹن گھمایا، سوئی ایک ایسے سٹیشن پر جا ٹکی جو لوٹ مار اور قتل و غارت گری کے واقعات نشر کرنے کے لئے وقف تھا۔ ان نشریات کو سننا انتہائی دہشت ناک تجربہ سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اچانک پیش آنے والا یہ تجربہ اتنا دردناک اور تکلیف دہ تھا کہ میں اسے آدھ گھنٹہ سے زیادہ برداشت نہ کر سکا۔ اس کے بعد مزید کچھ سننا میرے لئے ممکن نہ تھا۔ امریکہ میں قریباً ہر پانچ منٹ کے بعد ایک قتل ہو رہا تھا۔ اور پے در پے ہونے والے قتل کے ان واقعات کی خبریں مسلسل نشر ہو رہی تھیں۔ بعض رپورٹر تو جو قتل کے واقعات کو خود مشاہدہ کر رہے ہوتے تھے بہت ہی دہشت ناک رپورٹنگ کر رہے ہوتے تھے۔ ہمارا یہ ارادہ نہیں ہے کہ ہم امریکہ میں کیے جانے والے جرائم کا منظر کشی کے رنگ میں تفصیلی نقشہ یہاں پیش کریں۔ کون نہیں جانتا کہ جو ممالک جرائم کی بھرمار کے لئے مشہور ہیں امریکہ ان میں سرفہرست ہے۔ خاص طور پر بڑے شہروں جیسے شکاگو، نیویارک، واشنگٹن وغیرہ میں جرائم کی کوئی انتہا نہیں۔ ان میں سے بالخصوص نیویارک میں راہ گیروں کو زدوکوب کر کے لوٹنے کے واقعات بہت ہی عام ہیں۔ جو بے گناہ شہری لٹیروں کا مقابلہ کرنے کی جرأت کرتے ہیں ان کے ہاتھ پاؤں توڑ کر انہیں اپاہج کر دینے کے واقعات کی بھی کمی نہیں۔ روزمرہ کے واقعات پر یکجائی نظر ڈالی جائے تو معمولی فائدہ کی خاطر انسانوں کے اعضا کاٹ پھینکنے اور بے گناہوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتار دینے کی بہت مکروہ اور گھناؤنی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔

آج کل کی دنیا میں جرائم کے بڑھتے ہوئے رجحان سے صرف نظر کرتے ہوئے اکیلے امریکہ میں ہی جرائم کی صورت حال کی وجہ سے انسان حیران و پریشان اور ششدر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ یہ پریشانی اور

حیرانی لاحق ہوتی ہے اس تعلق کی بنا پر جو ایک طرف ”گناہ اور کفارہ“ کے مسیحی تصور نیز دوسری طرف روزانہ بکثرت سرزد ہونے والے گناہوں کے مابین پایا جاتا ہے۔ اہل امریکہ عملی طور پر مسیحی اقدار سے کتنے ہی دور کیوں نہ ہو چکے ہوں یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ وہ تمام تر گناہوں میں ملوث ہونے کے باوجود ”گناہ اور کفارہ“ کے مسیحی عقیدہ پر زبانی کلامی ہی سہی ایمان ضرور رکھتے ہیں۔ اور اب بھی عقیدہ ان کا یہی ہے کہ مسیح ان کا نجات دہندہ ہے۔ لیکن افسوس صد افسوس! یہ اور ان کے دوسرے عقائد ان کے کسی کام نہ آسکے۔ امریکہ میں جرائم کا بے محابہ ارتکاب کرنے والوں کی اکثریت ایسے ہی نام نہاد عیسائیوں پر مشتمل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمان اور دوسرے لوگ بھی جرائم سے یکسر مبرا نہیں ہیں لیکن ان کا معاملہ دوسرا ہے کیونکہ وہ کفارہ پر ایمان ہی نہیں رکھتے۔ سوال یہ ہے کہ ایسے مجرم جو مسیحی ہیں اور مسیح کی رضاکارانہ قربانی پر ایمان رکھتے ہیں کیا ان سب کو خدا کی طرف سے معافی مل جائے گی؟ اگر مل جائے گی تو ملے گی کس طرح؟ ظاہر ہے مسیحی مجرموں میں سے ایک بڑی تعداد ایسے مجرموں کی ہو گی جو انجام کار اسی دنیا میں پکڑے جائیں گے اور ملکی قانون کے تحت سزا پا کر کیفر کردار کو پہنچ جائیں گے۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہوں گے جو اس دنیا میں قانون کی گرفت میں آنے سے بچ جائیں گے یا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ سالہا سال تک وہ جو گناہ کرتے رہے تھے انہیں ان میں سے صرف بعض گناہوں کی سزا مل جائے اور باقی گناہوں کی سزا سے وہ بچ رہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسیح کی رضاکارانہ قربانی کے باوجود کلی یا جزوی سزا تو انہیں اسی دنیا میں مل گئی۔ حل طلب بات یہ ہے کہ جو مسیحی مجرم ملکی قانون کے تحت سزا پا لیتے ہیں مسیحیت ان کے لئے موعودہ معافی کی تلافی کس طرح کرے گی؟ نیز جو مجرم اسی دنیا میں قانون کی گرفت میں آنے سے بچ جاتے ہیں مسیحیت انہیں مزید معافی کے کس وعدے سے نوازے گی؟

اس تعلق میں ایک معمہ اور بھی سامنے آتا ہے اور وہ معمہ ایک غیر متعین، غیر واضح اور مبہم صورت حال کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ صورت حال یہ ہے کہ مثال کے طور پر ایک مسیحی شخص ایک بے قصور غیر مسیحی کے خلاف جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسیحی اعتقاد کی رو سے اس مسیحی مجرم کو تو مسیح پر ایمان رکھنے کے انعام کے طور پر معاف کر دیا جائے گا اور اس کی سزا مسیح کے کھاتہ میں منتقل ہو کر وہاں محسوب ہو جائے گی لیکن اس بے چارے غیر مسیحی مظلوم کے نفع و نقصان کی صورت کیا بنے گی؟ اگر دیکھا جائے تو بیچارا مسیح خود اور ظلم کا شکار ہونے والا وہ بے چارہ غیر مسیحی دونوں ہی گھاٹے میں رہیں گے۔

دونوں ہی کو ایسے جرم کی سزا بھگتنا پڑے گی جو انہوں نے کیا ہی نہیں۔

اگر ہم ان تمام مختلف النوع گناہوں کی کثرت کو تصور میں لانے کی کوشش کریں جو مسیحیت کے آغاز سے لے کر کرّۂ ارضی پر حیات انسانی کے انجام و اختتام تک کے زمانہ میں بنی نوع انسان سے آج تک سرزد ہوئے ہیں اور آئندہ سرزد ہوتے چلے جائیں گے تو بے انداز و بے حساب گناہوں کے غیر مختتم سلسلہ ہائے دراز کی ناپید اکنار کیفیت سے انسانی دماغ چکرا کر رہ جاتا ہے۔ کیا گناہوں کے یہ تمام طول وطویل سلسلے مسیح کے کھاتہ میں منتقل کر اس بے چارے کے نام محسوب کر دیئے گئے ہیں؟ کیا گناہوں کے یہ سب انبار کوزہ میں دریا کی طرح ان تین دن اور تین راتوں میں مرکوز و مرتکز کر دیئے گئے تھے جنہیں عیسائیوں کے اعتقاد کے بموجب مسیح نے اذیّتیں برداشت کرنے میں گزارا؟ انسانی دماغ یہ سوچ سوچ کر ورطۂ حیرت میں پڑے بغیر نہیں رہتا کہ گناہگاروں کا ناپید اکنار سمندر جو گناہوں کے مہلک اثر سے زہر ہلاہل میں تبدیل ہو چکا ہے کس طرح ان گناہگاروں کے مسیح پر ایمان لانے سے ایکا ایکی ٹھنڈے اور میٹھے آب زلال میں تبدیل ہو جائے گا؟ ایک دفعہ پھر انسانی تصور ماضی بعید کے دور دراز زمانہ کی طرف لوٹ جاتا ہے جو بے چارے آدم و حوا سے انجانے میں پہلا گناہ سرزد ہوا اور ہوا بھی اس لئے کہ شیطان نے بڑی ہوشیاری اور عیاری سے انہیں دھوکا دے کر اپنے جال میں پھنسالیا۔ سوچنے والی بات ہے ان بے چاروں کا گناہ کیوں نہ دُھل سکا؟ کیا وہ خدا کی ہستی اور اس کی قدرتوں پر ایمان نہیں رکھتے تھے؟ کیا "باپ خدا" پر ایمان لانا ایک کمتر درجہ کی نیکی تھی؟ کیا ان کا ایمان باللہ گناہ کے اثر کو زائل کرنے کے لئے کافی تھا؟ اور کیا یہ بھی ان کا قصور شمار ہو گا کہ انہیں کبھی بتایا ہی نہیں گیا کہ خدا کا ایک بیٹا بھی ہے جو اپنے "باپ خدا" کے ساتھ ازل سے قائم و دائم چلا آرہا ہے؟ اس "آسمانی مقدس بیٹے" نے ان پر کیوں رحم نہ کھایا اور "باپ خدا" سے کیوں التجا نہ کی کہ ان کے گناہ کی پاداش کے طور پر خود اسے یعنی "بیٹے" کو سزا دے کر انصاف کا تقاضا پورا کر لیا جائے؟ انسانی دماغ میں رہ رہ کر یہ خیال اٹھتا ہے کہ اے کاش! ایسا ہی ہوا ہوتا۔ یہ کتنا مبنی بر انصاف، آسان اور سہل ہوتا کہ جب آدم اور حوا نے پہلی لغزش کھائی تھی انہیں اسی لمحہ سزا دے کر بات قصۂ زمین بر سرِ زمین کے طور پر وہیں کے وہیں ختم کر دی جاتی۔ یقیناً ایسی صورت میں خود مسیحیوں کے نزدیک بھی کتاب التقدیر میں نوع انسان کی کہانی بالکل اور انداز سے لکھی جاتی۔ اس کی بجائے ایک جنت ارضی کی تخلیق عمل میں آتی اور آدم و حوا کی اپنی نامعلوم نسلوں سمیت جنت سے ہمیشہ ہمیش کے لئے نکالا نہ ملتا۔ اسی زمانہ قدیم میں آدم و حوا کے

پہلے گناہ کی پاداش کے طور پر مسیح کو تین دن اور تین رات کے لئے جنت سے نکال دیا جاتا اور اسی دم بات آئی گئی ہو کر قصہ تمام ہو جاتا۔ افسوس! نہ "باپ خدا" کو اس بات کا خیال آیا اور نہ "باپ خدا" کے "بیٹے" مسیح کو یہ بات سوجھی۔ سوچنے کا مقام ہے کہ مسیح کی مقدس اور محبت انگیز حقیقت کو بدقسمتی سے کیسے مضحکہ خیز اور سراسر ناقابل یقین دیومالائی قصہ کا روپ دے دیا گیا اور آنے والی نسلیں بھول بھلیوں میں الجھ کر رہ گئیں۔

عدل اور معاف کر دینے کی صفت

جزا سزا کی مسیحی فلاسفی ہر قسم کے تعصبات سے پاک یعنی صاف و شفاف انسانی ذہن کے لئے نہ صرف الجھاؤ اور پریشانی کا موجب ہے بلکہ اس کی وجہ سے بعض ایسے متعلق سوال بھی سامنے آتے ہیں جو خود اپنی جگہ ذہن کو کچھ کم گنجلک میں مبتلا نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر کفارہ کی مسیحی فلاسفی کو ہی لے لیں اس کے نتیجہ میں عدل اور معافی کے باہمی تعلق کے ذریعہ یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ خدا خود انسانوں کے گناہوں کو کیوں معاف نہیں کر سکتا۔ اس فلاسفی کا سارا استدلال عدل کے یکسر غلط اور یک طرفہ تصور پر مبنی ہے۔ اس کی رو سے طے شدہ حقیقت کے طور پر تسلیم یہ کر لیا گیا ہے کہ عدل اور معافی کا باہم یکجا اور اکٹھا ہونا ممکن نہیں ہے۔ انہیں بلاوجہ ایک دوسرے کی ضد قرار دے دیا گیا ہے۔ اگر یہ واقعی ایک دوسرے سے یکسر مختلف اور باہم متناقض ہیں تو پھر عہد نامہ جدید میں انسانی رشتوں اور تعلق داری کا ذکر کرتے ہوئے باہم معاف کر دینے اور درگزر سے کام لینے پر بہت زور کیوں دیا گیا ہے۔ میں نے کسی بھی مذہب کے مقدس آسمانی صحیفوں میں ایسی تعلیم نہیں دیکھی جس میں معاف کر دینے کی صفت کی اہمیت پر یکطرفہ اور غیر متوازن انداز میں اس درجہ زور دیا گیا ہو جتنا کہ عہد نامہ جدید میں دیا گیا ہے۔ کس قدر اختلاف اور تضاد ہے انجیل کی اس تعلیم اور انصاف کی اہمیت سے متعلق یہودیت کی پرزور روایتی تعلیم میں۔ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت کی تعلیم ایسے سادہ اور کھردرے انصاف کی آئینہ دار ہے جو ضروری تراش خراش اور تہذیب و تصویب سے مبرا ہے۔ اس کے بالمقابل کیسی ڈرامائی تبدیلی کی آئینہ دار ہے یہ مسیحی تعلیم کہ اگر کوئی شخص تیرے ایک گال پر تھپڑ رسید کرے تو تو دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دے۔ یہ بعد میں عطا ہونے والی تعلیم کس نے دی جو قبل ازیں دی گئی توریت کی تعلیم کے بالکل برخلاف ہے؟۔ انسان سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ کیا توریت والی پہلی تعلیم واقعی "باپ خدا" کی عطا کردہ تعلیم تھی۔ اگر واقعی توریت کی

تعلیم خدا ہی کی عطا کردہ تھی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ "مقدس بیٹے" نے باپ کی دی ہوئی تعلیم سے غایت درجہ مختلف و متضاد روش کیوں اختیار کی؟ کیا ایسے مخاصمانہ اختلاف کو توارثی نقص سمجھا جائے یا یہ کہ اسے ارتقائی تبدیلی سے تعبیر کیا جائے یا پھر یہ کہ مکمل معافی اور درگزر کے مسیحی رجحان کو (جو انتقام پر یہودیت کے حتمی اصرار سے یکسر متضاد ہے) "باپ خدا" کی روش اور طرز عمل میں بنیادی تبدیلی پر محمول کیا جائے؟ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس نے (یعنی "باپ خدا" نے) موسیٰ کو اور اس کے ذریعہ اہل کتاب کو جو تعلیم دی تھی اس پر وہ دل سے متاسف تھا اور اپنی غلطی کی بہر طور تلافی کرنا چاہتا تھا اسی لئے "بیٹے" نے اس سے یکسر مختلف و متضاد تعلیم دے کر تلافی کی صورت پیدا کی۔

یہودیت اور مسیحیت کی تعلیم میں سزا کی نوعیت پر زور دینے سے متعلق متذکرہ بالا تبدیلی اور اختلاف میں ہم مسلمانوں کو کوئی تضاد اس لئے محسوس نہیں ہوتا کہ ہم ایسے خدا پر ایمان رکھتے ہیں کہ جس کے وجود میں عدل اور مغفرت (یعنی بخشش و معافی) کی ہر دو صفات پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہیں اور یہ دونوں صفات باطنی طور پر باہم کسی لحاظ سے بھی متصادم نہیں ہیں۔ ہمارے ایمان و ایقان اور تفہیم و ادراک کی رو سے یہودی تعلیم اور مسیحی تعلیم میں پائے جانے والے فرق کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہودی تعلیم ناقص تھی اور مسیح نے آکر اس نقص کو دور کیا بلکہ نقص اس تعلیم پر یہودیوں کے عمل پیرا ہونے کے طریق میں تھا۔ ہم اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ خدا صرف عادل و منصف ہی نہیں ہے بلکہ وہ غفور و رحیم اور رؤف و محسن بھی ہے یعنی وہ اپنے بندوں کو اگر چاہے تو معاف کر کے انہیں اپنے رحم کا مورد بھی بناتا ہے اور ان کے ساتھ حسن و احسان کا سلوک بھی کرتا ہے۔ گناہوں کو بخشنے اور گناہگاروں کو اپنی بخشش سے نوازنے کے لئے وہ کسی بھی نوعیت کی بیرونی مدد کی احتیاج سے پاک ہے۔ برخلاف اس کے اگر مسیحی نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیا جائے تو مسئلہ پیچ در پیچ کی شکل اختیار کر کے الجھتا ہی چلا جاتا ہے۔ نظر یہ آتا ہے کہ توریت کے خدا کو صرف عدل سے ہی سروکار تھا اور وہ اس احساس سے عاری تھا کہ ترس کھانا اور رحم کا سلوک کرنا بھی کوئی صفت ہوتی ہے۔ بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ کسی پر رحم کرنا بھی چاہتا تو ایسا کر نہیں سکتا تھا کیونکہ ترس کھانا اور رحم کرنا اس کے بس میں ہی نہ تھا۔ آخر زمانۂ دراز اور مدت مدید کے بعد عجیب ماجرا ہوا۔ ہوا یہ کہ اس کا "بیٹا" جو خود اپنی ذات میں خدا تھا اس کی مدد کو آیا۔ جس جہنم آسا مشکل اور الجھن میں "باپ خدا" پھنسا ہوا تھا اس میں سے "بیٹے خدا" نے اسے نکالا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اپنے منتقم "باپ" کے مقابلہ میں "بیٹا" سراسر ترس اور ترحم کے جذبہ سے بھرا ہوا تھا۔ "بیٹے" کے متعلق اس تصور کی نامعقولیت

انسانی ضمیر میں صرف خلش ہی پیدا نہیں کرتی بلکہ ''باپ'' اور ''بیٹے'' کے کردار میں پائے جانے والے تضاد کے سوال کو ابھار کر ایک دفعہ پھر اسے بڑی شدت سے نمایاں کر دیتی ہے اور محسوس یہ ہوتا ہے کہ مسیح ''باپ خدا'' کا صحیح نقش نہ ہونے کی وجہ سے اس کا ناخلف بیٹا ہے۔ شاید یہ بھی توارثی غلطی کا ہی ایک شاخسانہ ہو!۔

اس بارہ میں تحقیق کا ایک اور میدان بھی ہے۔ اس کا تعلق اس امر سے ہے کہ گناہ اور اس کے نتائج و عواقب کے بارہ میں دنیا کے دوسرے مذاہب کا نقطۂ نظر اور رویہ کیا ہے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ صرف مسیحیت ہی ایسا مذہب نہیں ہے جو انسانوں کو من جانب اللہ عطا ہوا ہو۔ دنیا میں بلحاظ تعداد غیر مسیحی اقوام و افراد مسیحیوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ معلومہ تاریخ کے ہزاروں سال کے دوران یسوع مسیح کی آمد سے قبل و قتاً بعد وقتٍ متعدد مذاہب رونما ہوئے۔ ان مذاہب نے دنیا کے مختلف علاقوں میں آباد انسانوں میں جڑ پکڑی اور نشوونما پائی۔ دیکھنے والی بات یہ ہے کہ کیا ان مذاہب نے بھی کبھی گناہوں کی بخشش یا معافی کی ایسی فلاسفی کو اپنایا یا اس کا ذکر کیا جس کا کفارہ کے مسیحی عقیدہ سے دور کا بھی کوئی تعلق بنتا ہو۔ خدا کے متعلق یا اگر وہ کئی خداؤں کی موجودگی پر یقین رکھتے تھے تو اپنے ان مزعومہ خداؤں کے متعلق ان کا کیا نظریہ یا تصور تھا۔ مراد یہ کہ ان کے نظریہ کے مطابق گناہوں میں ملوث نوع انسانی کے بارہ میں خدا یا ان کے مزعومہ خداؤں کا طرزِ عمل یا سلوک کس نوعیت کا تھا؟

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے مذاہب عالم کی برادری میں جو مذہب نظریاتی لحاظ سے مروّجہ مسیحیت کے قریب ترین نظر آتا ہے وہ شاید ہندومت ہے لیکن اس کی یہ قربت بھی محض جزوی ثابت ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ ہندو بھی ایک کٹر اور ضدی قسم کے عادل خدا کو مانتے ہیں۔ اس کا جذبۂ عدل یہ تقاضا کرتا ہے کہ جو فرد بھی گناہ کا مرتکب ہو اسے وہ کسی نہ کسی شکل میں کوئی نہ کوئی سزا ضرور دے لیکن مسیحیت اور ہندومنت کے مابین پائی جانے والی یہ نظریاتی مماثلت آگے نہیں چلتی بلکہ یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندومت میں اس امر کا دور دور کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا کہ خدا کے بیٹے نے نسل انسانی کے تمام گناہگاروں کے گناہوں کے جملہ اثرات اور سزاؤں کا سارے کا سارا بار اپنے کندھوں پر اٹھا لیا ہو۔ برخلاف اس کے ہندومت میں بتایا یہ جاتا ہے کہ گناہوں کے ارتکاب کے سبب سنسار میں جرم و سزا کا ایک لامتناہی اور ناپید اکنار سلسلہ جاری و ساری ہے۔ اس کے نتیجہ میں انسانی روحیں مختلف جانوروں اور حشرات الارض کے روپ میں جونیں بدلتی چلی آ رہی ہیں۔ کفارہ تک رسائی صرف اس وقت ہوتی ہے جب بار بار جُونیں

بدلنے کے بعد روح اتنی سزا بھگت لیتی ہے جو ان تمام گناہوں کے مجموعہ کے عین مطابق ہوتی ہے جو جونوں کی مسلسل تبدیلیوں کے تباہ کن تجربہ کے دوران اس سے سرزد ہوئے ہوتے ہیں۔ یقیناً بہت سے لوگوں کو جرم و سزا کی یہ عجیب و غریب فلاسفی بھی یکسر ناقابل فہم پر اسراری کے باوجود اس انوکھی فلاسفی میں جبلّی انصاف کی جھلک ضرور موجود ہے۔ اس میں ایسے توازن اور یکسانیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے جو کھڑے جبلّی انصاف کے تصور سے پوری پوری مطابقت رکھتی ہے۔

ہندومت ہی نہیں بعض دوسرے مذاہب بھی علت و معلول کی تمام تر پیچیدگیوں کے باوصف مختلف جونیوں کی شکل میں بار بار پیدائش کے لامتناہی سلسلہ کے قائل ہیں۔ ان مذاہب سے صرف نظر کرتے ہوئے اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا کے تمام دوسرے چھوٹے بڑے مذاہب کے نزدیک انسانوں کی طرف سے ارتکاب معاصی کی صورت میں من جانب اللہ بخشش یا معافی کے تصور کا کیا عمل دخل ہے۔ ہندومت اور اس کی طرح کے دوسرے مذاہب سمیت دیگر چھوٹے بڑے مذاہب کے ایک ارب سے زیادہ پیرو دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ وہ سب کفارہ کے دیومالائی مسیحی تصور سے یکسر ناآشنا ہیں۔ ان کے ہاں اس کا کوئی نام و نشان نہیں ہے۔ یہ صورت حال انسانی ذہن کو بہت خلجان میں مبتلا کرنے والی ہے۔ اندریں صورت اس سوال کا پیدا ہونا ناگزیر ہے کہ دنیائے عیسائیت کے ماسوا دنیا کے دیگر علاقوں میں جو لوگ آباد چلے آرہے تھے ان کے اور عالم بالا کے مابین رابطہ کی نوعیت کیا تھی؟ اگر مسیحی عقیدہ کے بموجب "باپ خدا" سے ان کا تعلق نہیں تھا تو کیا یسوع مسیح کے سوا دنیا کی ساری مذہبی قیادت شیطان کی شاگردی کے جال میں پھنسی ہوئی تھی؟ "باپ خدا" کہاں تھا اور کیا کر رہا تھا؟ جب بقیہ نوع انسانی کو شیطان اس کے نام پر گمراہ کرنے میں مصروف تھا تو وہ بنی نوع انسان کو اس کے دام تزویر سے نجات دلانے کی غرض سے ان کی مدد کو کیوں نہ آیا؟ کیا ماسوا مسیحیوں کے قبل ازیں تمام دیگر بنی نوع انسان نام نہاد "باپ خدا" کے علاوہ کسی اور ہستی کے پیدا کردہ تھے؟ سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ سوتیلے باپ والا سلوک روا رکھ کر انہیں طاغوت کے ظالمانہ اقتدار کے حوالے کیوں کیا گیا؟۔

آیئے اب ہم اپنی توجہ کو ایک اور نقطۂ نگاہ سے اس مسئلہ کی طرف پھیرتے ہیں اور نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ ہم عام انسانی تجربہ کی روشنی میں اس مسئلہ کا از سر نو جائزہ لینے کی کوشش کریں۔ اب یہ تجربہ اور مشاہدہ میں آنے والی ایک عام بات ہے کہ معافی اور عدل باہم متوازن بھی ہو سکتے ہیں اور یہ کہ ان کا ایک ساتھ بروئے کار

آنا عین ممکن ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ ہی باہم ضد کے طور پر ایک دوسرے کی تردید کرتے نظر آئیں۔ بعض اوقات خود عدل کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ معاف کر دینا ضروری ہے اور برخلاف اس کے بعض حالتوں میں خود عدل اس امر کا متقاضی ہوتا ہے کہ معافی نہ دی جائے۔ اگر ایک بچہ کے ساتھ ہمیشہ ہی معافی کا سلوک روا رکھا جائے اور اس طرح مزید جرائم کے مرتکب ہونے میں اس کی حوصلہ افزائی ہوتی رہے تو ایسی صورت میں معافی خود اپنی ذات میں جرائم کی افزائش اور حاشیہ آرائی کا موجب ہو گی۔ ظاہر ہے ایسا کرنا عدل کی روح کے سراسر منافی ہو گا۔ اگر ایک عادی مجرم کو معاف کر کے اسے مزید جرائم کے ارتکاب کا موقع دیا جائے اور اس طرح معافی کے ذریعہ گردو پیش دکھوں اور مصیبتوں کی افزائش کے سلسلہ میں اس کی حوصلہ افزائی کرنے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا جائے تو ایسا طرزِ عمل تقاضائے عدل کے برخلاف ہوتے ہوئے معصوم شہریوں کے خلاف ایک ظالمانہ اقدام کے مترادف قرار پائے گا۔ اب اگر دیکھا جائے تو اسی قماش کے لاتعداد اور بے شمار مجرم ایسے ہیں جن کے حق میں مسیح کا کفارہ ایک پناہ گاہ ہی نہیں کمین گاہ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ ظاہر ہے یہ ناگوار صورت حال عدل کے سراسر منافی ہے۔ بہر صورت و بہر حال کفارہ پر زور دینا نیز پشیمانی اور معافی کو سرے سے کوئی اہمیت نہ دینا درست نہیں ہے۔ اس کا درست نہ ہونا ایک مثال سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے اور وہ مثال یہ ہے کہ اگر بچہ پشیمان ہو کر اپنے کیے پر افسوس کا اظہار کرتا ہے اور ماں کو یقین ہو جاتا ہے کہ بچہ اس جرم کا دوبارہ ارتکاب نہیں کرے گا اس کے باوجود بچہ کو سزا دینا عدل کی روح کے برخلاف ہو گا۔ جب ایک پشیمان شخص پشیمانی کی اذیت میں سے گزرتا ہے تو ایسی پشیمانی خود اپنی جگہ سزا سے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ بعض حالتوں میں تو ایسی پشیمانی بجائے خود باہر سے عائد کردہ سزا سے کہیں بڑھ کر اذیت ناک بن جاتی ہے۔ جن لوگوں کا ضمیر زندہ ہو اور ان سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو وہ پشیمانی کے زیرِ اثر بہت دکھ محسوس کرتے ہیں۔ وہ اندر ہی اندر کچھ کم اذیت نہیں اٹھاتے۔ بسا اوقات ضمیر کے مسلسل کچوکوں کی اذیت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ قوّتِ برداشت کی آخری حد کو چھونے لگتی ہے۔ ایسی صورت میں عین ممکن ہو جاتا ہے کہ خدا ایسے بار بار قصور کرنے اور بار بار پشیمان ہونے والے کمزور بندہ پر رجوع برحمت ہو اور اس کے گناہ بخش دے۔ عدل اور معافی کے اس باہمی تعلق میں ایک ایسا عام فہم سبق مضمر ہے جسے ایک ہمہ گیر انسانی تجربہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا ادراک کرنا اور اس سے فائدہ اٹھانا اعلیٰ ذہنی صلاحیتیں رکھنے والوں کے لئے ہی نہیں بلکہ عام سمجھ بوجھ والے انسانوں کے لئے

چنداں مشکل نہیں ہے۔ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ مسیحی حضرات اپنے اس عقیدہ کی نامعقولیت پر معترض ہوئے بغیر اس سے چمٹے رہنے کی غفلت سے بیدار ہوں۔ اگر وہ اپنے اس عقیدہ کا عقل عمومی کی روشنی میں از سر نو جائزہ لے کر اس کی نامعقولیت کو محسوس کر لیں گے تو وہ اچھے باعمل عیسائی پھر بھی رہیں گے لیکن وہ ایک مختلف اور حقیقت پسندانہ نوعیت کے عیسائی ہوں گے۔ اندریں صورت وہ اور زیادہ محبت اور گہری وابستگی کے ساتھ مسیح کی انسانی حقیقت پر یقین رکھنے والے ہوں گے بہ نسبت اس خیالی مسیح پر ایمان رکھنے کے جو محض ان کے اپنے تخیل کی پیداوار ہے اور ایک فسانہ سے زیادہ جس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ مسیح کی بڑائی اور عظمت روایتی داستان میں نہیں بلکہ اس عظیم قربانی میں مضمر ہے جو اس نے ایک انسان اور خدا کے ایک پیغمبر کی حیثیت سے پیش کی۔ یہ ایک ایسی قربانی تھی جو دل پر زیادہ قوت اور گہرائی کے ساتھ اثر انداز ہوتی ہے بہ نسبت اس دیومالائی قصہ کے کہ وہ صلیب پر مرنے اور دوزخ میں چند دہشت ناک گھنٹے گزارنے کے بعد مردوں میں سے دوبارہ جی اٹھا تھا۔ فسانہ، فسانہ ہی ہوتا ہے حقیقت کے آگے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

مسیح کے لئے کفارہ ادا کرنا ممکن نہ تھا

آخر میں پیش کیا جانے والا ایک اور سوال بھی کچھ کم اہم نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ مسیح پیدائشی طور پر گناہ سے پاک اور معصوم کیسے ہو سکتا تھا جبکہ وہ پیدا ہی ایک انسان ماں کے بطن سے ہوا؟ اگر آدم اور حوا کے ابتدائی گناہ نے اس بدقسمت جوڑے کی آئندہ آنے والی تمام نسلوں کو موروثی طور پر گناہ سے آلودہ کر دیا تھا تو ایک ناگزیر نتیجہ کے طور پر یہ امر لازم آتا ہے کہ نسل آدم کے تمام بچے کیا ذکور و کیا اناث سب ہی گناہ کے طبعی میلان کا عورتوں میں منتقل ہونے کا امکان اس لئے زیادہ تھا کہ یہ حوا ہی تو تھی جس نے شیطان کے آلۂ کار کی حیثیت سے آدم کو ورغلا کر گناہ میں ملوّث ہونے پر آمادہ کیا تھا۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو ازروئے انصاف ارتکاب گناہ کی ذمہ داری آدم کی بہ نسبت حوا کے کندھوں پر زیادہ عائد ہوتی ہے۔ مسیح کی پیدائش کے معاملہ میں یہ بات ظاہر و باہر ہے کہ وہ اس حوا کی ایک بیٹی کے بطن سے سے پیدا ہوا تھا جو ابتدائے آفرینش میں سرزد ہونے والے گناہ کی زیادہ ذمہ دار تھی۔ اس ضمن میں یہ سوال بڑی شدت سے ابھر کر سامنے آتا ہے کہ آیا مسیح کو انتقال ورثہ کے مخصوص خلیوں (Chromosomes) کے ساتھ کوئی توارثی عنصر (Gene) اپنی انسانی ماں سے پیدائشی طور پر ورثہ میں ملا تھا یا نہیں؟ اگر ملا تھا تو موروثی گناہ کی

ناگزیر آلودگی سے اس کا بچنا ممکن ہی نہ تھا اور اگر اس نے اپنی ماں سے کوئی توراثی عنصر انتقال ورثہ کے مخصوص خلیوں کے ساتھ ورثہ میں پیدائشی طور پر نہیں پایا تھا تو پھر اس کی پیدائش یقیناً ایک معجزانہ پیدائش قرار پائے گی کیونکہ ایک معجزہ ہی ایسے بچہ کو معرض وجود میں لا سکتا تھا جو ماں کے بطن سے پیدا ہونے کے باوجود نہ باپ کی طرف منسوب ہو سکتا تھا اور نہ ماں کی طرف۔ یہ بات پھر بھی فہم سے بالا ہوتے ہوئے مخمصہ کا موجب رہتی ہے کہ موروثی خواص کے حامل خلیے جو نسل در نسل منتقل ہوتے ہوئے حوا کی طرف سے مسیح کو ورثہ میں ملے وہ گناہ کے ناگزیر باطنی میلان سے کیسے مبرا رہے؟ چلیے فرضی طور پر ہم مان لیتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح ایسا وقوع میں آ ہی گیا اور مسیح اس معصومیت کا حامل بن گیا جس کی بنا پر اس میں ان انسانوں کے گناہوں کا بار اٹھانے کی اہلیت پیدا ہوگئی جو اس کی اس معجزانہ حیثیت پر ایمان لے آئیں اور جو ایمان نہ لائیں ان کے گناہوں کا بار خود انہی کی گردن پر رہے۔ اس مفروضہ پر ایک اور مسئلہ اٹھ کھڑا ہوگا۔ پوچھنے والے پوچھ سکتے ہیں کہ ایسی صورت میں آدم اور حوا کی ان نسلوں پر کیا بیتے گی جو بے چاری ظہورِ عیسائیت سے پہلے ہو گزری تھی۔ ظہورِ عیسائیت سے قبل نسلاً بعد نسلٍ کھرب ہا کھرب انسان پیدا ہوتے اور کرۂ ارض کے پانچوں براعظموں میں پھیلتے اور ان کے مختلف حصوں میں آباد ہوتے چلے گئے۔ وہ پیدا ہونے اور اس زمین پر زندہ رہنے کے بعد مرتے اور اس جہان سے گزرتے چلے گئے۔ ان کے لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ کسی طور پر سن یا جان سکتے کہ ان کا اصل نجات دہندہ مسیح ہے کیونکہ وہ نجات دہندہ تو ان کے وقت میں پیدا ہی نہ ہوا تھا۔ اس طرح تو آدم کی پیدائش سے لے کر ظہورِ مسیح تک کے درمیانی زمانہ میں جتنی بھی نسل آدم پیدا ہوئی وہ محروم ازلی ہی قرار پائی اور خُسرانِ مُبین میں مبتلا ہونا ان کا مقدر ٹھہرا۔ ان بے چاروں کا کیا قصور تھا کہ انہیں بخشش یا نجات کا خفیف سے خفیف موقع عطا ہونے کا حق دار نہ سمجھا گیا؟ کیا مسیح کی عطا کردہ نجات ازمنۂ گزشتہ سے نافذ العمل قرار پائے گی؟ اگر یہ درست ہے تو ایسا کیوں اور کیسے ہوگا؟

پھر سوچنے والی بات یہ بھی ہے کہ خود مسیح کے اپنے زمانہ میں یہودیہ (Judea) کے چھوٹے سے علاقہ کے بالمقابل دنیا کے دیگر وسیع و عریض علاقوں میں بھی نسل آدم آباد تھی۔ ان لوگوں نے عیسائیت اور مسیح کا نام بھی نہ سنا تھا، ان سب پر کیا بیتی اور ان کا کیا بنا؟ وہ مسیح کے ابن اللہ ہونے پر ایمان نہ لائے تھے۔ عدمِ علم کی بنا پر ان کے لئے ایمان لانا ممکن ہی نہ تھا۔ کیا وہ سزا کے بغیر ہی نجات پا جائیں گے۔ یا یہ کہ انہیں بھی ان کے گناہوں کی سزا ملے گی اور وہ نجات سے محروم قرار پائیں گے؟ اگر انہیں سزا دیئے بغیر ہی چھوڑ دیا

جائے گا تو کس دلیل کی رو سے ایسا ہو گا؟ اور اگر انہیں ان کے گناہوں کی سزا دی جائے گی تو پھر یہی سوال پیدا ہو گا کہ کس منطق کی رو سے انہیں گرفت اور پکڑ کا سزاوار ٹھہرایا جائے گا؟ انہیں مسیح پر ایمان لانے اور نجات سے ہمکنار ہونے کا موقع ہی کب نصیب ہوا تھا؟ وہ تو یکسر بے بس ولاچار تھے۔ یہ بہر طور کانٹے کی تول پورا اترنے والے حتمی اور باریک در باریک انصاف کی کیسی مسخ شدہ اور مضحکہ خیز تصویر ہے!

مجبوری اور بے دلی کی آئینہ دار قربانی

اب ہم مسیح کو صلیب دیئے جانے کے واقعہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ خود اس واقعہ کی تفصیلات پر غور کرتے ہوئے بھی ہم ایک عقدۂ لاینحل سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ جیسا کہ ہمیں بالاصرار بتایا جاتا ہے یہ مسیح ہی تھا جس نے خود اپنی مرضی سے اپنے آپ کو قربانی کے لئے "باپ خدا" کے حضور پیش کیا۔ اور یہ کہ اسی لئے اسے پوری نوع انسانی کے گناہوں کے کفارہ کے طور پر قربانی کا بکرا بنایا گیا البتہ اس کفارہ سے فیض پانے کے لئے یہ شرط عائد کی گئی کہ لوگ اسے برحق تسلیم کرتے ہوئے اس پر ایمان لائیں۔ لیکن حقیقت الامر کے طور پر ایک بالکل مختلف منظر ہماری آنکھوں کے سامنے ابھرتا ہے۔ ہم دیکھتے یہ ہیں کہ جب مسیح کی خواہش کے پورا ہونے کا وقت قریب آتا ہے اور بالآخر گناہوں میں ملوث بنی نوع انسان کو نئے دن کے چڑھنے والے سورج کی طرح امید کی کرن پھوٹتی محسوس ہوتی ہے تو تاریخ انسانی کے اس اہم موقع پر جب ہم اس توقع کے ساتھ مسیح کی طرف نظر اٹھاتے ہیں کہ بنی نوع انسان کی خاطر قربانی پیش کرنے میں اس کی خوشی و مسرت، روحانی کیف و سرور اور اس کے عالم وارفتگی کا نظارہ کریں تو ہمیں بے حد مایوسی کے عالم میں فریب خوردگی کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ بے صبری اور بے چینی سے اس لمحہ مسرت کا انتظار کرنے والے مسیح کی بجائے ہمارا واسطہ پڑتا ہے ایک رونے، چلانے اور دہائی دینے والے مسیح سے جو اپنے "باپ خدا" سے بصد منت یہ التجا کر رہا ہے کہ اے باپ! موت کے اس کڑوے پیالہ کو مجھ سے ٹال دے۔ بلکہ انجیل سے پتہ لگتا ہے کہ واقعۂ صلیب سے قبل مسیح نے ایک فیصلہ کن اور دوررس نتائج کا حامل طویل دن گزارا اور اس کے بعد آنے والی ایک سیاہ اور اذیت ناک رات جو دردناک انجام پر منتج ہونے والی تھی دعائیں کرتے ہوئے گزاری۔ ایسے کڑے دن کے بعد آنے والی کڑی رات کی بے چین گھڑیوں میں جب مسیح نے اپنے ایک شاگرد کو اونگھتے ہوئے پایا تو اسے بہت ڈانٹا اور برا بھلا کہا۔ اس سارے واقعہ کو بائبل نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"اس وقت مسیح ان (یعنی شاگردوں) کے ساتھ گتسمنی نام ایک جگہ میں آیا اور اپنے شاگردوں سے کہا یہیں بیٹھے رہنا جب تک میں وہاں جا کر دعا کروں اور پطرس اور زبدی کے دونوں بیٹوں کو ساتھ لے کر غمگین اور بے قرار ہونے لگا۔ اس وقت اس نے ان سے کہا میری جان نہایت غمگین ہے یہاں تک کہ مرنے کی نوبت پہنچ گئی ہے۔ تم یہاں ٹھہرو اور میرے ساتھ جاگتے رہو۔ پھر ذرا آگے بڑھا اور منہ کے بل پر گر کر یوں دعا کی کہ اے میرے باپ! اگر ہو سکے تو یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے۔ تو بھی نہ جیسا میں چاہتا ہوں بلکہ جیسا تو چاہتا ہے ویسا ہی ہو۔ پھر شاگردوں کے پاس آکر ان کو سوتے پایا اور پطرس سے کہا کیا تم میرے ساتھ ایک گھڑی بھی نہ جاگ سکے؟ جاگو اور دعا کرو تا کہ آزمائش میں نہ پڑو۔ روح تو مستعد ہے مگر جسم کمزور ہے۔ پھر دوبارہ اس نے جا کر یوں دعا کی کہ اے میرے باپ! اگر یہ میرے پیئے بغیر نہیں ٹل سکتا تو تیری مرضی پوری ہو۔ اور آکر انہیں پھر سوتے پایا کیونکہ ان کی آنکھیں نیند سے بھری تھیں۔ اور ان کو چھوڑ کر پھر چلا گیا اور پھر وہی بات کہہ کر تیسری بار دعا کی۔"[2]

جیسے جیسے یہ عیسائی داستان آگے بڑھتی ہے تو وائے افسوس کہ نہ ہی مسیح اور نہ ہی اس کے حواریوں کی دعائیں خدا اور باپ کے ہاں قبولیت پاتی ہیں اور زبردستی باوجود شدید احتجاج کے آخر کار اس لیے صلیب پر چڑھا دیا جاتا ہے کہ یہ وہی انسان تھا؟ وہی معصومیت کا شہزادہ قربانی کی علامت جس نے رضاکارانہ طور پر بنی نوع انسان کے بوجھ کو اٹھانے کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیا یا پھر یہ کوئی اور انسان تھا؟ آپ کا رویہ صلیب کے وقت اور اس کے دوران ہی آپ کی شخصیت اور آپ کی ذات کے گرد گھڑی گئی کہانی میں شکوک و شبہات پیدا کرتا ہے۔ اب ہم اس تنقیدی جائزے کی طرف لوٹتے ہیں۔

پھر صلیب پر لٹکی ہوئی حالت میں مسیح کی زبان سے غم میں ڈوبی ہوئی جو آخری چیخ (یعنی اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا) نکلی اس کے متعلق کئی سوال ذہن میں ابھرتے ہیں۔ پہلا اور بنیادی سوال تو یہی ہے کہ وہ انتہائی غم ناک اور درد انگیز الفاظ کس نے کہے تھے؟ مراد یہ ہے ان الفاظ کو اپنی زبان سے ادا کرنے والا "انسان مسیح" تھا یا ابن اللہ کی حیثیت سے "خدا مسیح" نے یہ الفاظ کہے تھے؟ سوچنے والی بات یہ ہے کہ کسے چھوڑ دیا گیا؟ کس نے چھوڑا؟ اور چھوڑا تو کیوں چھوڑا؟ اگر یہ الفاظ "انسان مسیح" نے کہے تھے تو پھر ایک طے شدہ امر کے طور پر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ "انسان مسیح" نے بحیثیت انسان اپنی اکیلی اور

[2] (متی باب 26 آیات 36 تا 44)

آزاد شخصیت کو آخری سانس تک بر قرار رکھا اور وہ شخصیت اپنی اکیلی ذات میں ایسی تھی کہ وہ سوچ بھی سکتی تھی اور محسوس بھی کر سکتی تھی۔ جب اس انسانی جسم سے جس میں ابن اللہ کی حیثیت سے خدا سمایا ہوا تھا خدا کی روح نے اپنا رشتہ منقطع کیا تو مرا کون؟ اگر روح کے رخصت ہونے کے بعد یہ انسانی جسم ہی تھا جس پر موت وارد ہوئی تو پھر سوچنا اور غور کرنا چاہیے کہ جب خدا کی روح اس میں دوبارہ واپس آئی تو وہ کون تھا جو مردوں میں سے جی اٹھا؟ ظاہر ہے کہ انسانی جسم ہی دوبارہ زندہ ہوا۔

یہ صورت حال ہمیں باور کراتی ہے کہ صلیب پر خدا کے بیٹے نے دکھ نہیں اٹھایا۔ یہ "انسان مسیح" ہی تھا جو صلیب پر دکھ جھیل رہا تھا اور انتہائی تکلیف کی حالت میں "انسان مسیح" کا مادی جسم ہی بے اختیار پکار اٹھا تھا کہ اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ اس کے بالمقابل ابن اللہ ہونے کی حیثیت سے "خدا مسیح" کمال لاتعلقی اور سرد مہری کا مظاہرہ کرتے ہوئے "انسان مسیح" کی تکلیف اور اذیت کا نظارہ کرتا رہا۔ ایسی صورت میں اس دعویٰ کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے کہ نوع انسانی کے دکھوں کے ازالہ کے لئے "انسان مسیح" نے نہیں بلکہ خدا کے بیٹے نے خود دکھ اٹھایا۔

دوسری امکانی صورت یہ ہے کہ ہم یہ فرض کریں کہ یہ "ابن اللہ مسیح" ہی تھا جو صلیب پر چلا اٹھا تھا جبکہ اس کی ذات میں موجود "انسان مسیح" غالباً نئی زندگی شروع کرنے کی امید میں سب کچھ وقوع پذیر ہوتا دیکھ رہا تھا اور دیکھ بھی رہا تھا اس موہوم توقع اور مذبذب احساس کے زیر اثر کہ "ابن اللہ مسیح" کی قربانی کے ساتھ ساتھ خود اسے (یعنی "انسان مسیح" کو) بھی خواہ وہ اسے پسند کرے یا نہ کرے اپنے باہم دگر ایک ساتھ زندگی بسر کرنے والے معصوم و بے خطا ساتھی کو قربان گاہ پر ذبح کر دیا جائے گا۔ غالباً یہ ایک اور سربستہ راز ہے کہ عدل کا وہ کون سا مفہوم تھا جس نے خدا کو دو پرندوں کا ایک ہی پتھر سے شکار کرنے پر ابھارا؟

اگر یہ سب ماجرا خدا کے بیٹے کے ساتھ گزرا (اور جملہ عیسائی فرقوں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ یہ سب بیتی خدا کے بیٹے پر ہی تھی) تو پھر پہلے سوال کے جواب میں ہی سے دوسرا سوال یہ ابھرتا ہے کہ متی باب 26 آیات 39 تا 42 کی رو سے مسیح صلیب پر ہم کلامی کے وقت کس سے مخاطب تھا؟ اس ضمن میں دو ہی امکانی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ مسیح اس وقت "باپ خدا" سے ہم کلام تھا اور اس سے شکوہ کر رہا تھا کہ عین ضرورت کے وقت میں اسے اکیلا چھوڑ دیا گیا۔ اندریں صورت یہ باور کرنے کے سوا چارہ نہیں کہ باپ اور بیٹا دو علیحدہ علیحدہ وجود تھے جو باہم کسی ایک وجود میں مدغم ہو کر ایک ایسے وجود واحد کے طور پر موجود نہیں ہو سکتے تھے کہ وہ جملہ صفات میں برابر کے شریک ہوں اور ساتھ کے ساتھ ان صفات کو

بروئے کار لانے میں بھی ان کا برابر کا حصہ ہو۔ ان میں سے ایک مختار کل نظر آتا ہے جسے ثالث و حکم کے طور پر آخری اور حتمی فیصلے کرنے اور انہیں عملاً نافذ کرنے کی پوری قدرت حاصل ہے۔ دوسرا بے چارہ ہے تو اس کا بیٹا (یعنی ابن اللہ) لیکن اس غریب کو خواہ عارضی طور پر ہی سہی غلبہ کے آئینہ دار ان تمام قادرانہ اوصاف سے محروم کر دیا گیا ہے جو اس کے باپ کو بلاتوقف حاصل ہیں۔ جس مرکزی نکتہ پر نظر اور توجہ کو بہر طور مرتکز رکھنا ضروری ہے وہ یہ حقیقت ہے کہ "باپ" اور "بیٹے" کی باہم متخالف و متقابل خواہشات اور تمنائیں کسی اور معاملہ میں ایک دوسرے سے اس درجہ متصادم دکھائی نہیں دیتیں جتنی کہ ڈرامۂ صلیب کے آخری سین (اختتامی منظر) میں ان کا باہمی ٹکراؤ اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ دوسری امکانی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مسیح ابن اللہ ہونے کی حیثیت سے خود اپنے آپ سے ہم کلام تھا اور خود کردہ را چہ علاج کے باوجود خود اپنے آپ سے ہی شکوہ سنجی میں مصروف تھا۔ ایسی صورت میں یہ اشکال سامنے آئے بغیر نہیں رہے گا کہ اگر وہ "دو ہونے کے باوجود ایک" (یعنی دو میں ایک) تھے اور ساتھ ہی "ایک ہونے کے باوجود دو" (یعنی ایک میں دو) بھی تھے تو کیا یہ ایک دوسرے سے ممیّز و ممتاز شخصیتیں رکھنے والے وجود اپنے اپنے ذاتی خیالات، ذاتی اقدار اور ذاتی اوصاف رکھتے ہوئے درد بھی محسوس کرتے تھے اور اذیتیں بھی جھیلتے تھے۔ اس کی رو سے ایک اور سوال ماہرین دینیات کے مابین طویل بحث و مباحثہ کا موضوع بنے بغیر نہ رہے گا اور وہ سوال یہ ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ خدا دکھ اٹھائے، درد کی تکلیف برداشت کرے اور سزا بھی بھگتے۔ اور اگر ایسا ممکن ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ صرف نصف خدا یہ سب کچھ بھگتے گا جبکہ دوسرا نصف خدا اپنی وضع فطرت یا اپنی منفرد خاصیت کے زیر اثر ایسا کرنے سے مبرا یعنی بری الذّمہ ہو گا۔ جب ہم اس تہہ در تہہ اور پیچ در پیچ الجھی ہوئی فلاسفی کے گہرے ہوتے ہوئے وسعت پزیر سایوں کی دنیا میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو بچی کھچی روشنی بھی مدھم سے مدھم ہوتی چلی جاتی ہے اور پراگندگی کے انبار پر انبار لگتے چلے جاتے ہیں۔ مزید برآں اس ضمن میں کہ اگر مسیح خود خدا تھا تو وہ صلیب پر ہم کلامی کے وقت کس سے مخاطب تھا ایک اور اشکال کا پیدا ہونا بھی ناگزیر ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمیں بتایا یہ جاتا ہے کہ جب اس نے باپ کو مخاطب کیا تو وہ خدا کا اٹوٹ انگ یا بالفاظ دیگر اس کے وجود کا غیر منفک جزو تھا اور جزو بھی ایسا کہ جس کی بنا پر اسے خود بھی خدا کا درجہ حاصل تھا تو طبعاً سوال یہ پیدا ہو گا کہ وہ کہہ کیا رہا تھا اور کہہ کس سے رہا تھا؟ اس سوال کا جواب محض پہلے سے موجود عقیدہ کا سہارا لئے بغیر عقل و شعور اور فطری طور پر آزاد ضمیر کی روشنی

میں دینا ضروری ہے۔ کوئی نظریہ اعتقاد کا روپ اس وقت دھارتا ہے کہ جب اسے انسانی فہم و ادراک کی گرفت میں لانے والے الفاظ و کلمات اور مرّوجہ اصطلاحات کی رُو سے واضح نہ کیا جاسکے۔ بائبل کے بیان کی رو سے جب مسیح کی روح قفس عنصری سے پرواز کرنے لگی تو مسیح نے "باپ خدا" کو مخاطب کرتے ہوئے باآواز بلند کہا "تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا ہے" یہ معمہ حل طلب ہے کس نے کس کو چھوڑا تھا؟ کیا خدا نے خدا کو چھوڑ دیا تھا؟

قربان کسے کیا گیا؟

اس سارے معاملہ کا ایک اور پہلو جسے ذہن میں لانا اور جس پر توجہ مرتکز رکھنا ضروری ہے یہ ہے کہ مسیح کی دُہری شخصیت میں جو انسان پوشیدہ تھا فی الاصل اسے بھی سزا نہیں دی گئی اور نہ اسے سزا دی جانی چاہیے تھی کیونکہ وہ کسی بھی منطق کی رو سے سزا کا مستحق نہیں بنتا تھا۔ بنتا کیسے جبکہ اس نے جملہ بنی نوع انسان کے گناہوں کا بار اٹھانے پر کبھی آمادگی ظاہر نہ کی تھی۔ ہماری اس بحث میں معاملہ کے اس پہلو نے ابھر کر ہمیں مخصوص نوعیت کی ایک نئی صورت حال سے دوچار کر دیا ہے جس پر ہم نے پہلے غور نہیں کیا۔ جب انسان اس پر غور کرتا ہے تو یہ سوچ کر حیرت میں پڑے بغیر نہیں رہتا کہ مسیح کی شخصیت میں جو انسان پوشیدہ تھا وہ بھی تو آدم اور حوا کی نسل کے تمام دوسرے انسانوں کی طرح گناہ کے موروثی رجحان و میلان کا حامل تھا۔ مسئلۂ زیرِ بحث کے اس پہلو پر غور کرنے والا شخص زیادہ سے زیادہ یہ یقین کرنے کی طرف مائل ہو سکتا ہے کہ "ابن اللہ" کے دُہری شخصیت اختیار کرنے کی وجہ سے ایک ہی جسم میں خدا کا بیٹا اور انسان دونوں سمائے ہوئے تھے۔ ان دونوں میں سے صرف خدا کا بیٹا ہی معصوم تھا۔ لیکن اس ایک ہی مادی جسم کے اندر "ابن اللہ" کے پہلو بہ پہلو جو انسان موجود تھا اس کے متعلق کیا سمجھا اور کیا نظریہ قائم کیا جائے۔ یعنی یہ کہ کیا وہ بھی توارثی اجزا (Genes) اور ان کے نتیجہ میں تشکیل پانے والے کردار کی ہی پیداوار تھا جو براہ راست خدا نے مہیا کیے تھے؟ اگر ایسا ہی تھا تو پھر اسے مسیح کے وجود میں سمویا ہوا ہونے کی حالت میں اُلوہیت کے آئینہ دار طرز عمل اور روش کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔ اگر وہ بار بار فرض ناشناسی اور کمزوری کا مظاہرہ کرتا ہوا نظر آتا ہے تو یہ عذر کہ اس سے فرض ناشناسی اور کمزوری اس لئے سرزد ہوئی کہ وہ ایک انسان تھا قابل قبول نہ ہو گا۔ اگر مسیح کی ذات میں موجود انسان کے اندر الوہیت کا کوئی جزیا اس کی کوئی رمق تک نہ تھی تو پھر ہمیں تسلیم کرنا ہو گا کہ وہ محض ایک عام انسان تھا بلکہ شاید انسان بھی تھا ادھورا۔ تاہم

وہ انسانی شخصیت جو مسیح میں مدغم تھی اس کا اس حد تک انسان ہونا ضروری تھا کہ وہ گناہ کے موروثی میلان کا حصہ دار ٹھہر سکتا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ گناہ کے موروثی میلان کا ورثہ پانے سے بری تھا تو لازماً سوال پیدا ہو گا کہ ایسا کیوں ہوا اور اگر ہوا تو ہوا کیسے؟ یہ امر ظاہر و باہر ہے اور اسے بیان کرنے کی چنداں ضرورت بھی نہیں کہ مسیح کی شخصیت میں موجود انسان اپنے الوہیت کے حامل ساتھی سے یکسر مختلف ہونے کے باعث اپنی آزاد حیثیت میں ضرور گناہ کرتا اور اپنے کردہ گناہ کی تمام تر ذمہ داری خود اپنے انسانی کندھوں پر اٹھاتا۔ یہ تمام روداد یا منظر نامہ مکمل قرار نہیں پائے گا جب تک کہ ہم مسیح ابن اللہ کو اس طور پر پیش نہ کریں کہ وہ نوع انسان کی خاطر مرنے اور جان دینے میں باطنی خلش سے یکسر مبرا نہ تھا۔ اس کو اپنے ادھورے بھائی کی جو اس کی شخصیت میں موجود تھا ضرور فکر لاحق ہوئی ہو گی کہ وہ بے چارہ اس کے ساتھ بلاوجہ دکھ اٹھا رہا ہے۔ اس تمام وقوعہ کو اس کی لاینحل پیچیدگیوں کے باعث عقلی اور ذہنی طور پر ہضم کرنا اگر ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل اور غایت درجہ محال ضرور ہے۔ اس کے بالمقابل ہمارے نقطۂ نگاہ سے فی الحقیقت جو کچھ ظہور میں آیا امر واقعہ کے طور پر اس میں قطعاً کوئی قباحت نہیں۔ اور وہ نقطۂ نظر یہ ہے کہ کسی دوئی یا دہری شخصیت کے مخمصہ میں پھنسے بغیر مسیح بہر حال ایک انسان تھا اور صلیب پر اس معصوم انسان کے منہ سے حیرت اور الم و کرب میں ڈوبی ہوئی جو چیخ نکلی وہ اس وقت کی مخصوص اور پریشان کن صورت حال کا ایک لازمی تقاضا تھی۔

قدرتی طور پر مسیح کو لاحق ہونے والی تشویش

میں ایک دفعہ پھر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ (نعوذ باللہ) میں مسیح علیہ السلام پر ایمان نہیں رکھتا۔ میں یقیناً ان کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان رکھتا ہوں اور خدا تعالیٰ کے مبعوث کردہ ایک پیغمبر کی حیثیت سے ان کا بے حد احترام کرتا ہوں اور ان سے گہری عقیدت رکھتا ہوں اور کیوں نہ رکھوں جبکہ وہ ایک ایسے نبی تھے جنہیں خدا تعالیٰ کی راہ میں غیر معمولی قربانیاں دینا پڑیں۔ میرے ایمان اور اعتقاد کی رو سے مسیح اپنی تمام تر پاک بازی اور تقدس کے باوجود تھے ایک انسان۔ انہیں ابتلا اور آزمائش کے ایک طویل دور میں سے گزرنا پڑا۔ اس وضاحت کے بعد میں جس امر کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ خود انجیل کے بیان کی رو سے واقعۂ صلیب کی جو تفاصیل ہمارے سامنے آتی ہیں اور پھر جس رنگ میں یہ واقعہ اپنے اختتام کو پہنچتا ہے اس تمام صورت حال کے پیش نظر یہ باور کرنے کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ مسیح نے

صلیب پر جان دینے کے لئے اپنے آپ کو رضاکارانہ طور پر پیش نہیں کیا تھا۔ جس روز اس کے دشمنوں نے اسے صلیب دے کر جان سے مار دینے کی کوشش کی ہم دیکھتے ہیں وہ طلوع ہونے سے قبل مسیح نے ساری رات اپنے شاگردوں کے ہمراہ دعا کرنے میں بسر کی۔ وہ رات بھر دعا کرتا رہا اور اس لئے کرتا رہا کہ اس کڑے وقت میں اس کے اپنے دعویٰ مسیحیت کی صداقت کے لوگوں کی نگاہ میں مشتبہ ہونے کا زبردست خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اس لیے کہ عہد نامہ قدیم میں یہ بات درج ہے کہ اگر ایک مفتری خدا کی طرف ایسی باتیں منسوب کرے گا جو خدا نے نہیں کہیں اسے درخت سے ٹانگ دیا جائے گا اور وہ ایک لعنتی موت مرے گا۔ چنانچہ عہد نامہ قدیم کی پانچویں کتاب میں لکھا ہے:

"لیکن جو نبی گستاخ بن کر کوئی ایسی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اس کو حکم نہیں دیا یا اور معبودوں کے نام سے کچھ کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے"۔

(استثناء باب 18، آیت 20)

"اور اگر کسی نے کوئی ایسا گناہ کیا ہو جس سے اس کا قتل واجب ہو اور تو اسے مار کر درخت سے ٹانگ دے تو اس کی لاش رات بھر درخت پر لٹکی نہ رہے بلکہ تو اسی دن اسے دفن کر دینا کیونکہ جسے پھانسی ملتی ہے وہ خدا کی طرف سے ملعون ہے"

(استثناء باب 21 آیات 22, 23)

مسیح جانتا تھا کہ اگر خدانخواستہ ایسا ہو گیا (یعنی اسے صلیب پر لٹکا کر مار دیا گیا) تو یہودی وجد میں آکر خوشی سے جھوم اٹھیں گے اور بڑی مسرت کا اظہار کریں گے۔ وہ اسے (یعنی مسیح کو) مفتری قرار دے کر کہیں گے کہ اس کا مفتری ہونا مقدس صحیفوں کی رو سے اس طور پر ثابت ہو گیا ہے کہ اس میں شبہ کی ذرہ بھر گنجائش نہیں رہی۔ یہ تھی وہ بات جس کی وجہ سے مسیح موت کے کڑوے پیالے سے بچنا چاہتا تھا۔ وہ بزدلی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس خدشہ کے زیر اثر اس وقت موت سے بچنے کو ضروری سمجھتا تھا کہ اگر موت کا پیالہ نہ ٹلا اور وہ صلیب پر مارا گیا تو اس کی قوم کے لوگ (یہودی) گمراہ ہو جائیں گے اور وہ اس کی صداقت کو شناخت کرنے میں ناکام رہیں گے۔ چنانچہ تمام رات وہ اس قدر بے بسی اور بیکسی کی حالت میں دعا کرتا رہا کہ اس کے کرب واضطراب اور اذیت کا حال پڑھ کر دل شق ہو جاتا ہے۔ جب زندگی کا یہ اصلی ڈرامہ اپنے انجام اور اختتام کی طرف بڑھتا ہے تو مسیح کی جذباتی الم انگیزی، یاسیت اور ناامیدی کی کیفیت اس کی آخری پکار——"ایلی ایلی لما شبقتی"——سے پورے طور پر عیاں ہو جاتی ہے۔

یہ بات توجہ کے لائق ہے کہ وہ آخری چیخ یا پکار صرف دکھ اور اذیت میں ہی نہیں ڈوبی ہوئی تھی بلکہ خوف کی حدوں کو چھونے والا استعجاب بھی اس میں رچا ہوا تھا۔ اس کے بعض مخلص و وفادار شاگردوں کی تگ و دو اور کاوش سے اسے ہوش میں لایا گیا۔ انہوں نے اس کے زخموں پر ایک مرہم لگایا یہ مرہم انہوں نے مسیح کو صلیب پر لٹکائے جانے سے قبل ہی تیار کر لیا تھا۔ اس مرہم میں وہ جملہ ادویہ اور دیگر اجزا شامل کیے گئے تھے جو درد کی تکلیف کو کم کرنے اور زخموں کو مندمل کرنے کی خاصیت اور تاثیر کے حامل تھے۔ اپنے آپ کو زندہ پاکر اور زخموں کو مندمل ہوتا دیکھ کر مسیح کو کس قدر مسرت انگیز حیرت ہوئی ہوگی اور محبت کرنے والے اپنے صادق الوعد خدا پر اس کا ایمان کس شان سے اور بھی زیادہ پختہ ہو گیا ہوگا۔ اس وقت ایسی گہرائی اور گیرائی کی حامل بے انتہا خوشی شاید ہی کسی اور شخص کے حصہ میں آئی ہو۔

یہ حقیقت کہ مرہم پہلے ہی تیار کر لیا گیا تھا خود اپنی ذات میں ایک زبردست ثبوت ہے اس امر کا کہ مسیح کے شاگرد یقیناً توقع رکھتے تھے کہ مسیح صلیب سے زندہ حالت میں اتر آئے گا اور اسے طبّی امداد بہم پہنچا کر اس کے لئے علاج معالجہ کی سہولتیں مہیا کرنا ہوں گی۔ چنانچہ وہ اس متوقع صورت حال کے لئے پوری طرح تیار تھے۔

مذکورہ بالا حقائق سے یہ بات آسانی سے واضح ہو جاتی ہے کہ موروثی گناہ اور صلیب کے ذریعہ کفارہ کا تصور بعد میں آنے والے مسیحی عالموں کی قیاس آرائیوں اور خوش فہمیوں کی پیداوار ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ تصور زمانہ قبل از مسیح سے تعلق رکھنے والے اسی نوع کے دیومالائی قصوں سے اخذ کیا گیا ہو۔ مسیح کو جو حالات پیش آئے جب انہیں ان دیومالائی قصوں کی روشنی میں جانچا گیا ہوگا تو ان دونوں میں بہت سی مماثلتیں ڈھونڈ نکالی گئی ہوں گی۔ لگتا یہی ہے کہ ایسی ہی ایک دیومالائی کہانی واقعہ صلیب کے متعلق بھی گھڑ لی گئی اور اسے جزوِ ایمان بنا لیا گیا۔ اس عجیب و غریب اور پر اسرار تصور کی وجہ کچھ بھی ہو ایک بات ظاہر و باہر ہے کہ اس امر کا سرے سے کوئی ثبوت موجود نہیں کہ گناہ اور کفارہ کی مسیحی فلاسفی مسیح کے قول یا فعل پر مبنی ہو یا اس نے خود اس کی تعلیم دی ہو۔ وہ کوئی ایسی تعلیم نہیں دے سکتا تھا جو نہ صرف انسانی فہم و ادراک سے بالا ہو بلکہ جو اس قدر گنجلک اور الجھی ہوئی ہو کہ اس میں اور انسانی فہم و ادراک میں بعد المشرقین پایا جاتا ہو۔

کیا ''باپ خدا'' نے بھی دکھ جھیلا؟

جہاں تک بیٹے کی فطرت کا تعلق ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ باور نہیں کر سکتے کہ اس اکیلے کو

ہی جہنم رسید کر کے آگ میں جھونک دیا گیا ہو کیونکہ یہ بات خود اپنی ذات میں ایک بہت بڑے تضاد کی حامل ہے۔ ہم ذرا مسیحیت کے اصل بنیادی تصور کی طرف لوٹ کر اس معاملہ کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس تصور کی رو سے کہا یہ جاتا ہے کہ "خدا" اور "بیٹا" ہیں تو دو اقنوم لیکن ان کی فطرت اور مادہ ایک ہی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ دونوں میں سے ایک تو ایک تجربہ سے گزرے اور دوسرا اس تجربہ میں سرے سے شریک ہی نہ ہو۔ ہم یہ کیسے باور کر سکتے ہیں کہ "خدا" کے ایک رخ یا "ہیئت" یعنی اس کے "بیٹے" کو تو عذاب دیا جا رہا تھا جبکہ وہ خود اس طرح اس عذاب سے محفوظ تھا کہ گویا اسے خراش تک نہ آئی۔ اگر یہ کہا جائے کہ "بیٹے" کے ساتھ خدا نے دکھ نہیں جھیلا تو یہ خدا کی وحدانیت پر ضرب لگانے اور اسے پاش پاش کرنے کے مترادف ہو گا۔ اس طرح تو ایک شخصیت میں تین شخصیتوں کا ادغام اور بھی ناقابل فہم بن کر رہ جاتا ہے کیونکہ تثلیث کے ہر اقنوم کا تجربہ ایک دوسرے سے یکسر مختلف نظر آئے گا۔ ان میں سے ایک "خدا" تو بھڑکتی ہوئی آگ میں جل رہا ہو گا جبکہ بیک وقت دوسرا "خدا" اس سے مکمل طور پر اس طرح الگ تھلگ ہو گا کہ آگ نے اسے چھُوا بھی نہ ہو گا۔ اس زمانہ میں عیسائیوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یا تو وہ خدا کی عجیب و غریب اپنی خود ساختہ وحدانیت سے ہاتھ دھو بیٹھیں اور زمانہ قبل از مسیح کے اہل روما اور اہل یونان کی طرح تین مختلف خداؤں کا علیحدہ علیحدہ وجود تسلیم کر لیں یا پھر ضمیر کی آواز پر پورے اترتے ہوئے اس بات پر ایمان لے آئیں کہ خدا واحد ہے اور کوئی اس کا شریک نہیں حتٰی کہ یہ بھی ممکن نہیں کہ اس کے کوئی سے بھی دو رخ یا ہیئتیں ہوں جو ایک دوسرے سے متضاد ہوں۔ سوچنے والی بات ہے کہ جب ایک بچہ تکلیف میں ہوتا ہے تو ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کی ماں کو بھی ساتھ ہی تکلیف محسوس نہ ہو اور وہ ہر طرح سے بے حس و پر سکون رہے۔ لازماً وہ بچہ ہی کی طرح خود بھی تکلیف محسوس ہونے والی تکلیف بچہ کی تکلیف سے کہیں بڑھ کر ہوتی ہے۔ جب "باپ خدا" نے اپنے "بیٹے" کو تین دن تک اذیت سہنے اور دکھ جھیلنے کے لیے جہنم رسید کیا تھا تو "باپ" ہونے کی حیثیت میں خود اس پر کیا بیت رہی تھی؟ اور بھڑکتی ہوئی آگ میں پڑے ہوئے "فرزند خدا" پر کیا گزر رہی تھی؟ کیا خدا دو علیحدہ علیحدہ شکلیں اور جداگانہ مادے رکھنے والی دو شخصیتوں میں منقسم ہو گیا تھا؟ "خدا" کی ایک ہیئت تو دوزخ کی آگ میں جل بھن رہی تھی اور دوسری ہیئت دوزخ سے باہر ہونے کے باعث ہر قسم کی تکلیف اور اذیت سے یکسر مبرا تھی؟ اگر یہ سمجھا جائے کہ "باپ خدا" بھی ساتھ ہی دکھ اٹھا رہا تھا تو پھر "بیٹے" کو پیدا کرنے اور اسے مصیبت میں ڈالنے کی کیا ضرورت تھی "خدا" خود ہی دکھ اٹھا سکتا اور مصیبت جھیل سکتا تھا؟ ایک سیدھا سادہ براہِ راست سوال ہے اور

اس کا دوٹوک جواب دینا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ اس نے خود کیوں نہ دکھ جھیلا؟ گناہ کی معافی کا قدیمی مسئلہ حل کے کے لئے ایسا پیچیدہ اور مشکل منصوبہ بنانے کی آخر ضرورت ہی کیا تھی؟

آگ کی سزا

دوزخ کا معاملہ ذرا نازک معاملہ ہے۔ یہ اس امر کا متقاضی ہے کہ اس کا زیادہ قریب سے اور پوری توجہ سے جائزہ لیا جائے۔ یہاں ہماری مراد اس دوزخ سے ہے جس میں عیسائیوں کے عقیدہ کی رو سے مسیح کو ڈالا گیا تھا۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ وہ کس قسم اور نوعیت کی دوزخ تھی۔ کیا یہ وہی دوزخ تھی جس کا ذکر عہد نامہ جدید میں آتا ہے اور خود انجیل یعنی عہد نامہ جدید کے الفاظ میں یہ ہے:

> ”ابن آدم اپنے فرشتوں کو بھیجے گا اور وہ سب ٹھوکر کھلانے والی چیزوں اور بدکاروں کو اس کی بادشاہی میں سے جمع کریں گے اور ان کو آگ کی بھٹی میں ڈال دیں گے۔ وہاں رونا اور دانت پیسنا ہوگا۔“
>
> (متی باب 13 آیت 41،42)

اس بارہ میں مزید غور کرنے سے قبل بغیر کسی ابہام کے واضح طور پر یہ بات سمجھ لینی ضروری ہے کہ عہد نامہ جدید کی رو سے آگ کی سزا یا بالفاظ دیگر دوزخ کی سزا سے کیا مراد ہے۔ کیا یہ ایک ایسی آگ ہے جو روح کو جلاتی ہے یا یہ ایک ایسی مادی آگ ہے جو جسم کو بھسم کر کے رکھ دیتی ہے۔ کیا مسیحی حضرات اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ موت کے بعد ہم اسی جسم میں دوبارہ اٹھائے جائیں گے جسے روح اس کے مٹی میں مل کر مٹی ہو جانے یا راکھ بن جانے کے بعد پیچھے چھوڑ جاتی ہے یا یہ کہ موت کے بعد روح کے لئے ایک نیا جسم پیدا کیا جائے گا اور دوبارہ جی اٹھنے والا شخص ایک نیا جسم عطا ہونے کے تجربہ میں سے گزرے گا؟

اگر دوزخ کی آگ مادی اور جسمانی آگ ہے اور یہ بدنی سزا پر دلالت کرتی ہے تو پھر ہمیں اپنے خیال اور تصور کو پھیلا کر ایک خاص حد تک لے جانا ہوگا اور وہ حد یہ ہے کہ ہمیں سوچنا پڑے گا کہ مسیح کے معاملے میں (جبکہ اسے دوزخ میں ڈالا گیا) کیا ہوا ہوگا اور اس پر کیا بیتی ہوگی؟ کیا آگ میں پڑنے سے قبل مسیح کی روح اسی مادی جسم میں پھر مقید کر دی گئی تھی جو دنیا میں زندگی بھر اس پر مسلّط رہ کر اس کا ساتھ دیتی رہی تھی؟ یا ایسا ہوا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اسے غیر مرئی نوعیت کے آسمانی جسم میں منتقل کر دیا گیا تھا؟ اگر اس مؤخر الذکر بات کو درست مانا جائے تو یہ بھی ماننا ہوگا کہ وہ آسمانی جسم جہنم کی مادی آگ کی پہنچ سے باہر رہا ہوگا یعنی وہ جلنے، سزا پانے اور بھسم ہو جانے سے محفوظ رہا ہوگا؟ بر خلاف اس کے اوّل الذّکر صورت میں

ہوا یہ ہو گا کہ مسیح نے مرنے کے بعد جس انسانی جسم میں بسیرا کیا ہو گا اسے مسیح کے لیے دوبارہ جسم کی شکل دی گئی ہو گی تا کہ وہ جسم دوزخ کی اذیت جھیلنے میں مسیح کے لیے ذریعہ اور واسطہ کا کام دے سکے۔ اگر اس صورت حال کو ہم درست تسلیم کر لیں تو پھر اس امر کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ ایسا کرنا آسمانی یا اُلوہی اصول انصاف کو ایک اور دھچکا پہنچانے کے مترادف ہو گا۔ پہلی بات تو یہ سامنے آئے گی کہ ایک اجنبی روح نے اس مادی جسم کو زندگی بھر کے لئے اغوا کیا اور اسے مجبور کیا کہ وہ اسے (یعنی اس اجنبی کو) اپنے اندر سکونت پذیر ہونے دے۔ اس بے چارے جسم کو اس فراخ دلی اور مہمان نوازی کا صلہ جس کی ذمہ داری اس پر زبردستی تھوپی گئی تھی یہ ملا کہ اس امر کے باوجود کہ اس نے سرے سے کوئی گناہ ہی نہیں کیا دوزخ کی آگ میں جلے۔ اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ اس بے قصور جسم نے طوعاً و کرہاً جو قربانی پیش کی اس کا سہرا اس جسم پر قبضہ جمانے اور اس میں زبردستی سکونت پذیر ہونے والے نے باندھ لیا اپنے سر۔

پھر سوال یہ پیدا ہو گا کہ جس انسان کا وہ جسم تھا اس کی روح کا کیا بنا؟ پھر شاید یہ ماننا پڑے کہ اس کی اپنی کوئی روح تھی ہی نہیں۔ اگر واقعی اس کی اپنی کوئی روح نہ تھی تو پھر مسیح کی شخصیت میں موجود انسان اور خدا دونوں کو ایک ہی وجود ماننا پڑے گا اور یہ نظریہ کہ کبھی تو مسیح سے انسانی جذبوں کے تحت اعمال سرزد ہوتے تھے اور کبھی وہ خدا کی مرضی و منشا کے مطابق اعمال بجالاتا تھا مداری کا کھیل بن کر رہ جائے گا۔ ذہن کے لئے قابل قبول فارمولا یہی ہے کہ ایک روح اور ایک جسم کے باہم یکجا ہونے سے ایک انسان وجود میں آتا ہے۔ سو گویا ایک روح اور ایک جسم کے مجموعے کا انسان ہے۔ ایک جسم میں بیک وقت دو روحیں موجود ہونے کا نظریہ ایک انوکھا نظریہ ہے۔ ایسے انوکھے نظریہ کو وہی لوگ تسلیم کر سکتے ہیں جو ان باتوں پر یقین رکھتے ہیں کہ جن بھوت اور اسی نوع کی دوسری بلائیں لوگوں پر اپنا تسلط جما کر ان سے عجیب و غریب حرکات کرواتی ہیں۔

خدا کی قربانی اور روحانی عظمت

عین ممکن ہے کہ دوسری صورت مسیحی عالموں کے نزدیک زیادہ قابل قبول ہو یعنی یہ کہ مسیح کی روح ہی دوزخ میں داخل ہوئی تھی اور وہ دوزخ بھی مادی نہیں بلکہ روحانی نوعیت کی تھی۔ اگر ایسا ہی تھا تو بادی النظر میں تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم اس نظریہ کو نامعقول قرار دے کر مسترد کر دیں۔ لیکن ذرا تدبر سے کام لیا جائے تو یہ مشکل آڑے آئے بغیر نہیں رہتی کہ روحانی نوعیت کی دوزخ تو ضمیر کے کچوکوں

اور ان کی وجہ سے رونما ہونے والی درد انگیز کیفیت یا احساس جرم کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ مسیح پر تو ان دونوں میں سے کوئی بات بھی صادق نہیں آتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آپ خود معصوم اور بے گناہ ہوتے ہوئے کسی اور شخص کے جرم کی سزا کو خود اپنے لئے قبول کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں تو پھر ضمیر کے کچوکوں اور ان کی درد انگیز کیفیت کے ابھرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ ہوتا یہ ہے کہ اس سے یکسر متضاد صورت حال ابھر کر سامنے آتی ہے۔ نیکی کمانے والے ایسے آدمی کی روح میں تو قربانی و ایثار کے ذاتی اور شخصی مظاہرہ کے زیر اثر طمانیت بخش سعادت میسر آنے کا پر مسرت احساس جنم لیا کرتا ہے۔ اور یہ احساس خود اپنی جگہ دوزخ پر نہیں روحانی جنت پر دلالت کرتا ہے۔

اب ہم ذرا اُس جسم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جسے مسیح نے اپنے لیے اختیار کیا اور ایسا اختیار کیا کہ خود اس کے اندر سما گیا۔ اس ضمن میں دیکھنے والی بات یہ ہے کہ اس جسم کے تعلق میں موت کے کیا معنی ہوں گے اور اس کے دوبارہ جی اٹھنے کا کیا مطلب لیا جائے گا۔ عقل و شعور اور علم کا تقاضا تو یہ ہے کہ مسیح کے جسم کو ”ابنیت مسیح“ کا جزو لاینفک ہونا چاہیے۔ بصورت دیگر اس امر کی کوئی مشترکہ بنیاد بنتی ہی نہیں کہ جس کی رو سے اس کی اُلوہیت اور انسانی حیثیت دونوں باہم مجتمع ہو کر ایک دوسرے میں مدغم ہوں اور پھر ساتھ کے ساتھ بعض مخصوص حالات میں امتیازی طور پر ایک دوسرے سے مختلف نوعیت کے کردار ادا کریں۔ بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ مسیح کے وجود میں موجود انسان تمام معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے کر انہیں کنٹرول کر رہا ہے جس سے یہ لازم آتا ہے کہ اس جسم کی اپنی ایک علیحدہ روح ہے۔ بر خلاف اس کے بعض اوقات ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اُلوہیت خود براہ راست اثر انداز ہو کر انسان کے دل و دماغ اور صلاحیتوں کو ایک خاص نہج پر چلا رہی ہے۔ لہٰذا ہم باصرار یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ایسا اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ جب ایک دوسرے سے ممیز و ممتاز دو علیحدہ علیحدہ شخصیتیں باہم ایک ہی وجود میں مقید ہو کر ایک دوسرے کا جزو لاینفک بن گئی ہوں۔

مسیح کے تعلق میں موت کا مفہوم و مطلب

اس امر کی مختلف امکانی صورتوں کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد کہ مسیح کی شخصیت میں الوہیت اور انسانیت نے باہم دگر کیا کیا کردار ادا کیے ہوں گے۔ اب ہم مسیح کے بارہ میں لفظ ”موت“ کے اطلاق اور پوری جامعیت کے ساتھ اس کے ہمہ گیر معانی کا احاطہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مسیحیوں کے عقیدہ کے بموجب اگر مسیح تین دن رات کے لئے مر گیا تھا تو موت کا یہی مطلب لینا ہو گا کہ ان تین دنوں اور تین راتوں میں روح نے جسم سے اپنا تعلق منقطع کر لیا تھا اور روح اس میں سے پرواز کر گئی تھی۔ اس کا صاف اور واضح مطلب یہی بنتا ہے کہ روح نے پرواز کر کے جسم سے اپنا تعلق ایسے حتمی رنگ میں منقطع کر لیا تھا کہ پیچھے صرف ایک مردہ لاش ہی باقی رہ گئی تھی۔ سو گویا اس طرح مسیح کو ایک مادی اور فانی جسم میں مقید رہنے سے بالآخر خلاصی مل گئی لیکن قید سے اس رہائی کو کسی صورت میں بھی سزا قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ دینا چاہیے۔ ''بیٹے'' کی مقدس روح کی اپنی پر جلال و پر جمال شان و شکوہ کی طرف مراجعت کو کسی لحاظ سے سے بھی عام انسانی موت پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ انسانی موت کے ساتھ خوف وابستہ تو ہوتا ہے لیکن اس خوف کا روح کی جسم سے علیحدگی اور جدائی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ روح تو ایک نئے شعور اور نئی آگاہی سے ہمکنار ہو کر جسم سے علیحدگی اختیار کر رہی ہوتی ہے بلکہ موت کے خوف اور دہشت کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ مرنے والے کا اپنے پیچھے چھوڑے جانے والے بہت سے عزیزوں، پیارے وجودوں اور مرغوب و دل پسند چیزوں یعنی کل پسماندگان سے ہمیشہ کے لیے تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ اسی لیے بسا اوقات ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ ایسا شخص جس کے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہتا اور اس کے عزیز و اقارب ہی حیات ہوتے ہیں کہ جن کی خاطر وہ زندہ رہے وہ کھوکھلی قسم کی بے کیف زندگی بسر کرنے پر موت کو ترجیح دینے لگتا ہے۔ زندگی میں اس کی دلچسپی اس حد تک ختم ہو جاتی ہے کہ وہ مر جانا چاہتا ہے۔

جہاں تک مسیح کا تعلق ہے اس امر کا کوئی امکان نہ تھا کہ اسے زندگی میں یا موت کے وقت کسی قسم کی ندامت یا پشیمانی سے دوچار ہونا پڑا ہو۔ اس کے لئے تو موت کی کھڑکی صرف ایک سمت میں کھلتی تھی اور وہ سمت کسی خسارہ کی نہیں بلکہ سراسر نفع اور خیر و فلاح کی سمت تھی۔ پھر جسم سے اس کے علیحدہ ہونے یا اس میں سے کوچ کرنے کو ایک انتہائی قابل رحم اور اذیت ناک تجربہ سے کیوں تعبیر کیا جائے؟ مزید برآں جیسا کہ عیسائی صاحبان ہمیں باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں مسیح نے محض تمثیلی رنگ میں جان نہیں دی تھی بلکہ فی الحقیقت ایک دفعہ موت کا مزہ چکھا تھا اور مرنے کے بعد وہ پھر اسی جسم میں لوٹ آیا تھا۔ ایسی صورت میں اسی جسم کے اندر واپس لوٹ آنے کا مطلب اس کے سوا کیا ہو گا کہ ایک سراسر ناممکن اور خلافِ عقل بات کو اس کی طرف منسوب کیا جائے۔ موت کے وقت جسم کو چھوڑ دینے اور اس سے کلیۃً کنارہ کش ہو جانے کے بعد جب وہ اسی جسم میں واپس لوٹا تو کیا اس کی اس مراجعت کو نئی پیدائش سے تعبیر کیا جائے

گا؟ اگر اس پورے عمل کو مسیح کے جی اٹھنے اور از سرِ نو زندہ ہو جانے سے ہی تعبیر کرنا ہے تو پھر یہ بھی لازم آتا ہے کہ اس کے ساتھ اس کے جسم کو بھی دوام حاصل ہو گیا ہو گا۔ لیکن بائبل میں ہم جو کچھ پڑھتے ہیں وہ بالکل ہی مختلف کہانی ہے۔ اس کہانی کے مطابق مسیح اسی جسم میں جس میں کہ صلیب دی گئی تھی دوبارہ داخل ہو کر مردوں میں سے جی اٹھا تھا اور اسی جی اٹھنے کو ہی مرنے کے بعد دوبارہ زندگی پانے کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہی ہوا تھا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسی جسم کو دوبارہ ترک کرنے کو کیا معنی پہنائے جائیں گے؟ کیا اسے دوبارہ ترک کرنا دوسری موت کے مترادف نہ ہو گا؟ اگر مسیح کا جسم سے پہلی بار کوچ کرنا موت کی آغوش میں جانا تھا تو پھر اسے دوسری بار ترک کرنے کے بارہ میں تسلیم کر لینا چاہیے کہ وہ ہمیشہ کے لئے مر چکا ہے۔ جب روح پہلی بار جسم کو چھوڑ جاتی ہے تو تم اسے موت قرار دیتے ہو۔ جب وہ دوبارہ اسی جسم میں واپس آتی ہے تو تم اسے موت کے بعد کی زندگی قرار دیتے ہو۔ لیکن جب وہ اسی جسم کو دوبارہ چھوڑ جاتی ہے اور چھوڑ بھی جاتی ہے کبھی واپس نہ آنے کے لئے تو اس کے ہمیشہ کے لئے چلے جانے کو تم کیا نام دو گے؟ کیا اسے فہم و ادراک سے بالا مسیحیت کی چیستانی زبان میں دائمی موت کہا جائے گا یا پھر ایسی دائمی موت کو بھی دائمی حیات کا نام دیا جائے گا؟ موت، موت ہی ہوتی ہے یہ دائمی موت ہی کہلائے گی اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس سارے معاملہ پر جتنا بھی غور کیا جائے ایک تضاد کے بعد دوسرا تضاد نکلتا چلا آتا ہے اور تضاد پر تضاد سے واسطہ پڑتا چلا آتا ہے۔ یقیناً اس پر غور و فکر ایک اعصاب شکن تجربہ سے کسی طرح کم نہیں!

اب اگر یہ کہا جائے کہ دوسری مرتبہ جسم کو ترک نہیں کیا گیا تو بہت ہی عجیب و غریب صورت حال ابھر کر سامنے آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ "باپ خدا" تو ایک لا محدود اور غیر فانی روحانی وجود کے طور پر اپنے موجود ہونے کا ثبوت دے رہا ہے جبکہ "بیٹا" ایک فنا ہو جانے والی ہستی کی حدود و قیود میں مقید چلا آرہا ہے۔

غیر محدود گناہوں کی برائے نام سزا

مسیحیوں کی طرف سے خیال آفریں انداز میں کہنے کو یہ بھی کہا جا سکتا ہے اور بعض کہتے بھی ہیں کہ یہ ہمیشہ ضمیر کے باطنی کچوکے اور ان کے نتیجہ میں اٹھنے والی ٹیسیں ہی نہیں ہوتیں جو ان لوگوں کو انتہائی تکلیف دہ حالات سے دوچار کرتی ہیں جو اپنے قصوروں اور گناہوں کے بارہ میں بہت حساس واقع ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے دوسروں کے دکھوں اور مصائب پر انتہائی ہمدردی اور غم خواری کا جذبہ بھی کسی انسان کو جو خود مکمل یا جزوی طور پر معصوم و بے خطا ہو روحانی اذیت میں مبتلا کر دیتا ہے اور ان کی یہ حالت مسلسل

سوہانِ روح کی شکل اختیار کرتی چلی جاتی ہے۔ ایسا شخص دوسروں کی خاطر خود دکھ اٹھانے کے وصف سے متصف ہوتا ہے۔ اس کی یہ حالت بسااوقات بڑھتے بڑھتے جہنم کی اذیت ناک کیفیت سے مشابہت اختیار کر لیتی ہے۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ مائیں اپنے بیمار اور معذور بچوں کے لئے کچھ کم دکھ نہیں اٹھاتیں۔ انسانی تجربہ اس امر پر گواہ ہے کہ ایک دائمی طور پر معذور اور اپاہج بچے کا دکھ اس کی ماں کے لئے ایک دہکتی ہوئی اصلی جہنم کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ بنابریں ہم دوسروں کی خاطر دکھ جھیلنے کے اس اعلیٰ روحانی وصف کو مسیح کے تعلق میں کیوں تسلیم نہیں کر سکتے؟ آخر ہم کیوں نہ تسلیم کریں کہ یہ ارفع و اعلیٰ روحانی وصف مسیح کو بدرجۂ اولیٰ حاصل تھا اور وہ یقیناً اس سے پوری طرف متصف تھا لیکن مسیح کے ضمن میں سوچنے والی بات یہ ہے کہ اس کے اس ارفع وصف کی کارفرمائی صرف تین دن رات تک ہی کیوں محدود رہی؟ اس وصف نے مسیح کے اپنے پورے زمینی عرصۂ حیات میں بلکہ اس سے بھی پہلے اور بعد کے زمانوں میں بھی اپنی تاثیر اور اثرانگیزی کا کیوں ثبوت نہ دیا۔ شرف اور بزرگی رکھنے والے روحانی وجود دوسروں کی خاطر صرف چند گھنٹوں یا دنوں پر مشتمل محدود وقت کے لیے ہی برائے نام دکھ نہیں اٹھایا کرتے۔ ان کے دکھ اور کرب مسلسل کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ ان کے دل تسلی نہیں پکڑتے اور انہیں چین نہیں آتا جب تک وہ دوسروں کے دکھ کو یکسر نابود ہوتے اور اسے سکھ میں تبدیل ہوتے نہ دیکھ لیں۔ جس قسم اور نوعیت کی دوزخ سر دست ہمارے زیرِ غور ہے اسے اپنے پر وارد کرنا صرف معصوم صفت اور خدا رسیدہ لوگوں کا ہی خصوصی استحقاق نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ اعلیٰ وصف ہے لیکن یہ ہے ایک ایسا وصف جس سے متصف ہونے سے جنگل کے درندے بھی بکلی محروم نہیں ہیں۔ وہ بھی ایک حد تک اس سے متصف ہوتے ہیں اسی لیے وہ بھی اپنے قریبی ساتھیوں کا دکھ درد محسوس کرتے ہیں۔

میں اظہارِ رائے کے طور پر چند مزید فقروں پر اکتفا کرتے ہوئے اس بحث کو سمیٹنا اور ختم کرنا چاہتا ہوں لیکن ایک اور اہم موضوع بھی میرے پیش نظر ہے اس پر بھی اختصار سے روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ وہ موضوع یہ ہے کہ خدا نے مسیح کے لئے جو سزا مقرر کی وہ صرف تین دن اور تین رات جاری رہی جبکہ ان گناہگاروں نے جن کے گناہوں کی پاداش میں اسے سزا دی گئی اتنے لمبے عرصہ اور زمانہ دراز تک ایسے ایسے بھیانک گناہ کئے تھے کہ خود بائبل کی رو سے وہ مستحق تھے دوزخ کے دائمی عذاب کے۔ قابل غور امر یہ ہے کہ یہ کس قماش کا عادل خدا تھا کہ جب وہ ان لوگوں کو سزا دینے لگا جنہیں اس نے خود پیدا تو کیا تھا لیکن وہ

اس کے اپنے بیٹے اور بیٹیاں نہیں تھے تو اس نے انہیں ہمیشہ ہمیش جاری رہنے والی سزا دینے کا فیصلہ کیا لیکن جب وہ انہی ان گنت گناہوں کی سزا خود اپنے بیٹے کو دینے لگا کیونکہ ان تمام گناہوں کا بار اس نے رضاکارانہ طور پر خود اپنے کندھوں پر لے لیا تھا کبھی ختم نہ ہونے والی دائمی سزا میں یکدم تخفیف کر دی گئی اور تخفیف بھی اتنی زیادہ کی گئی کہ دائمی سزا گھٹ گھٹا کر صرف تین دن اور تین رات کے انتہائی قلیل عرصہ تک محدود ہو کر رہ گئی؟ گویا کہ دونوں سزاؤں میں کوئی نسبت ہی باقی نہ رہی۔ اگر انصاف کے نام پر سے کچھ کرنا تھا تو پھر ایسے انصاف کا ڈھونگ رچانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ بنی نوع انسان کو خدا نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا ہے۔ اگر وہ بھی اسی طرح کا انصاف کرنے لگیں جس طرح کا انصاف کرنا انہوں نے خود اسی سے سیکھا ہے تو عدل گستری میں وہ ان کے طرز عمل اور کردار پر کیسے ناپسندیدگی اور ناراضگی کا اظہار کرے گا۔ اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ اپنے بچوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے میں اور پیمانے اور دوسروں کے ساتھ پیش آنے میں پیمانے بالکل ہی اور۔ اگر خدا کے بندے بھی عدل گستری میں اس کے اپنے اس بے انداز تفاوت کی نقل کریں تو کیا وہ ان کی اس ہو بہو نقل کو خوشی اور مسرت کے عالم میں جھوم جھوم کر دیکھے گا یا غصہ اور دہشت زدگی کے عالم میں اس کا مشاہدہ کرے گا؟ لاریب بہت مشکل ہے اس سوال کا جواب دینا!

کفارہ نے تبدیلی کیا پیدا کی؟

جہاں تک اس مسیحی عقیدہ کا تعلق ہے کہ مسیح کا صلیب پانا گناہ کی سزا پر اثر انداز ہوا ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ یسوع مسیح پر ایمان لانے کے نتیجہ میں گناہ کی سزا میں کسی لحاظ سے بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ہماری مراد اس سزا سے ہے جو خدا نے ابتدائی گناہ کی پاداش کے طور پر آدم و حوا اور ان کی تمام آئندہ نسلوں کے لئے مقرر کی تھی۔ تمام انسانی مائیں آج تک دردِزِہ کی تکلیف اٹھا کر بچے جنتی چلی آرہی ہیں اور اسی طرح آج بھی مرد محنت و مشقت کے ذریعہ اپنا پسینہ بہا کر روزی کما رہا ہے۔

آیئے ہم ایک اور زاویۂ نگاہ سے اس معاملہ کا جائزہ لیں۔ وہ زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ اس بارہ میں عیسائی دنیا کا غیر عیسائی دنیا سے موازنہ کر کے دیکھیں کہ زمانہ مسیح کے بعد سے عیسائی دنیا میں کیا امتیاز رونما ہوا ہے۔ مسیح پر ایمان لانے والا کوئی شخص بھی تاریخ کے کسی بھی دور میں کسی قابل ذکر تبدیلی کی نشاندہی نہیں کر سکتا۔ کیا کسی دور میں بھی ایسا ہوا ہے کہ ان کی (یعنی عیسائیوں کی) عورتوں نے دردِزِہ کے بغیر ہی بچے جنے

ہوں۔ اور ان کے مردوں نے مشقت جھیلے بغیر ہی روزی کمائی ہو۔ اس بارہ میں وہ غیر عیسائی دنیا کے بالمقابل اپنے ہاں کسی تبدیلی کارونما ہوناثابت نہیں کرسکتے۔

گناہ کے طبعی میلان کے بارہ میں بھی عیسائی دنیامیں تبدیلی کے کوئی آثار کبھی ظاہر نہیں ہوئے۔ مسیح پر ایمان رکھنے والوں اور ایمان نہ رکھنے والوں کا باہم موازنہ کرنے سے اس امر کی کوئی شہادت سامنے نہیں آتی کہ مسیح پر ایمان رکھنے والوں میں ارتکاب گناہ کا میلان کلی طور پر ناپید ہو گیا ہو۔ مزید بر آں یہ امر بھی حیران کن ہے کہ "خدا کے بیٹے" پر ایمان کے بالمقابل خدا پر ایمان کو کمتر درجہ کیوں دیا جاتا ہے۔ خاص طور پر اس زمانہ کے متعلق کیا کہا جائے گا جبکہ یہ "گہرا قدیمی راز" کہ خدا کا کوئی بیٹا بھی تھا ابھی نوع انسان پر منکشف نہ ہوا تھا۔ یقیناً اس وقت بھی ایسے لوگ موجود تھے جو خدا کی ہستی اور اس کی وحدانیت پر ایمان رکھتے تھے۔ اسی طرح خود مسیح کے اپنے زمانہ میں اور اس کے بعد کے زمانوں میں بھی ہر خطۂ ارض میں اور ہر مذہب سے تعلق رکھنے والوں میں بے شمار لوگ ایسے پیدا ہوئے جو خدا کی ہستی پر اور اس کے احد ہونے پر ایمان رکھتے تھے۔ اس زمانہ میں ایمان باللہ گناہ اور اس کی سزا پر کیوں اثر انداز نہ ہوا؟ یہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ "باپ خدا" نے گناہگاروں کے لئے اس عظیم دکھ کا مظاہرہ کیوں نہ کیا جس کا مظاہرہ اس کے "بزرگ تر" بیٹے کی طرف سے دیکھنے میں آیا؟ یقیناً ظاہر یہی ہوتا ہے کہ (نعوذ باللہ) کم مہذّب باپ کے مقابلہ میں بیٹا بلند تر اخلاقی اقدار کا حامل تھا۔ اگر کوئی یہ پوچھتا ہے تو وہ ایسا کرنے میں حق بجانب ہے کہ کیا (نعوذ باللہ) الوہیت ابھی ارتقائی مراحل میں سے گزر رہی ہے اور اس کے پایۂ تکمیل کو پہنچنے کا عمل ہنوز جاری ہے؟

باب سوم

رُوحُ القُدس کا عمل و کردار

اب تک ہم نے جس مسئلہ کے بارہ میں بات کی ہے اس کا تعلق خدا کے نام نہاد بیٹے مسیح سے تھا یا پھر اس مفروضہ سے کہ خدا مسیح کا حقیقی باپ ہے لیکن اس ضمن میں ایک تیسری ہستی کا ذکر بھی ضروری ہے اور اس ہستی کا نام ہے روح القدس۔ مسیحی عقیدہ کی رو سے روح القدس اپنی علیحدہ اور جداگانہ شخصیت بھی رکھتا ہے اور اس کے باوجود وہ ”باپ“ اور ”بیٹے“ کے ساتھ پیوست بھی ہے اور پیوست بھی ہے اس طرح کہ ازلی طور پر ان میں مدغم ہے اور اس انداز سے مدغم ہے کہ ان تینوں کا ایک دوسرے میں ادغام ”تین میں ایک“ والی کیفیت یعنی ان تینوں کی باہم ایک اور اکیلی حیثیت کو اجاگر کر دکھاتا ہے۔ چنانچہ اب ہم اپنی توجہ کو بطور خاص اس نئے مسئلہ کی طرف پھیر کہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کیا خدا اور مسیح کی اپنی اپنی خودی سے علیحدہ روح القدس کی بھی اپنی کوئی علیحدہ خودی ہے۔ یہاں خودی سے مراد فی الاصل وہ شعور ذات ہے جو آخری اور حتمی تجزیہ کی رو سے غیر منقسم ہوتے ہوئے اپنی انفرادی حیثیت میں ہر فرد کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو ہر فرد کا دوسرے تمام افراد سے الگ اور ممیز ہونے کا شعور ہی غائب و حاضر اور مخاطب و متکلم کی الگ الگ حیثیتوں میں ”وہ“ اور ”اس“ کا نیز ”تم“ اور ”تمہارا“ کے بالمقابل ”میں“ اور ”میرا“ کی تمیز کو جنم دیتا ہے اور اس طرح ان کے درمیان پایا جانے والا امتیاز بین طور پر نمایاں ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

تثلیث کے تینوں اجزا یا اقانیم پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے ہمیں یہ امر طے کرنا ہے کہ آیا تینوں اقانیم اپنی جداگانہ خودی یعنی اپنی اپنی ہستی کا علیحدہ علیحدہ شعور رکھتے ہیں یا نہیں۔ اگر وہ اپنی ذات کا الگ الگ شعور نہیں رکھتے تو پھر ان سے ان کی علیحدہ علیحدہ شخصیتوں کو منسوب کرنا ناقابل فہم بنے بغیر نہیں رہتا۔ ہر شخص دوسرے شخص یا ہستی کے کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو اس کا اس انتہائی قربت کے باوجود اپنی ذات کے علیحدہ شعور سے متصف ہونا ضروری ہوتا ہے۔

تثلیث کے بارہ میں اکثر کلیسیائی فرقوں کا اپنا سرکاری یعنی باقاعدہ طور پر اختیار کردہ مشترکہ مؤقف

معین الفاظ میں منضبط ہے اور الفاظ کی حد تک وہ ہے بھی بالکل واضح۔ خود ان کے اپنے دعوٰی کے بموجب وہ نظریہ یا موقف یہ ہے کہ خدا کے وجود کی تین ہستیوں یا اقانیم میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی علیحدہ شخصیت بھی ہے۔ سو یہ صرف "تین میں ایک" والی بات نہیں ہے بلکہ یہ عقیدہ ایک شخصیت میں تین شخصیتوں کی موجودگی پر دلالت کرتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ امر ظاہر و باہر ہے کہ مسیح نے جب موت اور اس کے جملہ دوررس نتائج و عواقب کا سامنا کیا تھا تو اس کے اس پورے فعل میں روح القدس بھی برابر کا شریک رہا ہوگا کیونکہ مسیح نے جو قربانی دی اس میں تثلیث کے ایک اقنوم کی حیثیت سے روح القدس کی برابر کی شرکت ناگزیر تھی۔ مزید برآں یہ بھی لازم آتا ہے کہ مسیح اور "باپ خدا" کی ہمراہی میں اس نے بھی دوزخ کا عذاب جھیلا ہوگا۔ اگر کہا جائے کہ ایسا نہیں ہوا تو کوئی بھی اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تینوں اقانیم (باپ، بیٹا اور روح القدس) ایک دوسرے سے مختلف و ممیز الگ الگ شخصیتوں کے ہی مالک نہ تھے بلکہ دل و دماغ سے تعلق رکھنے والے ان کے جذبات و خیالات اور ان کی استعدادیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہونگی اور ایک دوسرے کے مابین انفعال کی کیفیت بھی موجود ہوگی۔

تثلیث کے عقیدہ کو سمجھنے کی کوشش میں ہمیں اس منظر کو ذہن میں لانا ہوگا کہ تین علیحدہ علیحدہ شخصیتیں ایک دوسرے میں اس طرح گتھی ہوئی اور مدغم ہیں کہ ازل سے وجود واحد کے طور پر موجود چلی آرہی ہیں۔ ہم اپنے تخیل کو وسیع کرنے اور جِلا دینے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں ہم یہ سمجھنے میں ہمیشہ ناکام رہیں گے کہ وہ تینوں شخصیتیں اپنے اپنے مختلف جذبات و احساسات کے ترقی پزیر عمل کے باوجود کس طرح باہم مدغم ہوسکتی تھیں اور ازلی طور پر وجود واحد کی حیثیت سے اپنی ہستی کو کس طرح برقرار رکھ سکتی تھیں۔ اندریں حالات ایک ہی امکانی صورت باقی رہ جاتی ہے اور وہ ہے جسمانی طور پر ایک دوسرے میں مدغم ہونے کی صورت۔ اس امکانی صورت کو ذہن میں لانے سے قوی ہیکل بے شمار سروں والے اس عفریت نما اژدھے کی خیالی تصویر پردہ ذہن پر ابھرنے لگتی ہے جس کا ذکر یونانی علم الاصنام کے دیومالائی قصوں میں آتا ہے اور جس کے متعلق بیان یہ کیا جاتا ہے کہ اس کا ایک کئی سر قلم کر دینے سے فوراً ہی نئے سر نکل آتے تھے۔ یہ بات یقیناً اپنی جگہ صحیح ہے کہ انسان اس حقیقت کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے کہ خدا کس طرح کا اور کس فطرت کا ہے اور یہ کہ اس کی صفات خود اس میں کس طرح بروئے کار آتی ہیں۔ لیکن ایک ایسی واحد اور اکیلی ہستی پر جس کے ساتھ سر، دل، گردوں اور دیگر اعضا کی طرح کے علیحدہ علیحدہ جسمانی حصوں اور ان کی مخصوص کارکردگی کا کوئی تصور وابستہ نہ ہو ایمان لانا بہت سادہ اور آسان ہے۔ اس

لئے کہ جداگانہ شخصی خیالات و اوصاف والی ہستیوں کے برائے نام ادغام کا خیالی منظر نامہ متذکرہ بالا واحد ولاشریک ہستی کے منظر نامہ سے یکسر مختلف و متغائر ہے۔ مختلف ہستیوں کے فرضی ادغام والے خیالی منظر نامہ کے نتیجہ میں ایک ایسے خدا کا تصوراتی ہیولا ابھرتا ہے جس کو سمجھنا اور جس پر ایمانالانا نوع انسان کے لئے بے حد مشکل اور وقت طلب ہے۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں بہت سے انسان زمانہ دراز تک اس مسیحی عقیدہ پر کوئی اعتراض کیے بغیر اس کے ساتھ بلا حیل و حجت چمٹے رہے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کی عطا کردہ عقل و دانش اور فہم و فراست کی ایسی کھلی کھلی خلاف ورزیوں کو عمداً آنکھیں بند کر کے نہ جانے کیسے نظر انداز کیے رکھا۔

روح القدس اور تخلیق کا آسمانی منصوبہ

جہاں تک تخلیق کے خدائی منصوبہ اور اس ضمن میں یسوع مسیح کی تخلیق و پیدائش کا تعلق ہے ہمیں اس میں روح القدس کا کوئی عمل دخل نظر نہیں آتا۔ خود توریت میں لکھا ہے:

"خدا نے ابتدا میں زمین و آسمان کو پیدا کیا۔"

(پیدائش باب 1 آیت 1)

ظاہر ہے عہد نامہ قدیم میں مسیح یا روح القدس کی طرف کوئی اشارہ کیے بغیر خالق کے طور پر صرف "باپ خدا" کا ہی ذکر کیا گیا ہے۔ مسیح سے قبل کے پورے زمانہ میں جتنے بھی یہودی ہو گزرے تھے انہوں نے عہد نامہ قدیم کی اس آیت کو لکھو کھہا دفعہ پڑھا یا سنا ہو گا۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جس نے تخلیق کائنات کے ضمن میں مسیح یا روح القدس کا کبھی کوئی تذکرہ سنا ہو۔ البتہ عہد نامہ جدید میں ایک آدھ جگہ اشاروں کنایوں میں ایک امر کا مبہم سا ذکر ملتا ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ گویا تخلیق کائنات کے عمل میں مسیح کا بھی کچھ دخل تھا۔ چنانچہ یوحنا نے اپنی انجیل میں مسیح کی طرف اشارہ کرنے کے لئے "کلام"[3] کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اناجیل اربعہ کے چار الگ الگ مصنّفین میں سے صرف ایک مصنف نے اپنی رقم کردہ انجیل میں ایسے اہم موضوع کو چھیڑا ہے اور غالباً اسے چھیڑا بھی ہے یوحنا نامی کسی ایسے شخص نے جو مسیح کا شاگرد (حواری) ہی نہ تھا۔ اگر اس شخص کے اختیار کردہ لفظ "کلام" کو خدا کا کلام تسلیم کیا جائے تو بھی اس سے مراد خدا کی مرضی ہی لی جائے گی کیونکہ یہ ایک ایسا تصور یا نظریہ ہے جو تخلیق کائنات کے ضمن میں بہت سے مذاہب میں قدر مشترک کے طور پر پایا جاتا ہے۔

[3] ابتدا میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا۔ (انجیل یوحنا باب 1 آیت 1)

تعجب انگیز بات یہ بھی ہے کہ یہ امر کہ تخلیق کائنات کے پورے عمل میں خدا کے ساتھ مسیح اور روح القدس بھی شریک تھے ابتدائے آفرینش سے لے کر اس وقت تک پردہ راز میں ہی رہا جب تک کہ مسیح دنیا میں نہ آیا۔ بلکہ ہم دیکھتے ہی کہ خود مسیح نے بھی اس راز پر سے پردہ نہ اٹھایا اور اسے اپنے سینہ میں ہی دفن کیے رکھا کیونکہ ہمیں یسوع مسیح کا کوئی قول ایسا نہیں ملتا۔

جس میں اس نے اپنے آپ کو دعویٰ کے رنگ میں "کلام" قرار دیا ہو۔ لہٰذا یہ بات واضح ہے کہ دونوں (مسیح اور روح القدس) میں سے کسی کا بھی کائنات کی تخلیق یا اس کی وضع قطع اور صورت گری میں کوئی عمل دخل سرے سے تھا ہی نہیں۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ صرف یہ "باپ خدا" ہی تھا جس نے انسان کو اپنے ہاتھوں سے مٹی سے بنایا۔ میں نے عیسائی لٹریچر میں کہیں یہ نہیں پڑھا کہ جن ہاتھوں نے انسان کو بنایا وہ مسیح اور روح القدس کے ہاتھ تھے۔ ہر چیز خدا نے مسیح یا روح القدس کی خفیف سی مدد یا شرکت کے بغیر خود ہی پیدا کی۔ ان حالات میں مسیحی علما سے یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ تخلیق کائنات کے ضمن میں خدا جو کچھ کر رہا تھا کیا مسیح اور روح القدس دونوں خاموش مبصّروں کا کردار ادا کر رہے تھے یا پھر اس کے برعکس صورت حال یہ تھی کہ تخلیق کے عمل میں وہ دونوں بھی برابر کے شریک تھے؟ اگر مؤخر الذّکر صورت حال ان کے نزدیک زیادہ قابل قبول ہے تو پھر لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان میں سے ہر ایک اپنی انفرادی حیثیت میں کسی اور کی مدد کے بغیر تخلیق کرنے کی قدرت رکھتا تھا یا پھر یہ کہ وہ اجتماعی حیثیت میں ہی باہمی اشتراک سے ایسا کرنے پر قادر تھے؟ اور اگر تخلیق کرنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ تینوں اپنے فرائض اور کاموں کو باہمی اشتراک سے یکجائی طور پر انجام دیں تو کیا ان میں سے ہر ایک کی شرکت مساوی حیثیت کی تھی یا تخلیق کے کام میں جو محنت درکار تھی اس میں ایک کا حصہ دوسروں کے حصہ سے زیادہ تھا؟ کیا وہ تینوں ہستیاں نوعیت اور کیفیت و کمیت کے اعتبار سے مختلف طاقتوں کی حامل تھیں؟ ہر کسی کو ماننا پڑتا ہے کہ دونوں امکانی صورتوں میں سے جس کو بھی درست مانا جائے بہر صورت و بہر حال تثلیث کا ہر اقنوم اپنی اکیلی حیثیت میں از خود کوئی چیز تخلیق کرنے کا نااہل ثابت ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اگر اس استدلال کو پھیلا کر دوسرے خدائی کاموں پر بھی اس کا اطلاق کیا جائے تو پھر یہی سوال بار بار آڑے آکر عیسائی علما کے لئے وبال جان بنا رہے گا۔ انجام کار دنیائے عیسائیت کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ ایسے واحد خدا پر ایمان نہیں رکھتی جس کے اقتدار اعلیٰ، مرکزی قوت و جبروت اور عظمت و جلال کے تین مظہر ہیں بلکہ عیسائیت خدا کی ہستی کو مکمل کرنے والے تین علیحدہ علیحدہ اجزائے ترکیبی پر ایمان رکھتی ہے جو اس کے جسم یا ہستی

کے تین حصوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خدا کی ہستی کی ایسی تقسیم و تفریق کی صورت میں اجزائے ترکیبی کے باہم مساوی یا غیر مساوی ہونے کا معاملہ نسبتاً کم تر درجہ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

سربستہ راز یا مہمل و متناقض اچنبہ

ایک انسان کے لئے یہ بات قابل قبول ہوتی ہے کہ جس چیز یا امر کے ناقابل تردید شواہد موجود ہوں وہ اس کی کُنہ و کیفیت کو جانے اور پوری طرح سمجھے بغیر اسے حتمی اور یقینی قرار دے دے۔ ناقابل تردید شواہد کی موجودگی میں اس کے لئے یہ ممکن نہیں رہتا کہ وہ اس چیز کا محض اس لئے انکار کر دے کہ اس کی کُنہ و کیفیت اور اصل حقیقت اس کی سمجھ یا ادراک سے بالا ہے۔ مثال کے طور پر لوگ قدرت کے ان مظاہر کی کُنہ و کیفیت سے آگاہ نہیں ہوتے جو باہم مل کر ریڈیو ٹرانسمیشن (یعنی ریڈیائی پیغامات کی غیر مرئی ترسیل) اور ان پیغامات کو وصول کرنے والے آلات کو معرض وجود میں لانے کا موجب بنتے ہیں۔ یہ پیچیدہ و نازک آلات ریڈیائی لہروں میں محفوظ آوازوں اور مناظر کو دور دور تک پہنچانے والی کائناتی نبضوں اور دھڑکنوں کو کنٹرول کر کے ان میں محفوظ آوازوں اور مناظر کو ایسی کیفیت سے ہمکنار کر دکھاتے ہیں کہ انہیں ٹیلی کاسٹ کرنا یعنی کُرّہ ٔارض کے گرد دور دور تک ٹیلی ویژن سیٹس (Television Sets) میں منتقل کر کے انہیں سنا اور دیکھا بھی جا سکتا ہے۔ کائناتی لہروں کو کنٹرول کرنے اور ان سے کام لینے کے اس پورے نظام کے حقائق سے نابلد ہونے کے باوجود چٹے ان پڑھ لوگوں کو بھی انہیں تسلیم کرنا پڑتا ہے اور اس لئے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی صورت میں ان غیر مرئی حقائق کے ناقابل تردید شواہد ہمہ وقت ان کے سامنے موجود ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہم میں سے بہت سے لوگوں کو اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ کمپیوٹرز کس طرح کام کرتے ہیں۔ اس کے باوجود عصر حاضر میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو محض اپنے عدم علم کی بنا پر کمپیوٹروں کے نظام کی موجودگی کا انکار کرنے کی جرات کر سکیں۔ ایسے امور یا معاملات کو سربستہ رازوں سے تو تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی موجودگی سے انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح جو لوگ عدم علم کی وجہ سے ایسے سربستہ رازوں پر یقین نہیں رکھتے انہیں بے عقل سمجھنے یا ان کا تمسخر اڑانے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہم اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ اسی نوعیت کے بہت سے رازوں کے متعلق جو مذہبی عقائد کی شکل میں موجود ہوتے ہیں حلیمی اور بردباری کا رویہ اختیار کیا جا سکتا ہے اور کیا بھی جاتا ہے۔ بہت بڑی تعداد میں ایسے لوگ دنیا میں پائے جاتے ہیں جو اس نوعیت کے عقائد پر

ایمان رکھتے ہیں درآنحالیکہ وہ عقائد ان کی سمجھ سے بالا ہوتے ہیں اور وہ خود ان کی وضاحت کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ ایسے عقائد انہیں نسلاً بعد نسلٍ ورثہ میں مل رہے ہوتے ہیں اور ان کا عام رویہ یہ ہوتا ہے کہ یہ تو پہلے سے تسلیم شدہ عقائد ہیں۔ لہٰذا ان کے بارہ میں بحث یا غور کرنا بے فائدہ ہے لیکن ایسے رازوں پر مبنی عقائد کو درست تسلیم کرنے اور ان پر ایمان لانے کا معاملہ دیگر ہے کیونکہ ایسے رازوں کو ناقابل تردید حتمی شواہد کی پوری پوری تائید حمایت حاصل ہوتی ہے لیکن جب مذہبی عقائد میں مہمل ومتناقض اچنبے اور عجوبے راہ پا جائیں تو پھر ان کے بارہ میں یہ عذر قبول نہیں کیا جاسکتا کہ قدرت کے بعض فہم وادراک سے بالا رازوں پر ایمان لانا اس امر کا جواز پیدا کرتا ہے کہ مہمل ومتناقض اچنبوں اور یکسر انہونی باتوں پر بھی آنکھ بند کرکے ایمان لے آیا جائے۔ ایسا انوکھا جواز پیچیدگیوں، الجھنوں اور گنجلکوں کو جنم دینے کا موجب بنتا ہے۔ میں بعض واضح شواہد کی موجودگی میں ایک ایسی بات پر ایمان لاسکتا ہوں جس کی کُنہ وکیفیت کو میں سمجھتا نہیں لیکن میں کسی ایسی بات یا مبینہ واقعہ پر ایمان نہیں لاسکتا جو اپنی ذات میں تضادات کا مجموعہ ہو۔ اور نہ ہی کوئی اور شخص جس کے ہوش وحواس قائم وبرقرار ہوں فی ذاتہٖ ایسی متناقض ومتضاد بات پر ایمان لانے پر آمادہ ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر میرے لیے یہ چیز تو سمجھ سے بالا ہوسکتی ہے کہ ایک گھڑی کس طرح بنتی ہے لیکن اپنے اس عدم علم کی بنا پر مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ میں ازخود یا کسی کے کہنے میں آکر اس بات پر بھی یقین کرلوں یا ایمان لے آؤں کہ وقت بتانے والی گھڑی ساتھ کے ساتھ ایک جیتا جاگتا بھونکنے والا شور مچانے والا کتا بھی ہے۔ ایسا سمجھنا کسی ایسے عقیدہ پر ایمان لانا نہیں ہے جو پردہ راز میں لپٹا ہوا ہو بلکہ یہ تو ایک کھلا کھلا مبرھن تناقض ہے اور تمام تر ناگواری کے باوجود جیتی مکھی کھانے کے مترادف ہے۔

جب خدا کی طرف منسوب کی جانے والی دو یا دو سے زیادہ صفات میں باہم تناقض وتضاد ہو اور جب خدا کا قول اور فعل مبینہ طور پر اس درجہ بے میل اور بے جوڑ ہو کہ دونوں میں واضح تبایُن ظاہر ہوئے بغیر نہ رہے تو پھر ان پر ایمان لانا بھید اور راز کی حدوں کو پھاندنے اور اس سے بہت آگے اور دور نکل جانے کے مترادف ہے۔ ایسا انسان راز اور بھید کے دائرہ سے نکل کر سراسر توہمات کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔ جب بعض لوگوں کا اپنے عقائد کی بنا پر توہمات کے چکر میں پھنسنا ثابت ہو جائے تو پھر توقع کے رنگ میں ان سے یہ مطالبہ کرنا ایک لازمی اور قدرتی امر ہے کہ وہ اپنے عقائد پر نظر ثانی کریں اور اپنے اعتقادات کی اصلاح کرنے پر آمادہ ہوں لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جب عیسائی پادریوں اور منادوں سے سمجھانے

کے رنگ میں بحث کی جائے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ واضح اور کھلے تضاد کے باوجود اس بات پر مصر رہتے ہیں کہ مسیح خدا ہونے کے ساتھ ساتھ انسان بھی تھا۔ انہیں اس میں سرے سے کوئی تضاد ہی نظر نہیں آتا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ اس میں بھی کوئی تناقض محسوس نہیں کرتے کہ ایک شخص بیک وقت تین اشخاص بھی ہو سکتا ہے اور پھر طرفہ تماشا یہ کہ ان تین اشخاص کے کرداروں میں حبہ برابر بھی فرق واقع نہیں ہوتا۔ وہ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ایک خدا پر ایمان لانا اور ساتھ کے ساتھ سہ شاخہ الوہیت (یعنی باپ، بیٹا اور روح القدس کی الوہیت) پر ایمان لانا کوئی ایسا اچنبہ یا عجوبہ نہیں ہے جو فی ذاتہٖ مہمل و متناقض ہو بلکہ اس کی حیثیت محض ایک راز یا غیب کی ہے۔ یہ کہہ کر وہ سمجھتے ہیں کہ اس بارہ میں کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں۔ وہ آنکھیں بند کر کے نچنت ہو جاتے ہیں اسی لئے انہیں اپنے اس دعویٰ میں کوئی تناقض نظر نہیں آتا۔ ان کے نزدیک "باپ خدا" کی ذات، اس کے اپنے بیٹے مسیح کی ذات سے اور روح القدس کی ذات سے واضح طور پر مختلف بھی ہے اور تینوں کی الوہیت یعنی تثلیث پر ایمان لانے کے باوجود بھی اس کی وحدانیت قائم و برقرار رہتی ہے۔ ان کی اس نرالی منطق پر حیرت زدہ ہو کر جب ہم انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں تو اور بھی زیادہ حیرت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ہم انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم ایک ہی شخصیت کے مختلف پہلوؤں، مزاجوں اور صفات کی نہیں بلکہ تین علیحدہ علیحدہ شخصیتوں کی اور اس امر متناقض کی بات کر رہے ہیں کہ خدا تین میں ایک اور ایک میں تین ہے۔ پھر ہم انہیں بتاتے ہیں کہ ایسے امر متناقض پر ایمان لانا ہرگز کسی راز یا غیب پر ایمان لانے کے مترادف نہیں ہے بلکہ یہ تو کھلے کھلے تضاد کو آنکھیں بند کر کے درست تسلیم کرنے والی بات ہے۔ اس پر ان کی طرف سے ایک عجیب رَدِّ عمل ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اظہار ہمدردی کے طور پر اپنے سر کو ایک خاص انداز میں جنبش دیتے ہیں اور پھر بڑے نرم لہجے میں ہم سے کہتے ہیں کہ تضادات پر بحث کرنی ہے تو کسی اور موضوع پر بات کریں۔ مراد اس سے ان کی یہ ہوتی ہے کہ "غیب" کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے تضادات کو درمیان میں نہ لائیں۔ وہ ہم سے مطالبہ کرتے ہیں کہ پہلے ہم ناقابل یقین پر آنکھ بند کر کے ایمان لائیں اور پھر ایمان لانے کے بعد اس راہ میں آگے قدم بڑھائیں تاکہ ان تضادات پر (جنہیں وہ قدرت کے بھید قرار دینے کے خواہاں ہیں) ایمان کی از خود نشو و نما ہو سکے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ پہلے سمجھے بغیر ایمان لائے اور پھر ایمان میں ترقی کرنے کی کوشش کرے۔ سو گویا اگر وہ سمجھے بغیر ایمان نہیں لاتا تو وہ مسیحی عقائد کے

ان ”ظاہری“ تضادات کی اہمیت کو سمجھ نہیں سکتا۔ خلاصہ یہ کہ جس بات کا یقین ہی نہیں آسکتا پہلے بِلاسوچے سمجھے اس پر ایمان لاؤ اور پھر ایمان لانے کے بعد ایمان کی مدد سے اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ ہے مسیحی توہمات اور لایعنی تخیلات کی دنیا جس میں داخل ہونے کی ہم غیر مسیحیوں کو نصیحت کی جاتی ہے۔ لیکن جب ہم غیر مسیحی افراد جادو کے زور پر اڑنے والے اس توہماتی قالین پر قدم رکھتے ہیں تو یہ اڑنے سے ہی انکاری ہو جاتا ہے کیونکہ قدم رکھتے ہی عقل کے بالمقابل توہمات کا جادو باطل ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

باب چہارم

صلیب اور اس سے متعلقہ امور

مسیح اور اسے صلیب دیئے جانے سے متعلق حقائق پر اپنی توجہ مرکوز کرنے سے قبل غالباً یہ بات بے محل نہ ہوگی کہ اس امر کا ذکر کر دیا جائے کہ مسیح کو صلیب دیئے جانے کے وقت اور اس کے بعد جو واقعات رونما ہوئے احمدی مسلمانوں کے نزدیک ان کی اصل حقیقت کیا ہے اور وہ ان سب واقعات کو کس نقطۂ نظر سے دیکھتے اور جانچتے ہیں۔ یہاں اس موضوع پر اختصار سے روشنی ڈالی جائے گی۔ اس پر مفصل بحث کا مرحلہ بعد میں آئے گا۔

ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ مسیح کو صلیب دینے کا مقصد کسی بھی قتل عمد کی طرح اسے جان بوجھ کر جان سے مار دینے کی ایک کوشش کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ قتل عمد میں خود صلیب کی حیثیت ایک ہتھیار یا آلہ قتل ہی کی تھی۔ لیکن فی الاصل صلیب دینے اور اسے جان سے مار دینے کی یہ کوشش اس پر موت وارد کرنے میں ناکام رہی۔ بالفاظ دیگر کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مسیح کے مخالف و معاند اسے فی الحقیقت صلیب دینے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ ہمارا یہ کہنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ قتل کی کسی اور ناکام کوشش کے متعلق بالعموم کہا جاتا ہے۔ مراد یہ کہ اگر کسی کو مارنے کی کوشش کی جائے اور وہ کوشش ناکام رہے تو محض کوشش سے یہ مطلب نہیں نکالا جاسکتا کہ جسے نشانہ بنایا گیا تھا اسے محض نشانہ بنانے سے ہی موت کے گھاٹ بھی اتار دیا گیا۔ مثال کے طور پر اگر کسی کو تلوار کے ذریعہ قتل کرنے کی کوشش کی جائے اور وہ کوشش ناکام رہے تو کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ جسے نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی اس کا کام تمام ہو گیا۔ سو احمدی مسلمانوں کی حیثیت میں ہم اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ مسیح کو جان سے مار دینے کی کوشش ضرور کی گئی تھی لیکن صلیب کی حیثیت اس ارادہ قتل کو بروئے کار لانے والے ایک ہتھیار یا ایک ذریعہ سے زیادہ نہ تھی۔ صلیب پر چند گھنٹے کی شاید اذیت برداشت کرنے کے بعد قبل اس کے کہ اس کی موت واقع ہوئی اسے گہری بیہوشی کی حالت میں صلیب پر سے اتار لیا گیا۔ صلیب پر سے اتارے جانے کے بعد رفتہ رفتہ وہ ہوش میں آگیا۔ اب ظاہر ہے کہ کسی ایسے شخص کو جسے موت کی سزا کا حق دار قرار دیا گیا ہو اور وہ کسی نہ کسی طرح موت کی سزا

پانے سے بچ نکلے تو حکومت وقت ایسے ”مجرم“ کو قانونی تحفظ فراہم نہیں کرسکتی۔ اسی طرح رومی قانون کے تحت مسیح صلیب سے بچ نکلنے کے بعد کسی لحاظ سے بھی قانونی تحفظ کا حق دار قرار نہیں پا سکتا تھا۔ اس صورت حال نے مسیح کے لئے بجز اس کے کوئی راہ نہ چھوڑی کہ وہ رومی علاقہ سے نکل کر کسی ایسے علاقے میں چلا جائے جہاں وہ آزادی سے رہ سکے۔ لیکن صرف جان کی حفاظت ہی تو مسیح کا مقصد نہیں تھا۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے تفویض کردہ ایک فرض کی ادائیگی بھی اس کے ذمہ تھی۔ پہلے سے کی گئی پیش گوئی کی رو سے وہ فرض اسی کے ذریعہ پورا ہونا تھا۔ اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑیں (مراد بعض یہودی قبائل ہیں) بابلی اور رومی حملوں کے بعد ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئی تھیں اور بکھر کر متعدد مشرقی علاقوں کی زمینوں میں پھیل گئی تھیں اور وہ بھی اپنی جگہ مسیح کی آمد ثانی کی منتظر تھیں۔ یہ ایک اور بڑی وجہ تھی جس کی رو سے مسیح کے لئے ضروری تھا کہ وہ یہودیہ کی سرزمین کو خیر باد کہہ کر ان سب علاقوں اور سرزمینوں کی طرف ہجرت کر جائے جہاں جہاں گزشتہ کئی صدیوں کے دوران یہود قبائل جا آباد ہوئے تھے۔ احمدیہ نقطۂ نظر کے بارہ میں سردست اتنا ہی بیان کر دینا کافی ہو گا۔

بعض لوگ ہم احمدیوں سے دریافت کرتے ہیں کہ اس امر کا کیا ثبوت ہے کہ مسیح صلیبی موت سے بچنے کے بعد طبعی موت سے فوت ہوا تھا۔ اب یہ امر ظاہر و باہر ہے کہ وہ کوئی جواز پیدا کیے بغیر ثبوت فراہم کرنے کی ذمہ داری بلاوجہ ہم پر عائد کر رہے ہیں۔ قدرت کے بعض مظاہر ایسے ہوتے ہیں جن سے ہما شما ہر کوئی واقف ہوتا ہے۔ حتی کہ روئے زمین کے تمام انسانوں کے مشاہدہ میں وہ آرہے ہوتے ہیں اور ان کے لیے سرے سے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ ہم سب جانتے ہیں کہ دنیا میں ایک انسان کا عرصۂ حیات حد سے حد ڈیڑھ صد سال یا اس کے لگ بھگ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ یقیناً اس ضمن میں ہزار سال یا اس سے زیادہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زمین پر کسی بھی انسان واحد کے عرصۂ حیات سے متعلق عمومیت کا حامل یہ ایک ایسا تجربہ ہے جس میں جملہ بنی نوع انسان برابر کے شریک ہیں۔ اب اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ استثناء کے رنگ میں اس قاعدہ کلیہ سے ہٹ کر کوئی بات واقع ہوئی ہے تو اس کا بار ثبوت اس استثناء پر یقین رکھنے والے کے کندھوں پر ہو گا نہ کہ اس کے کندھوں پر جو بہر طور مسلمہ قاعدہ کلیہ پر پورا پورا یقین رکھتا ہے اور کسی استثنا کا سرے سے قائل ہی نہیں ہے۔ بار ثبوت کا اطلاق تو اس مخصوص صورت حال پر ہونا چاہیے جس نے عیسائیوں کے عقیدہ کی رو سے مسیح کی زندگی اور موت کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ جو لوگ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ وہ آج تک فوت نہیں ہوا ان پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ اس کا ثبوت مہیا

کریں۔ برخلاف اس کے جن لوگوں کا دعوی یہ ہے کہ وہ لازمی طور پر فوت ہو گیا ہو گا ان کے اس دعویٰ کو قوانین قدرت کی تائید و حمایت حاصل ہے۔ ان سے پہلے سے جاری و ساری قوانین قدرت سے بڑھ کر کسی اور ثبوت کا مطالبہ کرنا سراسر بے معنی ہو گا۔ بصورت دیگر جس کا جی چاہے گا وہ یہ دعویٰ کر بیٹھے گا کہ اس کے دادا کے دادا کا دادا مرا ہی نہیں۔ اگر ایسا دعوٰی کرنے والا ہر کسی کو چیلنج دیتا پھرے کہ وہ اس کے اس دعوے کو جھوٹا ثابت کر دکھائے تو اس پر مسیحی صاحبان کا کیا ردعمل ہو گا؟ سوچنے والی بات ہے کہ ایک سننے والا ایسے نرالے اور عجیب و غریب چیلنج کا کیا جواب دے گا؟ اس کا ایک ہی جواب ہے جو وہ دے سکتا ہے اور یقیناً دے گا کہ قوانین قدرت کا ہر انسان پر لاگو ہونا ایک لازمی امر ہے۔ کسی کا ان سے بچ نکلنا ممکن ہی نہیں ۔ اگر کوئی ایسے دعوے کر رہا ہے جو قوانین قدرت کے خلاف ہیں تو ثبوت مہیا کرنے کا وہ خود ذمہ دار ہے نہ کہ کوئی اور۔ سو مسیحی صاحبان کے اعتراض یا مطالبہ کا پہلا جواب تو یہ ہے اور یہ ہے بھی واضح اور ناقابلِ تردید۔ تاہم میں ایک دوسرے نقطۂ نگاہ سے اس سارے معاملہ کو واضح کرنے کی ایک اور کوشش کرتا ہوں۔

خدا کے ساتھ مسیح کا جو بھی رشتہ تھا (یعنی عیسائیوں کے بقول وہ خدا کا بیٹا بھی تھا اور ازل سے اس میں مدغم ہونے کے باعث اپنی ذات میں خود خدا بھی تھا) سوال یہ ہے کہ کیا اس رشتہ کی رو سے مسیح مرنے اور موت کا مزہ چکھنے سے بالا تھا؟ مسیحی صاحبان کا خود اس بات پر ایمان ہے کہ مسیح فوت ہوا اور اس نے موت کا مزہ چکھا۔ خدا کا بیٹا اور خود خدا ہونے کی حیثیت میں اگر مرنا اس کی فطرت کے خلاف تھا تو پھر دوٹوک بات یہ ہے کہ اسے مرنا نہیں چاہیے تھا۔ لیکن ہم سب (یعنی مسیحی بھی اور ہم ایسے غیر مسیحی بھی) اس بات پر متفق ہیں کہ خواہ ایک بار سہی وہ مرا ضرور۔ تحقیق طلب امر صرف یہ ہے کہ وہ کب مرا؟ اس کی موت صلیب پر واقع ہوئی یا بعد میں کسی اور وقت۔ اس کے مرنے اور موت کا مزہ چکھنے میں کسی کو کوئی شبہ نہیں نہ خود مسیحیوں کو اور نہ ہم جیسے غیر مسیحی مسلمانوں کو۔

یونس نبی کا نشان

اب ہم بائبل کے رو سے ثابت کرتے ہیں کہ خدا نے مسیح کو بے آسرا نہیں چھوڑا اور اسے صلیبی موت سے بہر طور بچائے رکھا۔ یہ ایک ایسا واضح امر ہے کہ اس کا مطالعہ جیسا کہ عہد نامہ جدید میں مذکور ہے صلیب دیئے جانے سے پہلے کے زمانہ سے تعلق رکھنے والے حقائق کی روشنی میں بھی کیا جاسکتا ہے اور اسی

طرح خود مسیح کو صلیب دیئے جانے اور اس کے معاً بعد کے حقائق کی روشنی میں اسے اچھی طرح جانچا اور پر کھا جاسکتا ہے۔

واقعۂ صلیب سے بہت پہلے ہی مسیح نے وعدہ کے رنگ میں کہا تھا کہ یونس نبی کے نشان کے سوا اس زمانہ کے لوگوں کو اور کوئی نشان نہیں دکھایا جائے گا۔ چنانچہ عہد نامہ جدید میں مذکور ہے:

"اس پر بعض فقیہوں اور فریسیوں نے جواب میں اس سے کہا اے استاد! ہم تجھ سے ایک نشان دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس نے جواب دے کر ان سے کہا اس زمانہ کے برے اور زناکار لوگ نشان طلب کرتے ہیں مگر یوناہ نبی کے نشان کے سوا کوئی اور نشان ان کو نہ دیا جائے گا۔ کیونکہ جیسے یوناہ(یونس) تین دن رات مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسے ہی ابن آدم تین دن رات زمین کے اندر رہے گا۔ نینوہ کے لوگ عدالت کے دن اس زمانہ کے لوگوں کے ساتھ کھڑے ہو کر ان کو مجرم ٹھہرائیں گے کیونکہ انہوں (نینوہ کے لوگوں) نے یوناہ کی منادی پر توبہ کر لی اور دیکھو یہاں وہ ہے کہ جو یوناہ سے بھی بڑا ہے۔"

(متی باب12 آیات38تا41)

سو قبل اس کے کہ ہم یہ طے کریں کہ مسیح کے ساتھ کیا گزری ہمیں پہلے یہ جاننا اور سمجھنا چاہیے کہ یونس نبی پر کیا بیتی تھی۔ کیونکہ مسیح نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اب بھی وہی معجزہ دہرایا جائے گا۔ یونس نبی کو جو نشان دیا گیا تھا وہ کیا تھا؟ کیا وہ مچھلی کے پیٹ میں مر گیا تھا اور بعد ازاں مر کر دوبارہ جی اٹھا تھا؟ تمام کے تمام عیسائی، یہودی اور مسلمان علماء اس بات پر متفق ہیں کہ یونس مچھلی کے پیٹ میں مرا نہیں تھا وہ زندگی اور موت کے درمیان امید و بیم کی حالت میں معلق رہا۔ اس خطرناک صورت حال سے اسے معجزانہ طور پر بچا لیا گیا وگرنہ کوئی اور شخص ہوتا تو ایسی حالت میں موت سے نہ بچ سکتا اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ خدائی حکم کے تحت انسانی فہم و ادراک سے بالا بعض قوانین قدرت کی کارفرمائی نے اسے موت کے منہ میں جانے سے بچا لیا۔ یاد رہے اس وقت یہ امر زیرِ بحث نہیں ہے کہ ایسا ہونا ممکن تھا یا نہیں۔ ہم صرف یہ بتا رہے ہیں کہ مسیح نے جب یہ کہا تھا کہ اس کے اپنے ساتھ بھی وہی کچھ ہو گا جو یونس کے ساتھ ہوا تھا تو اس سے اس کی مراد یہی ہو سکتی تھی کہ ہر شخص کی نگاہ میں جو یونس کے ساتھ ہوا تھا وہی کچھ مسیح کے معاملہ میں بھی ہو گا۔ پوری دنیائے یہودیت میں (اس سے مراد خواہ یہودیہ کی سرزمین لے لیں اور خواہ اس میں ان تمام علاقوں کو بھی شامل کر لیں جن میں پھیل کر یہودی جا آباد ہوئے تھے) کسی ایک یہودی نے بھی مسیح کے اس

دعوے کا کوئی اور مطلب نہیں لیا ہو گا۔ وہ سب اس بات پر ایمان رکھتے تھے کہ یونس کسی نہ کسی طرح معجزانہ طور پر مچھلی کے پیٹ میں تین دن رات زندہ رہا اور اس عرصہ میں ایک لمحہ کیلئے بھی اس پر موت وارد نہیں ہوئی۔ یہ صحیح ہے کہ ہم اس یہودی نظریہ کے بارہ میں اپنے تحفظات رکھتے ہیں اور اسے حرف بحرف درست تسلیم نہیں کرتے کیونکہ قرآن میں یونس نبی کا جو واقعہ بیان ہوا ہے اس میں کہیں بھی اس امر کا ذکر نہیں ہے کہ یونس نبی تین دن رات مچھلی کے پیٹ میں آزمائشوں میں سے گزرتا اور دکھ جھیلتا رہا۔ بہر حال اب ہم زیر غور نقطہ یا مسئلہ کی طرف لوٹتے ہیں اور ان مشابہتوں کی طرف آتے ہیں جو مسیح اور یونس کے درمیان پائی جاتی ہیں اور جن کی طرف مسیح نے اپنی پیش گوئی میں اشارہ کیا تھا۔ ان مشابہتوں کے ضمن میں واضح طور پر تین دن رات نہایت تشویش انگیز اور تکلیف دہ حالات میں گزارنے اور قریب قریب موت کی سی حالت سے معجزانہ طور پر زندہ بچ نکلنے کا ذکر کیا گیا تھا۔ ایک دفعہ مرنے اور پھر دوبارہ جی اٹھنے کا اس میں سرے سے کوئی ذکر نہ تھا۔ مسیح نے صرف یہی دعوٰی کیا تھا کہ اس کے اپنے ساتھ بھی وہی کچھ ہو گا جو یونس کے ساتھ ہوا تھا۔

اسرائیل کے گھرانہ سے مسیح کا وعدہ یا پیمان

شہادت کا دوسرا اہم جزو یہ ہے کہ مسیح نے اپنے لوگوں کو بتایا تھا کہ اسرائیل کے گھرانے کی صرف وہی بھیڑیں نہیں ہیں جو یہودیہ میں اور اس کے ارد گرد آباد ہیں اور یہ کہ وہ خدا کی طرف سے صرف ان بھیڑوں کیلئے ہی نہیں بھیجا گیا ہے بلکہ ان دوسری بھیڑوں کی طرف بھی بھیجا گیا ہے جو یہودیہ اور اس کے آس پاس کے علاقہ میں نہیں بلکہ دور دراز کے علاقوں میں آباد ہیں لیکن وہ ہیں اسی گلہ کی بھیڑیں۔ جس طرح وہ ان کی (یعنی یہودیہ اور اس کے آس پاس رہنے والی بھیڑوں کی) نجات اور بحالی کیلئے آیا ہے اسی طرح وہ بنی اسرائیل کی ان دوسری بھیڑوں کے پاس بھی جائے گا اور ان کی نجات اور بحالی کے سامان بھی کرے گا۔ چنانچہ انجیل میں مسیح کا یہ قول مذکور ہے:

> ”اور میری اور بھی بھیڑیں ہیں جو اس بھیڑ خانہ کی نہیں۔ مجھے ان کو بھی لانا ضرور ہے اور وہ میری آواز سنیں گی۔ پھر ایک ہی گلہ ہو گا اور ایک ہی چرواہا ہو گا۔“
>
> (یوحنا باب 10 آیت 16)

یہ بات ہر کسی کے علم میں ہے کہ مسیح نے اپنے اس وعدے اور واقعہ صلیب کے درمیانی عرصہ میں کسی اور علاقہ میں جانے کیلئے یہودیہ کی سرزمین کو کبھی خیر باد نہیں کہا۔ وہ وہیں رہا تاوقتیکہ صلیب دیئے

جانے کا واقعہ پیش نہ آ گیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مسیح کو دائمی طور پر آسمان کی طرف اٹھا لیا گیا تھا تو کیا بنی اسرائیل کی گم شدہ بھیڑیں پہلے ہی آسمان کی طرف اٹھائی جا چکی تھیں؟ عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ صلیب پر سے مردہ حالت میں اتارے جانے کے بعد تین دن اور تین راتیں گزارنے پر اس کی روح اس کے جسم میں واپس آئی اور پھر وہ بادلوں میں چڑھتا ہوا نظر آیا اور اس طرح آسمان کے نہال خانوں میں واپس لوٹ کر غائب ہو گیا۔ تاکہ بالآخر اپنے باپ کے تخت تک پہنچ کر دائمی طور پر اس کے دائیں ہاتھ جا کر براجمان ہو۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو ہم یقیناً بہت ہی پیچیدہ نوعیت کی دوہری مشکل میں پھنسے بغیر نہ رہیں گے۔ ہمیں دو موقفوں میں سے ایک موقف یا بالفاظ دیگر پیش آمدہ حالات کی دو صورتوں میں سے ایک صورت کا انتخاب کرنا ہوگا۔ ایک صورت حال تو وہ ہے جو خود مسیح نے اختیار کی۔ دوسری صورت حال وہ ہے جسے اس کے پیروؤں یا ماننے والوں نے اختیار کیا اور اپنایا۔ احوال و واقعات کی دونوں صورتیں ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ کیسا ہی مفاہمانہ انداز کیوں نہ اختیار کیا جائے دونوں میں مطابقت کی کوئی راہ نکل ہی نہیں سکتی۔ اگر ہم دونوں صورت ہائے احوال میں سے ایک کو اختیار کرتے ہیں تو دوسری صورت کی نفی لازم آئے بغیر نہیں رہتی۔ اگر مسیح اپنے وعدہ میں سچا تھا اور ہم ایمان رکھتے ہیں کہ وہ یقیناً سچا تھا تو پھر آسمان پر چڑھنے سے پہلے اسے اپنے وعدہ کا پاس کرنا چاہیے تھا۔ اسے اپنے "باپ خدا" سے مزید وقت طلب کرنا چاہیے تھا تاکہ وہ زمین پر اتنا طویل عرصہ مزید گزار سکے کہ وہ ان ممالک میں جا سکے جہاں بنی اسرائیل کے بعض قبائل قبل ازیں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ وہ اپنے وعدہ کو توڑے اور اعتماد کو خاک میں ملائے بغیر اور بیک وقت مکمل خدا اور مکمل انسان ہونے کی اپنی حیثیت کو داغدار کئے اور اسے ناقابل تلافی نقصان پہنچائے بغیر آسمان پر جا ہی نہیں سکتا تھا۔ برخلاف اس کے اگر عیسائی علماء کی بات کو درست تسلیم کر لیا جائے کہ مسیح واقعی اپنے اس عہد و پیمان کو اس نے جو اسرائیل کے گھرانے سے کیا تھا بھلا بیٹھا اور سب کچھ نسیاً منسیا کر کے سیدھا آسمان کی طرف روانہ ہو گیا تو ایسی صورت میں بڑے بوجھل دل اور مجرم ضمیر کے ساتھ ہمیں مسیحی علماء کو سچا ماننا پڑے گا۔ ہماری اس مجرمانہ تائید سے مسیحی علماء تو بزعم خود سچے بن جائیں گے لیکن افسوس! صد افسوس! اندریں صورت بائبل اور مسیحیت دونوں جھوٹے ثابت ہوئے بغیر نہ رہیں گے۔ وجہ ظاہر ہے۔ اگر مسیح کا اپنے وعدے میں جھوٹا ہونا ثابت ہو جائے تو عیسائیت کسی طور بھی صداقت پر مبنی نہیں ہو سکتی۔ ہم احمدی مسلمان اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ مسیح خدا کا سچا نبی تھا۔ وہ جھوٹا وعدہ یا جھوٹا عہد و پیمان کر ہی نہیں سکتا تھا۔ کھوئی ہوئی بھیڑوں سے مراد بنی اسرائیل کے وہ دس قبائل تھے جو بہت پہلے یہودیہ سے

ہجرت کر کے دور دراز کے مشرقی خطوں میں جا آباد ہوئے تھے۔ لہٰذا اس کے وعدہ میں یہ بات اشارۃ النص کے طور پر مضمر تھی کہ وہ صلیب پر نہیں مرے گا بلکہ اسے لمبی زندگی عطا کی جائے گی تا کہ وہ اپنے مشن اور غرض بعثت کو پورا کر سکے اور یہ کہ وہ صرف بنی اسرائیل کے ان دو قبائل کی طرف ہی نبی بنا کر نہیں بھیجا گیا تھا جو خود اس کے گردونواح میں رہ رہے تھے بلکہ اسے دور دراز علاقوں میں پھیلے ہوئے جملہ بنی اسرائیل کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا تھا۔ مذکورہ بالا دونوں شہادتیں مجموعی طور پر بہت مثبت انداز میں اس امر کی حتمی نشان دہی کرتی ہیں کہ واقعۂ صلیب کے بعد مسیح پر کیا گزرنا تھی اور اس کے ساتھ کیا کچھ پیش آنا تھا۔

صلیب دیئے جانے کے واقعات

جہاں تک مسیح کو صلیب دیئے جانے کے واقعات کا تعلق ہے ان کے ضمن میں ایک نکتہ خاص طور پر قابل غور ہے۔ اس نکتہ کا تعلق اس امر سے ہے کہ پیلاطوس نے مسیح کو صلیب دینے کے لئے دن اور وقت کیا مقرر کیا۔ مزید برآں دن اور وقت مقرر کیے جانے سے قبل بعض ایسی باتیں اور امور مطالعہ میں آتے ہیں جن سے ایک انسان بآسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ ان باتوں اور امور نے اس کے آخری فیصلہ میں اہم کردار ادا کیا ہو گا۔ خود عہد نامہ جدید کی رو سے سب سے پہلی بات تو ہمارے علم میں یہ آتی ہے کہ پیلاطوس کی بیوی ایک خواب کی بناء پر جو اس نے ایک رات قبل ہی دیکھا تھا اس بات کی شدید خلاف تھی کہ اس کا شوہر مسیح کو مجرم گردان کر اس کے خلاف فیصلہ دے۔ وہ اپنے اس خواب کی وجہ سے بہت خوف زدہ تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ مسیح سراسر بے گناہ اور بے قصور ہے۔ اسے اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آیا کہ وہ خواب کے پیغام کو اپنے شوہر تک پہنچانے کے لئے عدالت کی کاروائی میں مداخلت کرے۔ (متی باب 27 آیت 19)۔ غالباً یہ اس کی بیوی کا فوری احتجاج ہی تھا جس کے زیر اثر اس نے (پیلاطوس نے) مسیح کو صلیب دیئے جانے کی ذمہ داری سے اپنے آپ کو علی الاعلان بری ظاہر کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ بائبل میں مذکور ہے:

> ”جب پیلاطوس نے دیکھا کہ کچھ بن نہیں پڑتا بلکہ الٹا بلوا ہوتا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا میں اس راستباز کے خون سے بری الذمہ ہوں تم جانو“۔ یعنی اس نے کہا اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے“
>
> (متی باب 27 آیت 24)

پیلاطوس کا ایسا کرنا اس اعتراف کے مترادف تھا کہ مسیح یقیناً بے گناہ ہے اور اسے ایسے بے گناہ کے خلاف جو فیصلہ دینا پڑا ہے وہ یہودیوں کے ناجائز دباؤ میں آکر دینا پڑا ہے۔ عہد نامہ جدید سے یہ بات بالکل

واضح ہے کہ طاقتور یہودی جمعیت نے مسیح کے خلاف گندی ذہنیت اور بری نیت کا آئینہ دار درپردہ ایک محاذ قائم کرر کھا تھا اور وہ اسے بہر حالت سزا دلوانے پر تلے ہوئے تھے۔ اندریں صورت اگر پیلاطوس کوئی ایسا فیصلہ دیتا جو حق و انصاف کے عین مطابق ہونے کے باوجود یہودیوں کی مرضی اور خواہش کے خلاف ہوتا تو امن و امان کے نقطۂ نگاہ سے بہت سنگین صورت پیدا ہو سکتی تھی۔ یہ تھی مجبوری جس نے ایک طرح سے پیلاطوس کے ہاتھ باندھ کرر کھ دیئے۔ چنانچہ اس کے ہاتھ دھونے سے اس کی یہ مجبوری اظہر من الشمس ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ پیلاطوس نے مسیح کو بچانے کی ایک کوشش اور بھی کی۔ اس نے یہودیوں کے بپھرے ہوئے غضب ناک مجمع کے سامنے ایک متبادل تجویز رکھی اور وہ یہ تھی کہ وہ اپنی عید فسح کی وجہ سے یا تو بدنام زمانہ مجرم براباناامی کی جان بخشی کرا لیں یا مسیح کو موت کے منہ میں جانے سے بچا لیں (متی باب 27 آیت 16 تا 17)۔ یہ بات ایک کھلا اشارہ مہیا کرتی ہے جس سے یہ امر واضح ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ اس وقت پیلاطوس ایک ذہنی خلجان میں مبتلا تھا۔ وہ واضح طور پر مسیح کو سزا دینے کے خلاف تھا۔ یہ تھی اس کی نفسیاتی حالت جس کے تحت اس نے صلیب دیئے جانے کے لئے ایک تو جمعہ کا دن مقرر کیا اور لکھا کہ اسے اس روز سہ پہر کے وقت صلیب پر لٹکایا جائے۔ فی الحقیقت جو کچھ وقوع میں آیا اس سے یہ یقین کرنے کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ تاریخ اور وقت کی تعین اس نے ایک خاص مقصد کے پیش نظر کی کیونکہ سبت کی رات جمعہ کی سہ پہر سے زیادہ دور نہیں تھی اور قانون کے محافظ کی حیثیت سے وہ اس بات سے اچھی طرح باخبر تھا کہ سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی سبت کا دن شروع ہو جاتا ہے اور سبت کا دن شروع ہونے سے پہلے پہلے مسیح کے جسم کو صلیب سے اتارنا لازمی ہوگا اور من و عن ہوا بھی یہی۔ ایک سزا یافتہ مجرم کو عذاب دے دے کر مارنے کے لیے بالعموم تین دن رات کا عرصہ درکار ہوتا تھا۔ یہ طریق اختیار کرنے سے (یعنی جمعہ کا دن اور سہ پہر کا وقت مقرر کرنے کی وجہ سے) صلیب پر لٹکے رہنے کے عرصہ کو مسیح کے لئے زیادہ سے زیادہ چند گھنٹوں تک محدود کر دیا گیا۔ ایک انسان حیرت میں پڑے بغیر نہیں رہتا کہ مسیح جیسے صحت مند انسان کی جان لینے کے لیے جسے سخت اخلاقی حدود قیود کی پابندی اور سادہ طرز معاشرت نے جسمانی طور پر بہت مضبوط بنا دیا تھا چند گھنٹے کب کافی ہو سکتے تھے۔

مسیح کے ساتھ یہ جو کچھ ہوا کیا یہ یونس نبی کے تمثیل نما عقدہ کو حل کرنے کے لئے ایک کنجی یا مفتاح کا کام نہیں دے سکتا؟ اس زمانہ میں موت کی سزا پانے والے کے لئے عام دستور یہ تھا کہ وہ تین دن رات مسلسل صلیب پر لٹکا رہے۔ اس بات سے ایک خیال انسان کے ذہن میں ابھر کر گھنٹی کی آواز کی طرح گونج

اٹھتا ہے کہ اس سے تو مسیح اور یونس نبی کے مابین پائی جانے والی مماثلت کی اصل نوعیت ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ یونس نبی کے متعلق فرض یہ کر لیا گیا ہے کہ وہ تین دن رات مچھلی کے جسم کے اندر رہا۔ عین ممکن ہے کہ اسے بھی مسیح کی طرح خدا کی مخفی تدبیر کے بموجب تین دن کی بجائے تین گھنٹے میں چھٹکارا مل گیا ہو۔ پس جو کچھ مسیح پر بیتی یا اس کے ساتھ ہوا اس کی حیثیت ایک آئینہ کی سی ہے جس میں ہم یونس نبی کے واقعہ کو عملاً دہرائے جانے کے رنگ میں منعکس ہوتا دیکھ سکتے ہیں۔

اب ہم مسیح کو صلیب دیئے جانے کے دوران پیش آنے والے واقعات کی طرف لوٹتے ہیں۔ یہ امر ظاہر و باہر ہے کہ مسیح آخری لمحہ تک ایک رنگ میں اپنے اس احتجاج پر قائم رہا کہ "ایلی ایلی لما شبقتنی" یعنی اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ کتنا گہرا المناک اور کتنا پر درد اظہار ہے اس غلط فہمی کا جس میں مسیح مبتلا تھا۔ مسیح کے اس پر درد اظہار میں کس قدر دقیقہ سنجی اور باریک بینی کے رنگ میں کسی ایسے وعدہ اور یقین دہانی کی طرف اشارہ مضمر ہے جو "باپ خدا" نے کسی وقت "بیٹے" سے کیا ہو گا۔ بصورت دیگر افسوس اور ملال کا یہ اظہار بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر اسے محض اظہار ملال قرار دیا جائے تو اس سے دو باتوں کی نفی لازم آتی ہے۔ اول اس امر کی کہ مسیح نے خود اپنی خواہش اور مرضی سے رضاکارانہ طور پر دوسرے لوگوں کے گناہوں کا بوجھ اپنے کندھوں ہر اٹھایا۔ دوسرے نفی لازم آتی ہے اس امر کی بھی کہ دکھ اور مصیبت کی اس گھڑی میں اس نے مردانگی اور خوش دلی سے موت کا سامنا کیا۔ اس سارے معاملہ کا جائزہ لیا جائے تو پہلی بات جو ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ جب مسیح نے سزا بھگتنے پر بخوشی آمادگی کا اظہار کر کے اس سزا کے لئے خود اپنے آپ کو پیش کیا تھا تو گہری آہ کے رنگ میں اس کے منہ سے یہ یاس انگیز چیخ کیوں نکلی؟ پھر مزید یہ کہ ایسی صورت میں شکوہ سنجی اور طعنہ زنی کی نوبت کیوں آئی؟ اور پھر اس مصیبت سے چھٹکارے کے لئے دعا ہی کیوں مانگی؟ برضا اور غبت رضاکارانہ طور پر پیش کی جانے والی قربانی کے پیش نظر اس کی تو سرے سے نوبت ہی نہیں آنی چاہیے تھی۔ اور صلیب دیئے جانے سے قبل جو کچھ وقوع میں آیا اس کے سیاق و سباق میں بھی دیکھا جائے تو بھی یہ سوال اپنی جگہ قائم رہتا ہے کیونکہ لکھا ہے کہ وہ تمام وقت خدا سے مسلسل یہی دعا مانگتا رہا کہ تلخ پیالہ اس سے ٹل جائے اور یہ کڑوا گھونٹ اسے حلق سے نہ اتارنا پڑے۔

ہم احمدی ہونے کی حیثیت میں اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ مسیح ایک مقدس، نیک اور پارسا انسان تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ اس کڑے وقت میں مصیبت سے چھٹکارے کے لئے اس نے جو دعا مانگی تھی خدا اسے

قبول نہ فرماتا۔ خدا کی طرف سے اسے ضرور بتادیا گیا ہو گا کہ اس کی دعا قبول کرلی گئی ہے۔ میں اس بات کو قطعاً تسلیم نہیں کرتا کہ آخری سانس مسیح نے صلیب پر لیا اور صلیب پر لٹکی ہوئی حالت میں اس نے جان دی۔ میرے نزدیک اس سارے واقعہ میں جیسا کہ میں سمجھتا ہوں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ اس میں پوری پوری ہم آہنگی اور مکمل مطابقت پائی جاتی ہے۔ مسیح کی مزعومہ موت کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہ تھی کہ موقع پر موجود ایک شخص نے یہ تاثر لیا کہ گویا وہ مر گیا ہے۔ جس شخص نے اس کی طرف دیکھا اور یہ تاثر لیا وہ کوئی معالج یا حکیم نہ تھا اور نہ اسے مسیح کے جسم کا طبّی نقطۂ نگاہ سے معائنہ کرنے کا موقع ملا۔ ایک شخص جو وہاں کھڑا دیکھ رہا تھا اور جسے یہ فکر اور تشویش لاحق تھی کہ کہیں اس کے محبوب آقا کو موت نہ آلے اس نے دیکھا کہ مسیح کا سر ایک طرف ڈھلک گیا ہے اور اس کی ٹھوڑی اس کے سینہ پر آٹکی ہے تو یک لخت یہ تاسف بھرا کلمہ اس کے منہ سے نکلا"لو دیکھو اس نے جان دے دی"لیکن جیسا کہ ہم پہلے واضح کر چکے ہیں کہ ہماری معروضات کی حیثیت کسی ایسے مقالہ کی نہیں ہے جس میں ہم اسناد کی رو سے بائبل کے بیان پر جرح کریں اور اس کے اصلی یا موضوع ہونے پر بحث کریں یا اس کی کسی تشریح و توضیح کو موضوع بحث بنائیں۔ ہمارا مقصد تو مسیحی فلاسفی اور عقیدہ کا عقل اور منطق کی رو سے صرف تنقیدی جائزہ لینا ہے۔

اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو دونوں صورتوں میں یعنی اس صورت میں بھی کہ مسیح پر بے ہوشی طاری ہوئی اور اس صورت میں بھی کہ موت نے اسے آلیا ایک بات بالکل واضح ہے کہ بنظر ظاہر جو کچھ ہونے والا تھا اس پر مسیح کا دکھ بھرے دل کے ساتھ حیران ہونا اس امر پر دال ہے کہ جو کچھ ہو رہا تھا وہ اس کی توقع کے خلاف تھا۔ اس کے نزدیک تو ماسوا اس کے کچھ اور ہی متوقع تھا۔ اگر وہ برضا و رغبت موت کا ہی متلاشی تھا اور بہر صورت و بہر حال مرنا ہی اس کے مد نظر تھا تو پھر اس نے جس حیرت کا اظہار کیا اس کا سرے سے کوئی جواز بنتا ہی نہیں۔ احمدی مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارے نزدیک اس تمام صورت حال کی تشریح و توضیح ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اس وقت حیران ہونے کی وجہ یہ تھی کہ واقعۂ صلیب سے قبل کی رات اس کی مناجاتوں اور التجاؤں کے نتیجہ میں خدا نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اسے صلیبی موت سے بچایا جائے گا اور وہ اس سے محفوظ رہے گا۔ اس وعدہ کے باوصف خدا کی وَراءُ الوراتدبیر کچھ اور تھی۔ اس نے صلیب پر لٹکی ہوئی حالت میں مسیح پر بے ہوشی طاری ہونے دی تا کہ پہرہ دار جنہیں وہاں خاص طور پر متعین کیا گیا تھا وہ مغالطہ میں پڑ جائیں اور یہ سمجھ بیٹھیں کہ وہ مر گیا ہے اور اس کی نعش کو یوسف آف آرمتیاہ نامی شخص کے حوالہ کر دیں کہ وہ اس نعش کو اس کے عزیزوں اور دوستوں تک پہنچا دے۔ اس موقع

پر حیرت جو ہمارے مشاہدہ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ جب مسیح کی موت کی خبر پیلاطوس کو پہنچائی گئی تو اس نے بھی مسیح کی طرح ہی تعجب کا اظہار کیا وہ بہت حیران ہو کر بولا کہ ہائیں وہ اتنی جلدی مر گیا (مرقس باب 15 آیت 44)۔ یہودیہ میں اپنی گورنری کے عرصہ کے دوران اسے مجرموں کو صلیب دیئے جانے اور صلیب پر لٹکی ہوئی حالت میں ان کے مرنے کا کافی لمبا تجربہ ہو گا۔ وہ حیرت کا اظہار نہیں کر سکتا تھا جب تک کہ اسے یقین نہ ہو تا کہ چند گھنٹوں کے اندر اندر ہی ایک مصلوب پر موت کا وارد ہونا ایک غیر معمولی بات ہے۔ اس کے باوجود پر اسرار حالات کے تحت ہی اسے نعش یوسف آف آرمتیاہ کے سپرد کرنے کی درخواست منظور کرنا پڑی۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ شروع ہی سے اس پر یہ الزام عائد کیا جاتا رہا کہ وہ مسیح کو سزا سے بچانے کی سازش میں شریک تھا۔ الزام اس پر یہ لگایا گیا تھا کہ اپنی بیوی کے اثر میں آکر اس نے اس بات کا بطور خاص خیال رکھا کہ مسیح کو صلیب پر ایسے وقت میں لٹکایا جائے جو سبت کا دن شروع ہونے کے بہت قریب ہو۔ دوسرے یہ کہ اس نے مسیح کی موت بہت جلد واقع ہونے کی مشکوک اطلاعات ملنے کے باوجود اس کی نعش ورثا کے حوالہ کرنے کی فوراً منظوری دے دی۔ پیلاطوس کے اس فیصلہ پر یہودیوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے اس کی خدمت میں ایک خدمت گزاری جس میں مسیح کے فی الواقعہ وفات پا جانے کے متعلق شکوک و شبہات کا ذکر کیا گیا تھا۔

(متی باب 27 آیت 62 تا 66)

بائبل کے بیان سے ہمیں یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ جب مسیح کا جسم صلیب پر سے اتارا گیا تو عام دستور کے خلاف اس کی ٹانگیں نہیں توڑی گئیں برخلاف اس کے جن دو چوروں کو مسیح کے ساتھ صلیب دی گئی تھی ان کی ٹانگیں توڑ کر باقاعدہ تسلی کی گئی کہ فی الحقیقت ان کی موت واقع ہو گئی تھی اور ان کے زندہ رہنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا (یوحنا باب 19 آیت 31 تا 32) مزید بر آں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ بائبل کی رو سے جب مسیح کے پہلو میں بھالا گھونپا گیا تو یکدم ہی خون اور پانی تیزی سے بہہ نکلا۔ چنانچہ خود انجیل میں لکھا ہے:

> ”لیکن جب انہوں نے یسوع کے پاس آکر دیکھا کہ وہ مر چکا ہے تو اس کی ٹانگیں نہ توڑیں مگر ان میں سے ایک سپاہی نے بھالے سے اس کی پسلی چھیدی اور فی الفور اس سے خون اور پانی بہہ نکلا“
>
> (یوحنا باب 19 آیات 33،34)

اگر مسیح واقعی مر چکا تھا اور اس کے دل کی دھڑکن مکمل طور پر بند ہو گئی تھی تو خون کی ایسی روانی کہ

جس کے نتیجہ میں خون فی الفور فوارہ کی طرح بہہ نکلے ممکن ہی نہ ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا تھا کہ منجمد خون اور خون کے خلیے سنبھالنے والا سیال مادہ بہت آہستگی اور سست رفتاری سے رستا ہوا باہر نکلتا۔ لیکن عہد نامہ جدید سے تو یہ تصویر نہیں ابھرتی۔ انجیل تو کہتی ہے کہ خون اور پانی تیزی سے فی الفور باہر ابل پڑے۔ جہاں تک پانی کے نکلنے کا تعلق ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ صلیب پر انتہائی کشیدہ حالت اور تکلیف دہ آزمائش کے ان گھنٹوں کے دوران پلورسی (یعنی ذات لجنب یعنی سینہ کے اعضا اور پھیپھڑوں کی جھلی میں سوزش کی وجہ سے پانی بھرنے کی بیماری) رونما ہو گئی ہو۔ عین ممکن ہے کہ صلیب پر لٹکے رہنے کے جسمانی دباؤ کی وجہ سے جھلی میں جمع شدہ پانی بھی ساتھ ہی باہر نکل آیا ہو۔ یہ صورت حال عام حالات میں بہت تکلیف دہ اور خطرناک ہوتی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کے لیے یہ صورت ایک لحاظ سے مفید ثابت ہوئی کیونکہ جب اس کے پہلو کو بھالے سے چھیدا گیا تو سوجی ہوئی اور پانی سے بھری ہوئی جھلی نے ایک نرم گدی کا کام دیا ہو گا اور اس طرح سینہ کے اعضا چھیدے جانے سے محفوظ رہے ہوں گے۔ خون کی آمیزش والا پانی بڑی تیزی سے اس لیے بہہ نکلا کہ دل صحیح طور پر کام کر رہا تھا۔

مسیح کے اس وقت زندہ ہونے کی ایک شہادت اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ بائبل کے بیان کے مطابق جب مسیح کا جسم یوسف آف آرمتیاہ کے سپرد کیا گیا تو اسے فوراً ایک خفیہ جگہ میں منتقل کر دیا گیا۔ وہ مرقد نما ایک کشادہ جگہ تھی۔ اس کے اندر نہ صرف مسیح کے جسم کو رکھنے کی گنجائش تھی بلکہ اس کے اندر اتنی وافر جگہ اور بھی موجود تھی کہ دو اور آدمی بھی اس کے پاس بیٹھ کر اس کی خبر گیری کر سکتے تھے۔ چنانچہ انجیل میں لکھا ہے:

> ”پس تب شاگرد اپنے گھروں کو واپس چلے گئے لیکن مریم مقبرہ کے باہر کھڑی روتی رہی اور جب روتے روتے مقبرہ کی طرف جھک کر اندر نظر کی تو دو فرشتوں کو سفید پوشاک پہنے ہوئے دیکھا جہاں یسوع کی لاش پڑی تھی۔“

(یوحنا باب 20 آیت 10 تا 12)

بات اتنی ہی نہیں ہے۔ عہد نامہ جدید کی عبارت ہمیں اس امر سے بھی مطلع کرتی ہے کہ ایک مرہم جو پہلے سے تیار کیا ہوا تھا مسیح کے زخموں پر لگایا گیا۔ (یوحنا باب 19 آیت 40,39) یہ جسے مسیح کے شاگردوں نے تیار کیا تھا مختلف دواؤں کے ایسے اجزا پر مشتمل تھا جو زخموں کو مندمل کرنے اور درد کی تکلیف کو دور کرنے کی خاصیت اپنے اندر رکھتے تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دواؤں کے دو چار نہیں بارہ اجزا جمع

کرنے کی یہ مشقت طلب دوڑ دھوپ آخر کس لئے تھی؟ آخر اس کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی؟ اس وقت جو نسخہ استعمال کیا گیا تھا وہ طب سے متعلق بو علی سینا کی مشہور کتاب "القانون" میں درج ہے۔ (ایسی کتابوں کی فہرست کے لئے ملاحظہ ہو ضمیمہ نمبر 1)۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ ایک مردہ جسم کے زخموں پر مرہم لگانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ یہ بات صرف اس صورت میں قابل فہم قرار پا سکتی ہے کہ شاگردوں کے لئے یہ یقین کرنے کی مضبوط وجوہات موجود تھیں کہ مسیح کو صلیب پر سے مردہ حالت میں نہیں بلکہ زندہ حالت میں اتار لیا جائے گا۔ مسیح کے حواریوں میں سے اکیلا یوحنا ہی ایک ایسا حواری ہے جس نے مرہم تیار کرنے اور اسے مسیح کے جسم پر ملنے کے جواز کے رنگ میں کچھ نہ کچھ وضاحت پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے بھی اس امر کی مزید تائید ہوتی ہے کہ مردہ جسم پر مرہم لگانے کا عمل ایک عجیب و غریب حرکت کے مترادف تھا۔ اور جس کی کوئی توجیہہ ان لوگوں کے سامنے پیش نہیں کی جا سکتی تھی جنہیں یقین تھا کہ جب مرہم لگایا گیا تو مسیح مر چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یوحنا حواری کو لوگوں کو مطمئن کرنے کی خاطر وضاحت پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وضاحت تو کیا کر سکتا تھا اس نے باور یہ کرانے کی کوشش کی ہے کہ یہودیوں میں یہ رسم رائج تھی کہ وہ فوت ہو جانے والوں کے مردہ جسم پر مرہم یا اس قسم کی کوئی اور دوا ملا کرتے تھے۔ یہ بات توجہ طلب ہے اور ہے بھی بہت اہم کہ زمانہ جدید کے تمام سکالرز جنہوں نے اس بارہ تحقیق کی ہے اس بات پر متفق ہیں کہ یوحنا یہودی النسل نہیں تھا اور اس کی مذکورہ بالا وضاحت سے ہی اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ یہ بات یقینی طور پر سب کو معلوم ہے کہ یہودیوں یا اسرائیل کی اولاد اور نسل میں یہ طریق ہی رائج نہیں تھا کہ وہ اپنے مرنے والوں کے مردہ جسموں پر مرہم یا سرے سے کوئی اور چیز ملیں۔ جبھی تو محققین کا نظریہ یہ ہے کہ یوحنا حواری لازماً یہودی النسل نہ تھا۔ اگر وہ یہودی النسل ہوتا تو یہودیوں کے رسم و رواج سے اس درجہ نابلد نہ ہوتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ مرہم لگانے کی یقیناً کوئی اور وجہ تھی۔

مرہم فی الاصل لگایا ہی اس لئے گیا تھا تا کہ مسیح کو جو قریب المرگ نظر آتا تھا زندہ حالت میں بچایا جا سکے۔ مرہم لگانے کی وضاحت صرف ایک ہی ہے اور وہ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ نہ حواریوں کو یہ توقع تھی کہ مسیح مر جائے گا اور نہ فی الحقیقت صلیب پر اس کی موت واقع ہوئی۔ صلیب پر سے اتارے جانے والے مسیح کے جسم پر زندگی کے مثبت آثار ظاہر ہوئے ہوں گے۔ بصورت دیگر ان لوگوں کی طرف سے جنہوں نے مردہ جسم پر مرہم لگایا ایسا لایعنی کام کرنا انتہائی نامعقول، سراسر ناروا اور لغو کام قرار پائے بغیر نہ

رہے گا۔ یہ قطعاً ممکن نہیں ہے کہ جنہوں نے پیش بندی کے طور پر پہلے ہی مرہم تیار کر لیا تھا انہوں نے کسی قابل اعتماد اور مضبوط اشارہ کے بغیر ہی ایسا کیا تھا۔ وہ قابل اعتماد اور مضبوط اشارہ یہی ہو سکتا ہے کہ مسیح صلیب پر مرے گا نہیں بلکہ زخمی حالت میں اسے زندہ اتار لیا جائے گا اور اسے اس وقت زخموں کو مندمل کرنے والی بہت ہی مؤثر اور طاقتور دوا کی ضرورت ہو گی۔

یہ بات بھی ذہن نشین ہونی ضروری ہے کہ جس قبر یا مقبرہ میں مسیح کو رکھا گیا تھا اس کی جائے وقوع کے بارہ میں بہت رازداری سے کام لیا گیا تھا۔ اس کے صرف چند شاگردوں کو ہی اس کا علم تھا۔ رازداری سے کام لینے کی وجہ ظاہر تھی اور وہ یہی تھا کہ وہ ہنوز زندہ تھا اور راز فاش ہونے پر اس کے دوبارہ پکڑ لیے جانے کا خطرہ موجود تھا۔

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ مقبرہ نما جگہ کے اندر کیا کچھ واقع ہوا اس پر کئی لحاظ سے بحث ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ بات تنقیدی جائزہ کے آگے ٹھہر نہیں سکتی اور اسے کسی صورت ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ جو وجود یا شخص خود اپنے پاؤں اور قدموں سے چلتا ہوا اس مقبرہ نما جگہ سے باہر نکلا وہ فی الواقعہ مر گیا تھا اور مر کر پھر جی اٹھا تھا۔ اس بارہ میں ایک ہی شہادت پیش کی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ خود عیسائی صاحبان کا اپنا ایمان ہے کہ مسیح جب چلتا ہوا مقبرہ نما جگہ سے باہر آیا تو اسی جسم کے ساتھ باہر آیا جسے صلیب دی گئی تھی اور انہی خراشوں اور زخموں کے ساتھ باہر آیا جو صلیب پر لٹکنے کی وجہ سے لگے تھے۔ خود مسیحیوں کے اپنے ایمان اور عقیدہ کی رو سے وہ اسی جسم کے ساتھ باہر آیا تو از روئے عقل ایک ہی منطقی نتیجہ اس کا نکلتا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ مرا ہی نہ تھا۔

مسیح کے بلا توقف مسلسل زندہ رہنے کی ایک شہادت اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ تین دن اور تین راتوں کے بعد وہ پبلک یا عوام الناس کو تو کہیں نظر نہ آیا اور نظر آیا تو صرف اپنے شاگردوں کو۔ اس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو ظاہر ہی ان لوگوں پر کیا جن پر اسے پورا اعتماد تھا کہ وہ اس کے ہنوز زندہ ہونے کا راز فاش نہیں کریں گے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ دن کے اجالے میں باہر نکلنے اور لوگوں کے سامنے آنے سے گریز کرتا ہے اور اپنے قابل اعتماد شاگردوں سے بھی ملتا ہے تو رات کی تاریکی کے سائے میں ملتا ہے۔ بائبل کے بیان سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ راز کو راز ہی رکھنے کی ضرورت واہمیت کے پیش نظر وہ خطرہ کے مقام سے دور رہتا تھا اور خطرہ کے مقام سے جلد ہی غائب ہو جاتا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک دفعہ مرنے کے بعد اسے نئی زندگی عطا کر دی گئی تھی اور وہ نئی زندگی تھی بھی دائمی یعنی

اس نے پھر کبھی مرنا ہی نہ تھا تو پھر وہ اپنے دشمنوں کی نگاہوں میں آنے سے بچتا کیوں پھرتا تھا یعنی حکومت کی ایجنسیوں اور عوام دونوں سے کترانے اور بچنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اسے تو چاہیے تھا کہ وہ اپنے آپ کو یہودیوں اور سلطنت روما کے نمائندوں کے سامنے ظاہر کرتا اور ان سے کہتا "لو دیکھو! میں اپنی ابدی زندگی کے ساتھ تمہارے سامنے موجود ہوں۔ اگر تم میں ہمت ہے اور چاہتے ہو تو مجھے دوبارہ مار دو، لیکن یہ بھی یاد رہے کہ تم ایسا کرنے پر کبھی قادر نہیں ہو سکو گے" لیکن ہوا کیا ایسا کرنے کی بجائے اس نے چھپے رہنے اور چھپتے پھرنے کو ترجیح دی۔ پھر بات یہ بھی نہ تھی کہ کسی نے اسے یہ تجویز پیش نہ کی یا یہ ترکیب نہ سمجھائی کہ وہ اپنے آپ کو بے دھڑک عوام کے سامنے پیش کر دے بلکہ برخلاف اس کے ہوا یہ کہ باقاعدہ طور پر اس کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی کہ اپنے آپ کو دنیا پر ظاہر کر دے اور دنیا کو عَلَی الاعلان بتا دے کہ وہ زندہ موجود ہے لیکن اس نے اس تجویز کو ماننے سے انکار کر دیا۔ برخلاف اس کے وہ اپنے آپ کو یہودیہ سے دور سے دور تر کرتا چلا گیا تاکہ کوئی اس کا تعاقب نہ کر سکے۔ چنانچہ لکھا ہے:

"یہودا (جو اسکریوطی تھا) نے اس سے کہا کہ اے خداوند! یہ کیا بات ہے کہ تو اپنے آپ کو ہم پر تو ظاہر کیا چاہتا ہے مگر دنیا پر نہیں۔"

(یوحنا باب 14 آیت 22)

"اتنے میں وہ اس گاؤں کے نزدیک پہنچ گئے جہاں جانا چاہتے تھے اور اس کے (یعنی مسیح کے) ڈھنگ سے ایسا معلوم ہوا کہ گویا وہ آگے جانا چاہتا ہے۔ انہوں نے اسے یہ کہہ کر مجبور کیا کہ ہمارے ساتھ رہ کیونکہ شام ہوا چاہتی ہے اور دن اب ڈھل گیا ہے پس وہ اندر گیا تاکہ ان کے ساتھ رہے۔"

(لوقا باب 24 آیت 28، 29)

یہ صورت حال تو ایک ایسے فانی انسان کا نقشہ پیش کر رہی ہے جو موت کی پہنچ سے باہر نہیں ہے اور نہ ہی اس امر سے مبرا ہے کہ اسے کوئی جسمانی طور پر گزند پہنچا سکے۔ اس سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان معنوں میں مرا نہیں تھا کہ وہ (بقول عیسائی صاحبان) اس میں موجود انسانی جزو یا اپنی عام انسانی حیثیت سے مخلصی پا لے بلکہ اس کی فطرت جو کچھ بھی تھی علی حالہٖ قائم رہی۔ موت سرے سے واقع ہی نہیں ہوئی جو نئی فطرت سے پرانی فطرت کے جدا ہونے کا سوال پیدا ہوتا۔ انسانی تجربہ کی رو سے ہم اس کو زندگی کا تسلسل ہی قرار دیتے ہیں۔ ایک ایسی روح جس کا تعلق اگلے جہان سے ہو یقیناً اس طرح کا رویہ اختیار نہیں کرتی جس طرح کا رویہ مسیح نے رات کی تاریکی میں خفیہ ملاقاتوں کے دوران اپنے قریبی دوستوں اور پیروؤں کے ساتھ روا رکھا۔

عیسائیوں کے بقول رہا یہ سوال کہ مسیح مرنے اور پھر جی اٹھنے کے بعد شاگردوں کے روبہ رُو روحانی وجود میں ظاہر ہوتا رہا اس کی تردید اور نفی کسی اور نے نہیں بلکہ خود مسیح نے کی اور کی بھی بڑے ہی پرزور انداز میں۔ جب وہ اپنے شاگردوں کے سامنے ظاہر ہوا تو وہ اس کے بارہ میں اپنے خوف کو چھپا نہیں سکے کیونکہ یہ پرخوف مغالطہ ان میں سے بعض کو لاحق تھا کہ یہ مسیح خود نہیں ہے بلکہ اس کی روح ہے جو ان کے سامنے آموجود ہوئی ہے۔ ان کی اس الجھن کو اچھی طرح بھانپتے ہوئے مسیح نے ان کے اس خوف کو یہ کہہ کر دور کیا کہ وہ روح نہیں ہے۔ (یعنی روحانی وجود میں ظاہر نہیں ہوا ہے) اس نے بہ اصرار کہا کہ وہ وہی مسیح ہے جسے صلیب دی گئی تھی۔ اس نے انہیں اپنے زخم دکھائے جو ابھی تازہ ہی تھے۔ (یوحنا باب 20 آیات 19 تا27)۔ اس کے اپنے شاگردوں کے روبرو ظاہر ہونے سے یہ امر کسی طور پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتا کہ وہ مردوں میں سے جی اٹھا تھا۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد زندہ بچ رہا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاگردوں میں سے اگر کسی کے ذہن میں غلط فہمی کا کوئی شائبہ تھا بھی تو مسیح نے خود اپنے فعل سے اسے دور کر دیا۔ اس نے اپنے شاگردوں کو اس وقت کچھ کھاتے ہوئے دیکھا تو ان سے پوچھا وہ کیا کھا رہے ہیں؟ جب اسے بتایا گیا کہ وہ روٹی اور مچھلی کھا رہے ہیں تو اس نے کھانے کے لئے کچھ مانگا کیونکہ اس وقت اسے خود بھی بھوک لگ رہی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی بھوک دور کرنے کے لئے اس میں سے کچھ کھایا۔ اس کا روٹی اور مچھلی مانگ کر کھانا اور اپنی بھوک دور کرنا اس خیال عقیدہ کے خلاف ایک بین ثبوت ہے کہ وہ مردوں میں سے جی اٹھا تھا اور اس جی اٹھنے کی وجہ سے اس کی انسانی فطرت میں جو ایک دفعہ مرگئی تھی دوبارہ زندگی عود کر آتی تھی۔ اس سارے عقیدہ کے غلط ہونے کا یہ ایک ایسا پختہ اور حتمی ثبوت ہے کہ اس میں شک وشبہ کی حبہ برابر بھی گنجائش نہیں۔

(لوقا باب 24 آیت 41 تا42)

مسیح کے دوبارہ جی اٹھنے کا اگر یہ مفہوم لیا جائے تو دوہری نوعیت کے مسائل سر اٹھائے بغیر نہیں رہتے۔ جیسا کہ جی اٹھنے سے پہلے اس کے متعلق دعویٰ کیا جاتا تھا اس کے مطابق جی اٹھنے کے بعد بھی وہ خدا اور انسان کے ملغوبہ سے معرض وجود میں آنے والی ایک نئی نوع سے تعلق رکھتا تھا تو اس کے وجود میں آنے والی ایک نئی نوع سے تعلق رکھتا تھا تو اس کے وجود میں موجود انسان سے چھٹکارا تو اسے حاصل نہ ہوا۔ اس سے تو بہت ہی الجھی ہوئی پیچیدہ اور مشکوک ومشتبہ صورت حال پیدا ہو کر عجب جنجال میں مبتلا کر دیتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب موت واقع ہوئی تو اس کے ساتھ بلکہ کہنا یہ چاہیے کہ ان دونوں یعنی خدا اور اس کے اندر موجود انسان مسیح کے ساتھ کیا کیا؟ کیا موت وارد ہونے پر انسان اور خدا دونوں کی روحیں قبض کر لی گئی تھیں اور پھر اکٹھی ہی دوزخ میں رہنے کے بعد اسی سفلی جسم میں واپس لوٹ آئی تھیں؟ یا کیا بصورت دیگر ہوا یہ تھا کہ صرف خدا کی روح جو مسیح میں در آئی تھی وہ انسانی روح کے بغیر ہی انسانی جسم میں عود کر آئی؟ اگر ایسا ہی ہوا تو پھر انسان استعجاب میں ڈوبے بغیر نہیں رہتا کہ وہ دوسری روح (یعنی مسیح کی انسان روح) کہاں جا غائب ہوئی؟ کیا اس روح کا دوزخ میں سفر ایک لامتناہی سفر تھا اور جس سے واپسی ممکن نہ تھی؟ پھر سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ جو خدائی روح اس کے اندر صرف تین دن رات مقید رہی وہ مسیح کے باپ خدا کی روح تھی یا یہ کہ وہ روح تھی اس بیٹے مسیح کی؟ صحیح صورت حال ہمارے سامنے آنے اور ہمیں اس سے آگاہ کرنے کے لئے اس سوال کا ایک ہی دفعہ یعنی حتمی طور پر ہمیشہ ہمیش کے لئے حل ہونا ضروری ہے کہ کیا مسیح کا جسم جزوی طور پر خدا کا جسم تھا اور جزوی طور پر وہ تھا انسان کا جسم؟

عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید ہر دو کا مطالعہ ہمیں خدا کے جس تصور یا تخیل سے ہمکنار کرتا ہے وہ ایک غیر مجسم اور غیر محدود ازلی ابدی ہستی کا تصور ہے۔ اس کی ہستی یا وجود میں مادہ کا سرے سے کوئی عمل دخل ہے ہی نہیں۔ یہ بات سمجھ لینے اور ذہن نشین کر لینے کے بعد ہم پھر پلٹ کر مسیح کی طرف دیکھتے ہیں یعنی مریم کے رحم میں جنین کی حالت کے بعد اس کے مختلف مراحل میں سے گزر کر اس کی نشو و نما کا تخیلی جائزہ لیتے ہیں۔ وہ تمام مادہ جو مسیح کے بننے اور معرض وجود میں آنے کا موجب بنا تھا اسے انسان ماں نے مہیا کرنا تھا اور ایک چپہ بھی مادہ کا خدا کی طرف سے اس میں شامل نہ ہونا تھا۔ یقیناً خدا اسے معجزانہ طور پر پیدا کر سکتا تھا لیکن میرے نزدیک تخلیق خواہ معجزانہ طور پر ظہور میں آئے یا وہ خدا کے مقرر کردہ عام قدرتی ذرائع کے مطابق ظہور پذیر ہو بہر صورت و بہر حال وہ ہوتی تخلیق ہی ہے۔ ہم کسی کو صرف اس صورت میں ہی کسی کا باپ تسلیم کر سکتے ہیں جبکہ اسے وجود میں لانے کے عمل میں باپ کا جوہر اور ماں کا جوہر مساویانہ حیثیت میں یا جزوی طور پر حصہ لیتے ہیں تا کہ بیٹے کے جسم کا کچھ نہ کچھ جوہری جزو باپ کے جوہر سے بھی ماخوذ قرار پا سکے۔

اس عام فہم بات سے ایک قاری پر یہ امر بالکل واضح ہو جانا چاہیے کہ انسانی جنین کی پیدائش کے مرحلہ وار قدرتی طریق کار میں خدا نے باپ والا کردار قطعاً ادا نہیں کیا۔ عناصر میں ظہور ترتیب یعنی خلیوں

سے عضلات کی تشکیل سلسلہ تنفس اور قلب کی کارکردگی نیز رگوں، نسوں، پٹھوں اور اعصاب کی کارفرمائی سے متعلق باہم ایک دوسرے سے مربوط نظاموں کے قیام سمیت پورے کے پورے جسمانی کارخانہ کا کسی اور کی معاونت کے بغیر ماں کے اپنے اکیلے وجود سے آغاز ہوا تھا۔ اس میں مسیح کی ابنیت (یعنی جسمانی طور پر ابن اللہ ہونے) کی سرے سے کوئی گنجائش تھی ہی کہاں۔ مسیح کو تو صرف اور صرف خدا کی روح کو اپنے اندر جذب کرنے کا ظرف عطا ہوا تھا۔ اس ضمن میں اس بات کی اس سے زیادہ کوئی حقیقت نہ تھی۔ خدا اور مسیح کے درمیان پائے جانے والے رشتہ کی اس تفہیم کو کوئی بھی قابل فہم نام دے لیں اسے باپ بیٹے کے رشتہ کا نام کسی طور نہیں دیا جا سکتا۔

باب پنجم

زندگی کی بحالی یا احیائے موتیٰ؟

مسیح کے مردوں میں سے جی اٹھنے کے عقیدہ سے جو منظرنامہ تشکیل پاتا یا جو صورت حال ابھرتی ہے وہ ایک نہیں بہت سے مسائل کو جنم دینے کا موجب بنتی ہے۔ ہم ان مسائل میں سے بعض پر گزشتہ باب میں پہلے ہی روشنی ڈال چکے ہیں۔ اب ہم اپنی توجہ بعض نئے امور اور ان کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی نئی پیچیدگیوں اور الجھنوں کی طرف پھیرتے ہیں۔

فی الوقت ہمارے مدنظر جو امر ہے وہ یہ ہے کہ صلیب دیئے جانے سے قبل اور پھر مردوں میں سے جی اٹھنے کے بعد مسیح کے ذہن کی حالت یا کیفیت کیا تھی۔ تین دن رات ذہن کے یکسر ماؤف و معطل رہنے یعنی اس پر مکمل مردنی چھا جانے کے بعد (کہا یہ جاتا ہے کہ) ذہن کو دوبارہ زندگی سے ہمکنار کیا گیا اور اس نے یکدم از سر نو کام کرنا شروع کر دیا۔ اس ضمن میں جس سوال کو اہمیت حاصل ہے وہ یہ ہے کہ جب انسان پر موت وارد ہوتی ہے تو اس وقت مرنے والے کے دماغ پر کیا گزرتی ہے اور اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟ کم از کم ایک امر یہ نکتہ (جو چاہیں اس کو نام دے لیں) ایسا ہے جس کے بارہ میں جملہ طبی ماہرین وہ مسیحی ہوں یا غیر مسیحی بلا استثنا سب کے درمیان مکمل اتفاق رائے پایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر چند منٹوں یا اس سے ذرا ہی کچھ زیادہ وقت دماغ پر مردنی چھائی رہے اور اس کا رَدِّ عمل ہونا موقوف ہو جائے تو وہ ہمیشہ کے لئے مردہ ہو کر بلحاظ کارکردگی معدوم ہو کر رہ جاتا ہے۔ جونہی خون کی بہم رسائی موقوف ہوتی ہے دماغ کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ دماغ باطنی طور پر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اس کے اجزا اندر ہی اندر بکھرنے اور تتّر بتّر ہونے لگتے ہیں۔ اگر مسیح واقعی صلیب پر مر گیا تھا تو اس کے مالہ وماعلیہ کو اچھی طرح سمجھنا ضروری ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اس کے دل نے کام کرنا بند کر دیا تھا اور اس کے نتیجہ میں اس کے دماغ کو خون کی بہم رسانی کا سلسلہ یکسر منقطع ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے دماغ پر بھی مکمل مردنی چھا گئی تھی۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ زندگی کو سہارا دینے والے پورے نظام نے جام ہو کر کام کرنا بند کر دیا تھا۔ بصورت دیگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مر گیا تھا۔ اس لحاظ سے ہم مسیح کی زندگی اور موت کی تفہیم

سے متعلق بہت سے پیچیدہ مسائل سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

مسیح کی موت واقع ہونے کو جس طرح پیش کیا جاتا ہے اس کا ایک ہی مطلب بنتا ہے اور وہ یہ کہ اس کا روحانی جسم یا یوں کہہ لیں کہ اس کی روح اس کے انسانی جسم کے مادی پنجرہ سے آزاد ہو کر اس میں سے پرواز کر گئی تھی۔ اگر یہ سچ ہے اور ایسا ہی ہوا تھا تو اس کے زندہ ہونے کا یہ مطلب لینا ہوگا کہ اس کا روحانی وجود اسی مادی جسم میں پھر لوٹ آیا تھا جسے اس نے تین دن پہلے چھوڑ کر اس سے اپنا تعلق منقطع کر لیا تھا۔ مادی زندگی کو اگر وقت بتانے والی گھڑی سے تشبیہ دی جائے تو مردہ جسم میں روح کی ایسی واپسی مادی زندگی کی گھڑی کو دوبارہ چالو کرنے اور اس کی مسلسل جاری رہنے والی ٹک ٹک کو از سرِ نو بحال کرنے کے مترادف ہوگی۔ اگر ایسا ہی وقوع میں آیا تھا تو ماننا پڑے گا کہ مردہ دماغ کے بکھر جانے اور تتّر بتّر ہو جانے والے منتشر خلیے یکدم دوبارہ مجتمع ہو کر زندہ ہو گئے ہوں گے۔ اور ٹوٹ پھوٹ کے تیز رفتاری سے فوری طور پر جاری ہو جانے والے پورے عمل کو ایکا ایکی الٹا چکر کھا کر پھر معدوم ہو جانے والی اسی گمشدہ نہج پر واپس لوٹنا پڑا ہوگا۔ اگر عقیدہ کے طور پر اس بات کو درست مان لیا جائے تو عمل اور رَدِّ عمل نیز اسباب و علل کے نقطۂ نگاہ سے ایک بہت ہی گھمبیر اور مہیب مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ یہ گھمبیر اور مہیب مسئلہ علم حیاتیات کے عیسائی کیمیا دانوں کے لئے ہمیشہ ایک چیلنج بنا رہے گا کہ وہ اس عقدہ کو حل کرنے کی خاطر ایسا ہونے یا ہو سکنے کے عملی اور تجرباتی ثبوت مہیا کر کے دکھائیں۔ مرکزی اعصابی نظام میں زوال و انحطاط اور ٹوٹ پھوٹ کے پورے عمل کا یکدم پلٹا کھا جانا اور زندگی کی آئینہ دار اصل حالت کا پھر عود کر آنا ایک ایسا عقدۂ لا ینحل ہے جو طبی ماہرین اور سائنسدانوں کے تخیل کی انتہائی بلند پروازی اور اس کے پھیلاؤ کی ممکنہ ہمہ گیری کی رسائی سے باہر ہے۔ بفرض محال اگر کبھی ایسا ہونا اور ایسا ہو سکنے کے امکان کو درست تسلیم کیا گیا تو اس سے سائنس کی تغلیط ہی لازم نہیں آئے گی بلکہ خدا کے خود اپنے بنائے ہوئے قوانین قدرت مذاق بنے بغیر نہ رہیں گے۔ بایں ہمہ یہ ایک ایسا معجزہ ہوگا جس سے پیش آمدہ مسئلہ پھر بھی حل نہ ہو سکے گا اور جوں کا توں عقدۂ لا ینحل بنا رہے گا۔

سوچنے والی بات یہ ہے کہ ایسے رنگ میں دوبارہ زندہ ہو جانے کا مطلب کیا ہوگا؟ یہ مطلب ہوگا کہ مرکزی اعصابی نظام کے ٹوٹ پھوٹ جانے والے خلیے از سر نو زندہ ہو گئے اور ان کے مابین نئی ترتیب و تشکیل نے ظہور میں آکر انہیں دوبارہ متحرک کر دکھایا۔ دوبارہ تعمیر و تشکیل اور ان میں قائم ہونے والی نئی

ترتیب اس امر پر دال ہو گی کہ ان خلیوں کی حیثیت بالکل نئے خلیوں کی ہو گی اور وہ نئے ہونے کی وجہ سے سابقہ یادداشتوں سے عاری ہوں گے اس لئے مسیح کی سابقہ حیات سے تعلق رکھنے والے جملہ امور و واقعات کو جو مسیح کے وفات یافتہ ذہن سے محو ہو گئے تھے ان نئے تعمیر کردہ خلیوں میں داخل کرنا پڑا ہو گا۔ یہ ایک ایسا طولانی سلسلہ عمل ہے جس کا از روئے سائنس وقوع میں آنا ممکن ہی نہیں۔

علم حیاتیات کی رو سے مردہ اجسام کے بالمقابل زندگی مشتمل ہوتی ہے دماغ میں پائے جانے والے ارب ہا ارب اقل ترین بنیادی ذرات میں حواس خمسہ کی طرف سے مسلسل موصول ہونے اور ان میں سمانے والی اطلاعات کے احساس و شعور پر۔ یہ اطلاعات اپنی جگہ ان بنیادی ذرّات کی بے حد پیچیدہ اور باہم ایک دوسرے سے مربوط ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ اطلاعات حواس خمسہ میں سے ہر حس کی طرف سے موصول ہو ہو کر ان ٹکڑیوں میں شماریات کی طرح محسوب و محفوظ ہو رہی ہوتی ہیں۔ اگر محفوظ ہونے والا یہ سارا حساب کتاب یکسر صاف ہو کر محو ہو جائے تو اس کے ساتھ ہی زندگی بھی معدوم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا مسیح کے دوبارہ زندہ ہو جانے کا مطلب یہ ہوا کہ پورے ساز و سامان کے ساتھ ایک نرم و نازک آلہ کے طور پر ایک نیا دماغی کمپیوٹر معرض وجود میں آ کر رُوبہ عمل ہوا۔ اسی پیچیدگی کا مسیح کے جسم کے تمام دوسرے حصوں کی کیمیاوی حالت کے ساتھ بھی پیش آنا لازمی ٹھہرا۔ پورے مردہ جسم کو زندہ کرنے کے لئے بہت بڑے اور وسیع پیمانہ پر از سر نو تعمیر کے پورے کیمیاوی سلسلہ اور طریق کار کو دوبارہ حرکت میں لا کر اسے رُوبعمل کرنا ضروری ہو گا تا کہ جو گوشت پوست اور دوسرا عضلاتی ساز و سامان انحطاط اور عمل تحلیل کے دوران ضائع ہوا ہے اسے اس کی اصل حالت پر واپس لایا جا سکے۔ ایسا عظیم معجزہ ظاہر ہونے پر ایک الجھن سے بھی واسطہ پڑے گا۔ سوال پیدا یہ ہو گا کہ زندہ کون ہوا اور کیا اثر ظاہر ہوا اس کا؟ کیا یہ سب کچھ اس انسان کے ساتھ ہوا جو مسیح کی ذات میں پوشیدہ تھا یا اس خدا کے ساتھ ہوا جو انسان کے پہلو بہ پہلو مسیح کے اندر موجود تھا۔ بحیثیت انسان مسیح کی ذات اور ہستی کی اہمیت کو سمجھنے پر ہم اسی لئے تو زور دے رہے ہیں تا کہ اس نوعیت کی لاینحل الجھنیں سرے سے پیدا ہی نہ ہوں۔

مسیح کے حالات زندگی میں جب کبھی اور کہیں یہ نظر آتا ہے کہ خدا کا بیٹا ہونے کے باوجود وہ اعلیٰ و برتر طاقتوں اور قدرتوں کے اظہار میں ناکام رہا اور وہ کچھ نہیں کر سکا جو خدا کا بیٹا ہونے کی حیثیت میں اسے کرنا چاہیے تھا تو عیسائی صاحبان اپنے اس دعویٰ اور عقیدہ کی آڑ میں پناہ لے لیتے ہیں کہ وہ خدا ہونے کے ساتھ ساتھ انسان بھی تو تھا سو اس سے جب کمزوری کا اظہار یا غلطی کا ارتکاب ہوا تو خدا ہونے کی حیثیت

میں نہیں بلکہ انسان ہونے کی حیثیت میں ہوا۔ اندریں صورت ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ان سے پوچھیں کہ صاف اور واضح طور پر نشان دہی کریں اور بتائیں کہ مسیح کی ذات میں کون سا حصہ انسان ہونے کا تھا اور کون سا حصہ وہ تھا جو اس کی الوہیت کا آئینہ دار تھا؟ تا کہ دونوں علیحدہ علیحدہ حصوں کے اعمال و افعال کو الگ الگ پر کھا جاسکے۔ مسیح کی دو حیثیتوں کا عقدہ مسیح صاحبان کا اپنا پیدا کردہ ہے اسے اور اس کی الجھنوں کو وہ جانیں اور وہی انہیں حل کریں۔ بظاہر حالات تو ہم یہی کہیں گے کہ جب دماغ زندہ ہوا تو انسانی عنصر ہی زندہ ہوا کیونکہ خدا کی ہستی اپنے آپ کو برقرار رکھنے کے لیے مادی دماغ کی حاجت سے مبرّا ہے۔ مسیحیوں کے عقیدہ کے مطابق جہاں تک مسیح کی خدائی ہستی کا تعلق ہے زمین پر اپنے سابقہ عارضی قیام کے دوران اس نے اپنے اندر کسی مادی شے کو سنبھالنے اور سہارا دینے والے کا کردار ادا کیا اسی کو دوسرے الفاظ میں ذریعہ یا واسطہ بننا کہتے ہیں۔ لہٰذا مسیح کے دوبارہ جی اٹھنے سے مراد یہ ہوگی کہ اس کے اندر موجود انسان جی اٹھا۔ اس کے بغیر اس کی روح کا دوبارہ اسی جسم میں واپس آنا ممکن ہی نہیں ہو سکتا تھا گویا کہ انسان ہی مرا اور (اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین قدرت کے برخلاف) انسان ہی جی اٹھا اور جی اٹھا بھی مسیحیوں کے اعتقاد کی حد تک! اس کے بغیر اس کی روح کا دوبارہ اسی جسم میں واپس آنا ممکن ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

اگر مسیحی صاحبان کے نزدیک یہ منظر نامہ (کہ انسان ہی مرا اور انسان ہی کے جی اٹھنے سے انسان ہی کی روح اس کے جی اٹھنے والے جسم میں دوبارہ واپس آئی) قابل قبول نہیں ہے تو پھر ہمیں ایک اور مسئلہ سے دوچار ہونا پڑے گا اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ یہ ماننا پڑے گا کہ زمین پر زندگی کے دوران مسیح کے دو ذہن تھے اور وہ تھے بھی ایک دوسرے سے مختلف اور آزاد۔ مراد یہ ہے کہ مسیح میں ایک ذہن انسان کا تھا اور دوسرا ذہن خدا کا۔ یہ دونوں ذہن ایک ہی محدود جگہ میں سمائے ہوئے تھے ورنہ تھے ایک دوسرے سے غیر متعلق اور آزاد۔ ایسی صورت میں یہ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ انسانی ذہن کے لئے گنجائش پیدا کرنے کی خاطر مر جانے والے انسانی دماغ کی از سرِ نو تعمیر و تشکیل ضروری تھی۔ بس اتنا ہی تصور کرنا کافی ہے کہ مسیح اپنی دوہری شخصیت کے ساتھ ذہنی اعتبار سے اسی کھوپڑی میں دوبارہ آموجود ہوا جو پہلے میزبان نما جسم کے انحطاط شدہ بچے کھچے بوسیدہ دماغی عضلات سے بھری ہوئی تھی۔

جتنا زیادہ گہرائی میں جاکر ہم اس مسئلہ کا جائزہ لیتے اور اسے غور و فکر کا مرکز بناتے ہیں تو تحقیق و تدقیق کے ہر ہر مرحلہ پر اتنے ہی زیادہ نئے سے نئے مسائل سر اٹھا کر الجھن میں اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ کسی مزید الجھن کی طرف اشارہ کرنے سے پہلے اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ خیالات و تصورات کا منبع و مخرج

انسانی ذہن کو بنایا گیا ہے۔ خیالات کے تسلسل کو قائم رکھنے اور اسے آگے بڑھانے کے لئے ذہن انسانی کو ایک آلۂ کار کے طور پر دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح مادی جسم کی حرکات و سکنات اور افعال و اعمال کا تعلق بھی ذہن سے ہی ہوتا ہے۔ اگر ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں اور اسے تسلیم کرتے ہیں کہ ذہن کی بھی ایک علیحدہ ہستی ہے اور وہ اپنی ہستی کو از خود برقرار رکھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ذہن اور روح دراصل ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ ہم اسے کسی نام سے بھی پکاریں اسے ذہن کہیں یا روح جب اس کا دماغ سے تعلق منقطع ہو جاتا ہے تو اس میں اپنی ہستی کو علیحدہ طور پر برقرار رکھنے کی اہلیت موجود ہوتی ہے۔ لیکن اگر ذہن یا روح سے یہ کام لینا مقصود ہو کہ وہ انسانی جسم کو کنٹرول کرے یا یہ کہ اس کے گردوپیش کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا اثر قبول کرے تو پھر ذہن اور دماغ کے درمیان یا بالفاظ دیگر روح اور دماغ کے درمیان گہرے رابطہ اور تعلق کا ہونا ضروری ہے۔ اس تعلق اور رابطہ کے بغیر ذہن یا روح انسانی جسم پر نہ اثر انداز ہو سکتے ہیں اور نہ اسے متحرک کر سکتے ہیں۔ اور اسی طرح نہ ہی جسمانی، فکری اور جذباتی تحریکات اور ان کے طریق کار اور ان کے پورے سلسلہ کو کنٹرول کرنا ان کے لئے ممکن رہتا ہے۔ یہ ایک ایسا بدیہی امر ہے کہ بحث و تمحیص سے بالا ہے۔

اب یہ بدیہی امر ہمیں ایک اور سنجیدہ مسئلہ سے دوچار کرنے کا موجب بن جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا خدا کا نام نہاد بیٹا کسی انسانی جسم کو دماغ کے ذریعہ کنٹرول کرنے کا محتاج تھا؟ اور کیا خود اسے اپنے ذہن اور فکری نظام کو چلانے اور اس میں تسلسل برقرار رکھنے کے لئے ایک مادی دماغ کے سہارے اور مدد کی ضرورت تھی اور اس کے واسطے ایک مادی دماغ پر انحصار ناگزیر تھا؟ اگر وہ خدا کا بیٹا ہونے کی حیثیت میں ہر قسم کی جسمانی حدود و قیود سے بالا ہے اور اگر وہ اپنے ایک آزاد فکری نظام اور حسبِ منشا اس میں تسلسل کا مالک و مختار ہے اور اس کی اپنی پیدا کردہ کائنات میں ایسے آزاد فکری نظام اور حسبِ منشا اس میں تسلسل کا مالک و مختار ہے اور اس کی اپنی پیدا کردہ کائنات میں ایسے آزاد و خود مختار فکری نظام کی کوئی اور مثال موجود نہیں ہے تو پھر خدا کی روح کا ایک مادی ذہن کے ساتھ انسانی جسم میں لوٹنا ایک انوکھی قسم کی دہری شخصیت اور اس کی وجہ سے رونما ہونے والی عجیب و غریب صورت حال کو جنم دینے کے مترادف ہے اور پھر وہ دہری شخصیت ہے بھی وہ باہم متصادم فکری طریقہ ہائے کار کی مالک کیونکہ انسانی ذہن اور انسانی روح کے لئے خدا کی ذات اور اس کے ذہن کے ساتھ مکمل طور پر یکساں اور یک جان ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں دو فکری طریقہ ہائے کار اور ان کے جداگانہ تسلسل میں اختلاف رونما ہونا اور ہر دو کی دماغی

لہروں میں ہیجان انگیز تصادم کا برپا ہونا ناگزیر ہے۔ ایسی صورت حال کے لئے تو نفسیاتی امراض کے ایک ماورائی اور مافوق البشر معالج کی ضرورت ہو گی۔ کیونکہ یہ صورت حال اغلباً فکر و عمل میں تضاد کی ایک عجیب نوعیت کی روحانی بیماری (Schizophrenia) پر دلالت کرتی ہے۔

اس امر کے ذکر کے بعد اب ہم ایک اور زاویۂ نگاہ سے ایک اور منظر نامہ یا صورت احوال کا نقشہ تیار کرتے ہیں۔ مسیحیت کا کسی قدر گہری نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسیحی کلیسیا کے ہاں اور اس کے زیر اثر خود مسیحیوں میں بعض اصطلاحات کے نتائج و عواقب کا خیال کیے بغیر انہیں بعض ایسے واقعہ یا صورت حال پر چسپاں کر دیا جاتا ہے جہاں ان کا فی الحقیقت اطلاق پانا ممکن ہی نہیں ہو تا۔ یہی وجہ ہے کہ صلیب اور اس کے بعد کے واقعات سے متعلق مسیحی نظریہ ذہنی الجھاؤ اور غیر منطقی طور پر منطق کی جانے والی اصطلاحات کی دھند میں بری طرح لپٹا ہوا ہے۔ ان میں سے ایک اصطلاح ہے revival۔ اس کے لغوی معانی ہیں مختل و معطل ہوش نیز حد درجہ مضمحل اور قریب الاختتام زندگی کی واپسی و بحالی۔ ایک اور اصطلاح ہے resurrection (دوبارہ جی اُٹھنا) از روئے اصطلاح استعمال ہوتی ہے مر جانے اور اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد حشر نشر کے طور پر دوبارہ زندہ ہونے کے معنوں میں۔ ان دونوں اصطلاحوں (یعنی بحالی اور حشر نشر) میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہم نے سطور بالا میں مسیح کے دوبارہ زندہ ہونے کے امکان کا ذکر کرتے ہوئے عمداً revival (بحالی) کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ جیسا کہ ہم نے اب تک دیکھا ہے revival یا بحالی کے معنیٰ ہیں کہ گویا مرنے کے بعد اسی انسانی جسم کے جملہ اعضائے رئیسہ کے مقررہ فرائض و وظائف (حرکات و سکنات اور اعمال و افعال) کی بحالی۔ بر خلاف اس کے resurrection (حشر نشر) کی اصطلاح کے بالکل اور معنے ہیں جن کی وجہ سے یہ اصطلاح قدرت کے بالکل ایک الگ مظہر پر دلالت کرتی ہے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ خود عیسائی کلیسیا ان اصطلاحوں کو ان کے معانی باہم ادل بدل کر غلط رنگ میں استعمال کرتا رہا ہے۔ سو اس ضمن میں مسیحیوں کے ذہنوں میں الجھاؤ اور ژولیدگی پیدا کرنے کا ذمہ دار کلیسیا خود ہی ہے۔ اکثر مسیحی صاحبان مسیح کی نام نہاد صلیبی موت اور اس کے بعد جی اٹھنے کو مسیح کے resurrection (حشر نشر) سے تعبیر کرتے ہیں اور اس حشر نشر سے مراد وہ یہ لیتے ہیں کہ مسیح اپنی نام نہاد موت کے وقت جس جسم کو خیر باد کہہ کر چھوڑ گیا تھا اسی جسم میں زندگی دوبارہ عود کر آئی تھی۔ ہم یقیناً اس سے اتفاق نہیں کرتے اور نہ حشر نشر کی اصطلاح ان معنوں کی متحمل ہے۔ اس وقت کی معروضی صورت

حال کے پیش نظر ہم یہ حق رکھتے ہیں کہ مسیح کی اس وقت کی حالت کو سکتہ کی حالت قرار دیں نہ کہ اسے موت سے تعبیر کریں۔ اگر صحیح معنوں کو ذہن میں مستحضر رکھ کر اس اصطلاح کو استعمال کیا جائے تو مسیح کے resurrection (دوبارہ جی اٹھنے) کے معنے ہرگز یہ نہیں ہوسکتے کہ اس کی روح اسی انسانی جسم میں واپس لوٹ آئی جسے وہ موت کے وقت چھوڑ کر اس سے علیحدہ ہوگئی تھی۔

Resurrection (حشر نشر) کی اصطلاح مرنے کے بعد جس نئی زندگی کے معنوں میں استعمال ہوتی ہے اس سے مراد صرف ایک نئے آسمانی جسم کی تخلیق کے ہیں۔ ایسا جسم اپنی فطرت کے لحاظ سے روحانی جسم ہوتا ہے جو اس مصفّا اور لطیف روح کے لئے جو اس کے اندر ہوتی ہے ایک کٹھالی نما خول کا کام دیتا ہے۔ یہ جسم مرنے کے بعد دائمی زندگی کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے پیدا کیا جاتا ہے۔ بعض اسے قائم مقام ضمنی جسم کہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ آسمانی جسم ہوتا ہے اور بعض اس کے لئے آتما کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ نام اس کا آپ کچھ ہی رکھ لیں بنیادی معنیٰ اس کے ایک ہی رہتے ہیں۔ پس resurrection جسے اُردو میں حشر نشر کہتے ہیں کی اصطلاح اس نئے جسم کے لئے استعمال ہوتی ہے جسے روح کے لئے پیدا کیا جاتا ہے اور جو اپنی فطرت اور نوعیت کے لحاظ سے بہت لطیف ہوتا ہے۔ اور یہ اصطلاح یعنی resurrection کی اصطلاح روح کی اسی تحلیل و تبدیل شدہ جسم میں دوبارہ واپس لوٹ آنے کے معنوں میں ہرگز ہرگز (اور ہم ہرگز کا لفظ باصرار استعمال کر رہے ہیں) استعمال نہیں ہوتی۔

سینٹ پال (پولوس) نے مسیح کے جی اٹھنے کے تعلق میں بالکل انہی اصطلاحوں کو ان معنوں میں (جن کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں) بڑی تفصیل سے استعمال کیا ہے۔ وہ نہ صرف مسیح کے جی اٹھنے پر ایمان رکھتا تھا بلکہ بالعموم ان سب مر جانے والے لوگوں کے جی اٹھنے پر بھی ایمان رکھتا تھا جن کو خدا اس کا اہل سمجھتا تھا کہ انہیں بھی ایک نئی ہستی اور نئی زندگی عطا کی جائے۔ روح کی ہستی وہی رہتی ہے لیکن وہ وجود جس میں وہ بسیرا کرتی ہے بدل جاتا ہے۔ پولوس کے نزدیک ایسا ہونا مظاہر قدرت میں سے ایک عام مظہر کی حیثیت رکھتا ہے۔ بصورت دیگر اگر یہ عام نہ ہو تو عیسائیت بلکہ ہر مذہب کا تصور بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

کرنتھیوں کے نام سینٹ پال (پولوس) کے خطوط کا بہت عمیق نظر سے مطالعہ کرنا ضروری ہے کیونکہ زیرِ غور مسئلہ کے تعلق میں ان خطوط کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ کم از کم میرے نزدیک تو اس امر میں شبہ کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی کہ جب پولوس نے صلیب دیئے جانے کے بعد مسیح کے زندہ نظر آنے کا ذکر کیا ہے اس نے کسی ابہام کے بغیر واضح طور پر صرف اور صرف resurrection (حشر نشر کے طور پر

نیا جسم عطا ہونے) کا ذکر کیا ہے۔ یہ بات تو کبھی اس کے ذہن میں آئی ہی نہ تھی کہ مسیح کی روح اس کے اسی فانی جسم میں لوٹ آئی تھی اور یہ کہ مرنے کے بعد وہ عام جسمانی اصطلاح کی رو سے مادی طور پر دوبارہ جی اٹھا تھا۔ سینٹ پال (پولوس) کو جس طرح میں نے سمجھا ہے اگر مسیحی دینیات کے بعض ماہرین کے نزدیک وہ قابل قبول نہیں ہے تو بھی انہیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ پولوس نے (اس کے برخلاف کچھ اور کہہ کر) واضح طور پر اپنی تردید آپ کی ہے کیونکہ اس کے اپنے بعض بیانات اس بارہ میں شبہ کا کوئی شائبہ تک باقی رہنے ہی نہیں دیتے کہ مسیح کی زندگی resurrection (یعنی حشر نشر کے طور پر حاصل ہونے والے نئے جسم) کی آئینہ دار تھی اور اس فانی انسانی جسم کے دوبارہ جی اٹھنے پر دلالت نہیں کرتی تھی جس میں پہلے اس کی روح مقید تھی۔ بعض متعلقہ اقتباسات درج ذیل ہیں جو فی ذاتہٖ بالکل واضح ہیں اور مزید کسی وضاحت کے محتاج نہیں ہیں۔

”اور خدا نے خداوند کو بھی جلایا اور ہم کو بھی اپنی قدرت سے جلائے گا۔“

(1۔کرنتھیوں باب 6 آیت 14)

”مردوں کی قیامت بھی ایسی ہی ہے۔ جسم فنا کی حالت میں بویا جاتا ہے جو جسم زندہ اٹھایا جاتا ہے وہ فنا نہیں ہوتا۔ جسم بے حرمتی کی حالت میں بویا جاتا ہے اور جلال کی حالت میں جی اٹھتا ہے۔ کمزوری کی حالت میں بویا جاتا ہے اور قوت کی حالت میں جی اٹھتا ہے۔ نفسانی جسم بویا جاتا ہے اور روحانی جسم جی اٹھتا ہے۔“

(1۔کرنتھیوں باب 15 آیت 42 تا 44)

”کیونکہ نرسنگا پھونکا جائے گا اور مردے غیر فانی حالت میں اٹھیں گے اور ہم بدل جائیں گے کیونکہ ضرور ہے کہ یہ فانی جسم بقا کا جامہ پہنے اور یہ مرنے والا جسم حیات ابدی کا جامہ پہنے۔ اور جب یہ فانی جسم بقا کا جامہ پہن چکے گا اور یہ مرنے والا جسم حیات ابدی کا جامہ پہن چکے گا تو وہ قول پورا ہوگا جو لکھا ہے کہ موت فتح کا لقمہ ہو گئی۔“

(1۔کرنتھیوں باب 15 آیات 52 تا 54)

”الغرض ہماری خاطر جمع ہے (یعنی ہم مطمئن ہیں) اور ہم کو بدن کے وطن سے جدا ہو کر خداوند کے وطن میں رہنا زیادہ منظور ہے۔“

(2۔کرنتھیوں باب 5 آیت 8)

سینٹ پال (پولوس) کے مندرجہ بالا اقتباس کے تعلق میں ایک مسئلہ پھر بھی حل طلب رہتا ہے۔ وہ

مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم اس کا موازنہ اس امر سے کرتے ہیں کہ مسیح صلیب کے بعد جب جلد ہی نظر آیا تو ابتدائی مسیحیوں نے اپنی اس رؤیت کا کس رنگ میں ذکر کیا۔ اگر پولوس سمجھتا تھا کہ مسیح حشر نشر کے طور پر جی اٹھا تھا تو اس نے جب مسیح کو دیکھا اور اس سے باتیں کیں تو اس کی اس رؤیت کو اسی رنگ کی رؤیت سمجھا جاسکتا تھا جس طرح کہ ایک وفات یافتہ شخص کی روح دوسری دنیا سے آکر اس دنیا میں ایک سائے یا ایسی شکل و شباہت کے طور پر نظر آتی ہے جیسی کہ مرنے سے پہلے اس کی ہوتی تھی لیکن ابتدائی مسیحیوں کی رؤیت اور اس نوع کی رؤیت میں بہت فرق ہے۔ اس طرح دو قسم کی شہادتوں کے باہم اکٹھا ہو جانے سے عجب الجھاؤ سا پیدا ہو جاتا ہے کہ کس کو صحیح مانا جائے اور کس کو غلط۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے اس شہادت کو زیر غور لائیں جو خود مسیح کے شاگردوں نے دی اور ان لوگوں نے دی جو اگرچہ مسیحیت میں داخل نہ بھی ہوئے ہوں لیکن جو اس سے محبت کا تعلق رکھنے اور اس کا بہت احترام کرنے والے تھے۔ اولیت اور فوقیت کا درجہ رکھنے والی اس شہادت کو پولوس نے غلط رنگ میں سمجھا ہو گا کیونکہ یہ شہادت تو مسیح کے اپنے مادی جسم کے ساتھ زندہ انسانی شکل میں نظر آنے کا ذکر کرتی ہے۔ ایسی حالت کو حشر نشر کے طور پر جی اٹھنے سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے ثبوت کے طور پر اس اصل واقعہ کا ذکر ہی کافی ہے کہ جب مسیح نے واقعۂ صلیب کے بعد جلد ظاہر ہو کر اپنے بعض شاگردوں کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ چنانچہ لکھا ہے:

> "انہوں (یعنی شاگردوں) نے گھبرا کر اور خوف کھا کر یہ سمجھا کہ کسی روح کو دیکھتے ہیں۔ اس نے (یعنی مسیح نے) ان سے کہا تم کیوں گھبراتے ہو؟ اور کس واسطے تمہارے دل میں شک پیدا ہوتے ہیں؟ میرے ہاتھ اور میرے پاؤں دیکھو کہ میں ہی ہوں۔ مجھے چھو کر دیکھو کیونکہ روح کے گوشت اور ہڈی نہیں ہوتی جیسا مجھ میں دیکھتے ہو۔ اور یہ کہہ کر اس نے انہیں اپنے ہاتھ اور پاؤں دکھائے۔ جب مارے خوشی کے ان کو یقین نہ آیا اور تعجب کرتے تھے تو اس نے ان سے کہا کیا یہاں تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟ انہوں نے اسے بھنی ہوئی مچھلی کا قتلہ دیا۔ اس نے لے کر ان کے روبرو کھایا۔"
>
> (لوقا باب 24 آیات 37 تا 43)

یہ واقعہ حشر نشر کے طور پر جی اٹھنے کے نظریہ کی واضح اور قطعی طور پر تردید کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ مسیح نے ضروری سمجھا کہ انہیں کسی ابہام کے بغیر واضح طور پر مشاہدہ کرائے کہ میں وہی شخص یعنی مسیح ہوں اور ہوں بھی بعینہٖ اپنے اسی جسم کے ساتھ۔ محض روح کے روپ میں نہیں ہوں اور نہ ہی میں ایسا وجود ہوں

جسے زندہ رہنے کے لئے خوراک کی احتیاج نہ ہو۔ اس وقت کی معروضی صورت حال سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدائی زمانہ کے مسیحی عجب گومگو کی حالت میں مبتلا تھے۔ وہ مسیح کے زندہ بچ رہنے کو خفیہ رکھنے کی خاطر دو طرح کی باتیں کرنے پر مجبور تھے۔ جب وہ یہ کہتے تھے ہ مسیح مردوں میں سے جی اٹھا ہے تو انہیں شکی مزاج لوگوں سے بھی واسطہ پڑتا تھا اور وہ کسی مردہ جسم کے دوبارہ زندہ ہو جانے کو احمقانہ نظریہ قرار دیتے تھے۔ ایسی صورت میں ابتدائی زمانہ کے مسیحی مجبور ہو جاتے تھے کہ حشر نشر کے رنگ میں زندہ ہونے کا سہارا لیں کیونکہ اس کی فلسفیانہ اور منطقی توجیہہ پیش کی جاسکتی تھی۔ کرنتھیوں کے نام پولوس کا خط خاص طور پر بیک وقت دو کشتیوں میں پاؤں رکھنے کی حالت گومگو کا مطالعہ کرنے کا بہترین موقع فراہم کرتا ہے۔

واقعۂ صلیب کے بعد مسیح کے متعلق ابتدائی مسیحیوں کے بیانات کا جائزہ لینے سے امر واقعہ کی دو صورتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں جن میں سے ایک ہی قابل قبول قرار پاسکتی ہے۔ وہ مسیح جو واقعۂ صلیب کے بعد جلد ہی اپنے شاگردوں اور دوستوں کو نظر آیا جس نے ان سے باتیں کیں، جو ان کے ساتھ رہا اور جو اکثر و بیشتر رات کی تاریکی میں چلتا اور سفر کرتا ہوا صلیب والے علاقہ سے رفتہ رفتہ دور ہوتا چلا گیا وہ یقیناً ایسا شخص نہیں تھا جو حشر نشر کے طور پر احیائے موتی کے رنگ میں زندہ کیا گیا ہو بلکہ وہ ایک ایسا شخص تھا جو یا تو مردہ جسم میں زندگی کے عود کرنے یا بحال ہونے کی وجہ سے جی اٹھا تھا۔ یا پھر وہ ایسا شخص تھا جو مرا ہی نہ تھا بلکہ معجزانہ طور پر قریب المرگ حالت سے باہر آکر موت کے منہ میں جانے سے بچ گیا تھا۔ وہ موت کے یقیناً اس قدر قریب تھا کہ اس کی حالت یونس نبی کی اس حالت کے مشابہ ہوگئی تھی جو اس کی مچھلی کے پیٹ میں ہوئی تھی۔ اس بارہ میں ہمارے ذہن میں قطعاً کوئی شبہ نہیں ہے کہ مؤخر الذکر صورت ہی ہر لحاظ سے واحد قبول صورت ہو سکتی ہے۔

اس خاطر کہ مسیحی صاحبان ہمارے نقطۂ نظر کو آسانی سے سمجھ سکیں میں ایسا ہی یعنی اس سے ملتا جلتا ایک فرضی واقعہ بیان کرتا ہوں۔ فرض کیجئے یہی کہانی زندگی میں حقیقی طور پر آج بھی دہرائی جاتی ہے جو مفروضہ فی الوقت پیش نظر ہے اس کی رو سے کسی شخص کو صلیب دے کر جان سے مارنے کی کوشش کی جاتی ہے اور نتیجۃً اسے مردہ قرار دے دیا جاتا ہے یعنی سمجھ یہ لیا جاتا ہے کہ اس کا کام تمام ہوا۔ بعد میں وہی شخص اپنے بعض ساتھیوں کو گھومتا پھرتا نظر آتا ہے۔ وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس کے ہڈیوں اور گوشت پوست کے جسم پر صلیب کے نشان بھی موجود ہیں اور ان نشانوں کے ساتھ ہی وہ چل پھر رہا ہے۔ اسے دوبارہ پکڑ کر قانون کی گرفت میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ اسے عدالت میں پیش کر کے

استغاثہ کی طرف سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ یہ شخص صلیب دینے کی پہلی کوشش میں کسی نہ کسی طرح موت سے بچ نکلا ہے سو اس کے خلاف جو سزا سنائی گئی تھی اس کے حتمی اور یقینی نفاذ کے لئے اسے ایک دفعہ پھر صلیب دی جائے۔ وہ شخص آگے آتا ہے اور اپنا دفاع کرتے ہوئے اپنے استدلال کی بنیاد اس بات پر اٹھاتا ہے کہ وہ یقیناً صلیب پر ایک دفعہ مر گیا تھا اور اس طرح قانون اور انصاف کے تقاضا کو پورا کرکے اس کا مقصد من کل الوجوہ حاصل کر لیا گیا تھا لیکن خدا کے ایک خاص اقتداری حکم کے تحت وہ مردوں میں سے پھر جی اٹھا ہے۔ موت کے پہلے فیصلہ کو اب دوبارہ نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ پہلی زندگی ختم ہو جانے کے بعد وہ نئی مہلت عطا ہونے پر دنیا میں ایک نئی زندگی گزار رہا ہے۔ اس نئی زندگی میں اس نے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا ہے۔ اگر عدالت اس کے اس مؤقف کو تسلیم کر لیتی ہے تو ظاہر ہے اسے ایک ایسے جرم کی دوبارہ سزا نہیں دی جائے گی جس کا بھگتان وہ پہلے ہی بھگت چکا ہے۔

اگر ایک عیسائی ملک میں ایک عیسائی جج اور جیوری کے عیسائی ارکان کے سامنے ایک ایسا ہی مقدمہ پیش ہونے کا واقعہ رونما ہوتا ہے تو سوچنے والی بات یہ ہے کہ آج کی دنیا میں کتاب کا ایک قاری کیا رائے قائم کرے گا اس بارہ میں کہ وہ جج یا جیوری کے ارکان کیا فیصلہ دیں گے یا یہ کہ انہیں کیا فیصلہ دینا چاہیے؟ جس شخص کے خلاف مقدمہ کی سماعت ہو رہی ہے اگر اس کے مؤقف کو رد کر دیا جاتا ہے اور اس کے خلاف علی الاعلان یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ اسے دوبارہ صلیب پر لٹکا کر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے تو کن بنیادوں اور کیسے اس فیصلہ کو منصفانہ قرار دیا جائے گا؟

یہ امر ظاہر و باہر ہے اور اسے عقل سلیم کی پوری پوری تائید حاصل ہے کہ جج کوئی بھی ہو، عیسائی ہو یا غیر عیسائی اور جیوری کے ارکان بھی صحیح الدماغ ہوں وہ اس مؤقف کو کہ ملزم ایک دفعہ مر جانے کے بعد دوبارہ جی اٹھا ہے پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دیں گے اور ان کا فیصلہ یہی ہو گا کہ ملزم مذکور کا مؤقف ناقابل قبول ہے اس لئے اسے دوبارہ صلیب دی جائے۔ ایسا فیصلہ کلیسیائی، مذہبی، نسلی اور لسانی تعصبات سے یکسر بالا ہو گا اور آفاقی نوعیت کا حامل ہو گا۔ سچ بات یہ ہے کہ کوئی شخص بھی جس کے ہوش و حواس درست ہوں اور جو بہر طور سمجھ بوجھ کا مالک ہو وہ اس فیصلہ کے سوا کوئی اور فیصلہ دے ہی نہیں سکتا۔ الغرض انسانی فہم و ادراک کی آفاقی ہم آہنگی جی اٹھنے اور زندہ ہو جانے کے مؤقف کو مسترد کر دے گی اور یہی فیصلہ دے گی کہ وہ کسی نہ کسی طرح موت سے بچ نکلنے میں کامیابی ہو گیا تھا۔ بعینہٖ یہی کچھ یسوع مسیح کے معاملہ میں بھی ہوا۔ نہ یہ مردہ جسم کے جی اٹھنے کا معاملہ تھا اور نہ یہ معاملہ تھا حشر نشر کے رنگ میں دوبارہ جی

اٹھنے کا۔ بلکہ جیسا کہ عقل عمومی کا تقاضا ہے یہ محض موت سے بچ نکلنے کا واقعہ تھا۔

مسیح کے مردہ جسم کے زندہ ہو جانے کو مسیحیت کی بقا کے لئے بے انتہا اہم قرار دیا جاتا ہے۔ اس مسئلہ کی اس قدر اہمیت کے پیش نظر ہر کسی کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اس اہمیت کے پس پردہ کارفرما اصل وجوہات کا پتہ لگائے۔ ان وجوہات کا پتہ لگانا اس لئے بھی ضروری ہے کہ یہ امر ظاہر و باہر ہے کہ یہ سارے کا سارا واقعہ اپنے جملہ مشمولات کے ساتھ منطق سے یکسر عاری ہے۔ آخر خدا کا ایک نام نہاد بیٹا ایک دفعہ انسانی جسم کے پنجرہ سے آزاد ہونے کے بعد اس قید خانہ میں دوبارہ جا داخل ہونے کو کیوں ترجیح دے؟ اس امر کو کہ وہ واقعی مر گیا تھا اور یہ کہ اس کا مردہ جسم دوبارہ زندگی سے ہمکنار ہو گیا تھا شبہ سے مبرّا کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے؟ اس پہلو پر ہم پہلے بھی کافی حد تک غور کر چکے ہیں۔ انہیں نکات کو دہرانا اور ان پر زور دینا فی الوقت میرے مد نظر نہیں ہے۔ البتہ میں اس تعلق میں کتاب کے قاری کی توجہ ایک بہت اہم سوال کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

وہ سوال یہ ہے کہ ایسے نامعقول خیال نے مسیحی دینیات میں جڑ کیوں پکڑی؟ اور مسیح کے بعد چند صدیوں کے اندر اندر اس نامعقول خیال نے عیسائی اعتقادات کی عمارت کے ستونوں میں سے ایک ایسے مرکزی ستون کی شکل کیوں اختیار کی کہ اس کے قائم رہے بغیر عیسائی دینیات کی پوری کی پوری عمارت دھڑام سے زمین پر آ رہتی ہے؟ ہمیں اس کے لئے ابتدائی زمانہ کے مسیحیوں کے ذہنوں میں جھانک کر اور ان میں اتر کر اصل حقیقت کا پتہ لگانا ہو گا۔ وہ دراصل اس وقت کے معروضی حالات کی وجہ سے عجب گومگو کی حالت میں تھے اور جو الجھن انہیں درپیش تھی اس کا انہیں کوئی حل نظر نہ آ رہا تھا۔ وہ یہ کہہ نہیں سکتے تھے کہ مسیح کو صلیب پر سے زندہ اتار لیا گیا تھا ورنہ پکڑ دھکڑ کا سلسلہ پھر شروع ہو جاتا۔ انہوں نے حالات کو موڑنا اور انہیں ایک اور ہی سانچہ میں ڈھالنا شروع کیا۔ اس کوشش میں رفتہ رفتہ مسیحیت کو ایک ایسی شکل دے دی گئی جو حقیقت سے بہت مختلف تھی۔ ان کی اصل الجھن اور مشکل کو جان لینے سے مسیحیت کے بننے اور بگڑنے کے عمل کو زیادہ گہرائی میں جا کر سمجھنا ہمارے لئے آسان ہو جائے گا۔ اس ضمن میں وہ ٹھوس حقیقت جس پر توجہ کو مرکوز کرنا ضروری ہے محض یہ ہے کہ اگر مسیح (علیہ السلام) فی الواقعہ صلیب پر مر گئے تھے تو یہودیوں کی نگاہ میں واضح طور پر جھوٹے اور فریبی قرار پائیں گے۔ یہ تھی وہ الجھن جس میں سے نکلنے کی کوشش میں وہ سرگرداں تھے۔

خدا کے مقدّس نبی کے خلاف جگر پاش زبان درازی

جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جاچکا ہے صحیفوں میں یہ پیش گوئی موجود تھی کہ اگر کوئی جھوٹا مدعیٔ نبوت خدا کی طرف کوئی ایسی بات منسوب کرے گا جو اس نے کہی نہ ہو گی تو اسے درخت کے ساتھ لٹکایا جائے گا۔ اس لحاظ سے مسیح کا صلیب پر مرنا مسیحیت کی موت کے مترادف ٹھہرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہودیوں کا مستند مذہبی لٹریچر مسیح کی صلیبی موت کے متعلق انتہائی دل آزار طعن و تشنیع اور خرافات سے بھرا پڑا ہے۔ مسیح کے ہم عصر مخالف بالخصوص بائبل کے مذکور حوالہ کی رو سے ڈنکے کی چوٹ کہا کرتے تھے کہ وہ بلاشبہ جھوٹا ثابت ہو چکا ہے۔ اس کے جھوٹا ہونے میں شک و شبہ کے کسی شائبہ کی بھی گنجائش نہیں۔ ان کے دلوں میں مسیح کے لئے حبہ برابر بھی احترام باقی نہیں رہا تھا۔ وہ اس کے خلاف بہت ہی گندی اور اہانت آمیز زبان استعمال کرتے تھے۔ ہر شخص جو مسیح سے محبت رکھتا تھا ایسی گندہ دہنی برداشت نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہم برداشت کر سکتے ہیں کیونکہ ہم اسے خدا کا ایک سچا اور برگزیدہ رسول مانتے ہیں اور اس کے اس مرتبہ کی وجہ سے اس سے محبت رکھتے ہیں۔ ہر کوئی یہودیوں کے طعن و تشنیع اور گندہ دہنی پر ابتدائی مسیحیوں کی کربناک اذیت اور دلی دکھ درد کا بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے۔ وہ کیوں اذیت محسوس نہ کرتے جبکہ وہ اسے خدا کا سچا پاک و مقدّس اور پارسا رسول سمجھتے تھے اور اس بات پر ایمان رکھتے تھے کہ وہ مسیحا کے اعلیٰ منصب پر فائز اور ان کا نجات دہندہ ہے۔ وہ ایسی گندی زبان کے خلاف اپنا دفاع کیسے کریں گے جبکہ اسے اس گندی اور ناپاک زبان کے بالمقابل پڑھا جائے جو ہمیں آج کے زمانہ میں سلمان رشدی کی بدنام زمانہ کتاب 'The Satanic Verses' میں ملتی ہے اور ہمارے دلوں کو بری طرح زخمی کرتی ہے۔

دونوں کی طرف سے شرافت اور شائستگی کا ایسا مکمل فقدان انسانیت کی پستی اور گراوٹ کی اتھاہ گہرائیوں میں اترنے اور اسفل السافلین میں جا داخل ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ آگے ہم قدیمی یہودی لٹریچر سے جو اقتباسات درج کریں گے ان سے قارئین کتاب کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب پاک و مطہر اور مقدّس ہستیوں کے ہلکائے ہوئے جنونی مخالف جھپٹ جھپٹ کر انہیں انتہائی گستاخانہ اخلاق سوز حملوں کا نشانہ بناتے ہیں تو شرافت و نجابت کی انسانی اقدار کا جنازہ نکلنے سے معتقدین کے دلوں پر کیا بیتتی ہے۔

طالمود یہودیوں کی وہ کتاب ہے جس میں ان کے عقائد درج ہیں اور ان کے مذہبی علوم کو جس میں بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے اس میں یہ امر ذہن نشین کرایا گیا ہے کہ نعوذباللہ نہ صرف یہ کہ مسیح

ولد الحرام تھا بلکہ اس کی ماں مریم کے ایام حیض میں اس کا حمل ٹھہرا تھا اور ٹھہرا بھی تھا ایک خبیث روح کی وساطت سے اس لئے وہ بلحاظ ولادت دوغلا تھا۔ اس کتاب میں مزید واضح کیا گیا ہے کہ اس کے اندر ESAU کی روح تھی۔ وہ احمق، شعبدہ باز اور عورتوں کو ورغلانے والا تھا۔ بالآخر اسے صلیب دی گئی اور دوزخ اس کا آخری ٹھکانہ بنی۔ اس کے ماننے والوں نے اس کے بت نصب کر رکھے ہیں جن کی وہ پرستش کرتے ہیں۔ یہودی لٹریچر کے جو اقتباسات ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں وہ ریورنڈ آئی۔بی۔ پرانائٹس کی کتاب (The Talmud Unmasked by J. B. Pranaitis) سے ماخوذ ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

'*Kallah*' نامی ٹریکٹ کے صفحہ 1b پر درج ہے:

ایک دن ایسا ہوا کہ دینی اکابر (یہودی فقیہی اور فریسی) ہیکل کے دروازہ پر بیٹھے تھے، دو نوجوان وہاں سے گزرے۔ ان میں سے ایک نے اپنا سر ڈھانپ رکھا تھا اور دوسرا ننگے سر تھا۔ ربی الائزر (Eliezer) نے کہا وہ جو ننگے سر تھا وہ ولد الزنا ہے۔ ربی جیہوشوا (Jehoshua) نے کہا مجھے یقین ہے کہ وہ ایام حیض کے دوران استقرار حمل کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا۔ ربی اکیباہ (Akibah) بولا دونوں باتیں درست ہیں۔ اس پر دوسروں نے ربی اکیباہ سے کہا کہ وہ اپنے ساتھی علما کو جھٹلانے اور ان کی تردید کرنے کی کیسے جرأت کر رہا ہے۔ اس نے جواب دیا وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اسے ثابت کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ لڑکے کی ماں کے پاس گیا جو منڈی میں بیٹھی سبزی بیچ رہی تھی۔ اس نے عورت کو مخاطب کر کے کہا "اے میری بیٹی! میں تجھ سے جو کچھ پوچھنے لگا ہوں اگر تو سچ بولے گی اور اس کا صحیح جواب دے گی تو میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگلی زندگی میں تو بچائی جائے گی اور نجات یافتہ قرار پائے گی۔" اس عورت نے مطالبہ کیا کہ وہ قسم کھا کر کہے کہ اپنے وعدہ پر قائم رہے گا۔ ربی اکیباہ نے ایسا ہی کیا لیکن اس نے اپنی قسم کو اپنے ہونٹوں کی حرکت تک ہی محدود رکھا اور اپنے قلب پر اس کا کوئی اثر قبول نہ کیا۔ اس کے بعد اس نے پوچھا "مجھے یہ بتا تیرا بیٹا پیدا کیسے ہوا تھا؟" اس پر اس عورت نے جواب دیا "جس روز میری شادی ہوئی اس روز مجھے حیض آ رہا تھا اس پر میرا خاوند مجھ کو اکیلا چھوڑ کر چلا گیا لیکن ایک بدروح آئی اور میرے ساتھ ہم بستر ہوئی اور اس مجامعت کے نتیجہ میں میرے ہاں یہ بیٹا پیدا ہوا"۔ اس طرح یہ بات ثابت ہو گئی کہ وہ نوجوان نہ صرف ولد الزنا تھا

بلکہ اس کا حمل بھی ایام حیض میں ٹھہرا تھا۔ جب معترضین نے یہ سنا تو انہوں نے کہا "بلاشبہ رِبی اکیباہ عظیم ہے اس نے تو اپنے بڑوں کی غلطی دور کر دکھائی۔" پھر انہوں نے بڑے جذبہ سے کہا "اسرائیل کے خداوند خدا کی تقدیس بلند ہو جس نے رِبی اکیباہ بن یوسف پر اپنا غیب ظاہر کیا۔"

"اب رہا یہ امر کہ یہودیوں کے نزدیک اس کہانی کا تعلق مسیح اور اس کی ماں مریم سے ہے تو اس کا صاف اور واضح الفاظ میں ذکر ان کی کتاب Toldath Jeshu (مسیح کی نسل) میں موجود ہے۔ اس میں ہمارے نجات دہندہ (یسوع مسیح) کا ذکر قریباً انہی الفاظ میں کیا گیا ہے۔"

(The Talmud Unmasked by Rev. I. B. Pranaitis Part I, Chapter 1, Page 30)

مسیح کے مخالف و معاند یہودیوں نے اپنے لٹریچر میں مسیح کے مقدس نام اور ذات پر جس طرح کیچڑ اچھال اچھال کر عفونت و غلاظت اور گندگی کی بھرمار کی ہے اس پر انسانی شرافت و شائستگی گھن کھاتی اور سر پیٹ کر رہ جاتی ہے۔ یقیناً مسیح مریم نامی ایک پاک دامن، مقدس و مطہر خاتون کے حاملہ ہونے سے تولد ہوا اور اس حمل کے ٹھہرنے میں ہمارے خداوند قدوس کی لامتناہی تخلیقی قدرتوں کے سوا کسی اور کا کوئی دخل یا تعلق نہ تھا۔ کسی بدروح کی مجامعت سے ایام حیض میں حمل ٹھہرنے کا نظریہ اس عفونت بھرے دماغ پر زیادہ موزونیت کے ساتھ صادق آتا ہے جس میں اس شرِ عظیم کا خیال پیدا ہوا۔ افسوس! ان بدباطن اور بدقماش لوگوں کی زبانیں اور قلمیں جو یکساں زہر اگلتی اور غلاظت بکھیرتی ہیں نہ مقدس و مطہر خاوندوں کی ازواج کو متہم کرنے سے باز آتی ہیں اور نہ ان کی ماؤں پر تہمتیں لگانے میں عار محسوس کرتی ہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ایسا گالیاں دینے والا اور گند بکنے والا دو ہزار سال پہلے گزرا تھا یا عصر حاضر کی دنیا میں پیدا ہوا۔ کس قدر حیران کن ہے یہ امر آج کی مہذّب کہلانے والی سوسائٹیاں اور معاشرے ایسی بہیمیت پر اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ قلم اور زبان کی آزادی کے نام پر ایسی بھیانک اور سنگین دل آزاریوں کی اجازت دینے اور ان کی تصدیق کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔

سلمان رشدی نے ہادی اسلام حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات کے خلاف جو زبان استعمال کی ہے وہ اس گندہ ذہنی سے مختلف نہیں ہے جو مسیح کی پارسا پاک دامن اور مطہر والدہ کے لیے یہود نے استعمال کی تھی۔

پھر ریورنڈ پرانائٹس نے اپنی مذکورہ کتاب میں طالمود کی بعض اور عبارتیں بھی درج کی ہیں۔ وہ

لکھتے ہیں:

”Sanhedrin (67a) میں یہ بھی لکھا ہے:

یہ ہے وہ کچھ جو انہوں نے لد (Lud) میں ستادا (Stada) عورت کے بیٹے کے ساتھ کیا۔ انہوں نے عید فسح کی شام کو اسے صلیب پر ٹکادیا۔ ستادا کا یہ لڑکا فرزند تھا پنڈیرا (Pandira) کا۔ ربی چاسدا (Chasda) ہمیں بتاتا ہے کہ پنڈیرا، ستادا کا خاوند تھا، وہی ستادا جو اس آدمی کی ماں تھی اور وہ یہودا کے بیٹے پافس (Paphus) کے زمانہ میں وہاں رہتا تھا“۔

Sanhedrin (67a)

مندرجہ بالا فقرات درج کرنے کے بعد ریورنڈا آئی بی پرانائٹس نے اپنی مذکورہ کتاب ”دی طالمود ان ماسکڈ“ میں یہ تبصرہ کیا ہے:

”ان فقرات کا مطلب یہ ہے کہ یہ مریم ہی تھی جو ستادا کہلاتی تھی۔ ستادا کہتے ہیں کنجنی کو کیونکہ پمبادتا (Pambadita) میں جو کچھ پڑھا جاتا تھا اس کی رو سے اس عورت نے اپنے خاوند کو چھوڑ دیا اور زنا کی مرتکب ہوئی۔ یہی بات یروشلم، طالمود اور میمونائڈز (Jerusalem Talmud & Maimonides) میں بھی لکھی ہے۔

جو لوگ ایسی شیطانی کذب بیانیوں میں یقین رکھتے ہیں وہ زیادہ نفرت اور ملامت کے سزاوار ہیں یا زیادہ رحم کے۔ اس بارہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

یہ تبصرہ بلاشبہ ایک بے بس اور بے چارے مظلوم دل کی کرب و اذیت کی آئینہ دار ایک چیخ یا پکار ہے۔ یہ مظلوم دل اس کے اپنے محبوب آقا کے خلاف ایک کٹر جنونی مخالف کی طرف سے کیے جانے والے تمسخر اور استہزا اور اہانت پر بے اختیار تڑپ اٹھا ہے۔ ابتدائی مسیحیوں کو تو اس زمانہ کے سنگدل یہود کی طرف سے رَوَا رکھے جانے والے تمسخر و استہزا اور اہانت و ذلت پر اس سے کہیں زیادہ اذیت اٹھانا پڑی ہو گی حتیٰ کہ ان مظلوموں کی زندگی تو ان کے لئے جہنم بن گئی ہو گی۔ انہیں تو ان دشنام طرازیوں اور دل پاش و جگر خراش گندہ دہنیوں کی اذیت سہنا پڑی ہو گی جن کا نشانہ کسی ایسے پیارے وجود کو نہیں بنایا جارہا تھا جس کی یاد ماضی بعید کے دھندلکوں میں مدھم پڑ گئی ہو بلکہ وہ تو اس مقدس وجود کے خلاف دشنام طرازیوں اور استہزاؤں کی ناقابل بیان اذیت سہ رہے تھے جس کی یادیں ابھی تازہ اور زندہ تھیں، جیسے انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور جس کی دل نواز باتوں کو اپنے کانوں سے سنا تھا اور جس کی پاک تریاق صحبت میں

انہوں نے اپنی زندگی کے بعض بہت ہی حسین اور بیش قیمت لمحات گزارے تھے۔ اس میں کیا شک ہے کہ انہیں ایک دردناک عذاب میں مبتلا کر دیا گیا ہو گا کیونکہ محض گھناؤنا استہزا ہی نہیں تھا جو انہیں اذیت پہنچا رہا تھا بلکہ وہ اس سے کہیں بڑھ کر تعزیر و تعذیب کے بظاہر نہ ختم ہونے والے سلسلہ سے دوچار تھے کیونکہ یسوع مسیح کے خلاف شکایتوں، مؤاخذے، پکڑ دھکڑ، باز پرس، عدالتی کارروائی کے چکّر اور صلیب پر مار ڈالنے کی کوشش کے طویل عمل نے اسے بے عزتی اور بے حرمتی کا نشانہ بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی تھی۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس زمانہ کے آزاد مغرب کے عیسائی ضمیر کروڑوں کروڑ مسلمانوں کو پہنچنے والی اذیت اور کرب کو سمجھنے اور اس کا احساس کرنے کی کچھ تو کوشش کریں جنہیں ان کے جان و دل سے عزیز آقا محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس اور ان کے قدسی صفات صحابہ کے خلاف ایسی ہی غیر انسانی اور سراسر اخلاق سوز زبان استعمال کر کے کچھ کم مبتلائے عذاب نہیں کیا جاتا۔

ابتدائی مسیحیوں کو یہ سب دکھ، اذیت اور عذاب جھیلنا پڑا اور اس امر کے باوجود جھیلنا پڑا کہ یہ بات ان کے ذاتی علم میں تھی اور اس کے ناقابل تردید ثبوت موجود تھے کہ مسیح زندہ تھا اور اس کی موت کے بارہ میں یہودیوں کے فخریہ ڈھنڈورا پیٹنے اور آسمان سر پر اٹھانے کے علی الرغم صلیب پر مرا نہ تھا۔ ان ابتدائی مسیحیوں نے مسیح کے صلیب پر سے اترنے کے بعد خود اپنے ہاتھوں سے اس کے زخموں کا علاج کیا تھا۔ اس کا جسم اس حال میں کہ اس پر بے ہوشی اور سکتہ کا عالم طاری تھا ان کے حوالہ کیا گیا تھا۔ انہوں نے اسے اس گہری بے ہوشی اور سکتہ کی حالت سے باہر آتے اور معجزانہ طور پر شفایاب ہوتے دیکھا تھا۔ انہوں نے اسے سائے، بھوت پریت یا روح کی شکل میں نہیں بلکہ اسی کمزور اور نقاہت زدہ انسانی جسم کی شکل میں دیکھا تھا جس نے خدا کی راہ میں حق و صداقت کی خاطر بے انتہا دکھ اٹھائے تھے۔ ان بظاہر جان لیوا دکھوں اور تکلیفوں کے باوجود وہ موت کے منہ سے بچ نکلا تھا۔ انہوں نے اس سے باتیں کی تھیں، اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا تھا اور اسے راتوں کو چھپتے چھپاتے، قدم بقدم چلتے اور صلیب والی جگہ سے دور سے دور تر ہوتے اور اس علاقہ کو خیر باد کہہ کر وہاں سے ہجرت کرتے ہوئے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

آسمان کی طرف اٹھایا جانا

سینٹ متی (St. Matthew) اور سینٹ جان (St. John) نے اپنی انجیلوں میں مسیح کے آسمان پر اٹھائے جانے کا ذکر تک نہیں کیا ہے۔ اگر واقعی مسیح آسمان پر اٹھایا گیا تھا تو ایسے اہم واقعہ کا ان اناجیل میں

ذکر نہ پاکر انسان حیرت میں پڑے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ایسی فروگزاشت ان سے ہو کیسے سکتی تھی۔ اور اگر ہوئی تو کیوں ہوئی؟ دوسری دو نسبتاً مختصر اناجیل جن میں آسمان پر اٹھائے جانے کا ذکر ملتا ہے وہ ہیں مرقس اور لوقا کی اناجیل:

1۔ ”غرض خداوند یسوع مسیح ان سے کلام کرنے کے بعد آسمان پر اٹھایا گیا اور خدا کی دہنی طرف بیٹھ گیا۔“

(مرقس باب16 آیت19)

2۔ ”جب وہ انہیں برکت دے رہا تھا تو ایسا ہوا کہ ان سے جدا ہو گیا اور آسمان پر اٹھایا گیا۔“

(لوقا باب24 آیت51)

تاہم ٹھوس سائنسی بنیادوں پر کی جانے والی فاضلانہ تحقیق کے نتیجہ میں یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ ان دونوں اناجیل میں آسمان پر اٹھائے جانے کا جو ذکر آتا ہے وہ الحاقی ہے یعنی بعد کے زمانہ میں کسی نے اس کا ان میں اضافہ کر دیا۔ ابتداء میں مرقس اور لوقا نے خود جو اصل متن مرتب کیا تھا اس میں یہ آیات سرے سے موجود ہی نہیں تھیں۔ وہ مخطوطہ جو کوڈیکس سینی آٹیکس (Codex Siniaticus) کہلاتا ہے چوتھی صدی عیسوی کا ہے اور اسے عہد نامہ قدیم و جدید کا قدیم ترین متن تسلیم کیا جاتا ہے۔[4] یہ مخطوطہ خود اپنی ذات میں اس حقیقت پر گواہ ہے کہ مرقس اور لوقا دونوں کی اناجیل میں مذکورہ آیات آغاز کار مرتب ہونے والے اصل اور مستند نسخہ میں شامل نہ تھیں اور یقیناً کسی کاتب یا نقل نویس نے بہت بعد کے زمانہ میں اپنی مرضی سے ان کا اضافہ کر دیا۔ Codex Siniaticus کے مخطوطہ میں مرقس کی انجیل باب16 کی آیت8 پر ختم ہو جاتی ہے۔ اب تو اس حقیقت کو بائبل کے بعض جدید ایڈیشنوں میں بھی تسلیم کر لیا گیا ہے۔[5]

اس قدیم ترین مخطوطہ میں لوقا کی انجیل کے باب24 کی آیت51 میں ”آسمان پر اٹھا لیا گیا“ کے الفاظ موجود نہیں ہیں۔ متن کے محقق اور تجزیہ نگار سی۔ ایس۔ سی۔ ولیمز (C.S.C.Williams) کے نزدیک اگر (Codex Siniaticus) کے مخطوطہ میں ان کا موجود نہ ہونا درست ہے تو اناجیل کے اصل ابتدائی متون میں مسیح کے آسمان پر اٹھائے جانے کا سرے سے کوئی ذکر ہی موجود نہ تھا۔[6]

[4] Pg.18, Jesus: the Evidence by Ian Wilson (1984)

[5] (Holy Bible New International Version (1984) by International Bible Society p.1024)

[6] (Secrets of Mount Sinai, The Story of Finding the World's Oldest Bible–Codex Sinaiticus by James Bentley p.131)

حتیٰ کہ Jehovah's Witnesses کو بھی (جو ایک عیسائی فرقہ کے افراد ہیں اور جو مسیح کی ابنیت اور اپنے "باپ خدا" کی طرف اس کے اٹھائے جانے کے بڑے پرجوش حامی ہیں) بالآخر تسلیم کرنا پڑا ہے کہ مرقس اور لوقا کی اناجیل میں آسمان پر اٹھائے جانے کی آیات الحاقی ہیں، ان کی سرے سے کوئی بنیاد نہیں ہے کیونکہ ابتدائی اصل متن میں وہ سرے سے موجود نہیں ہیں[7]۔

مسیح کے جسم کے ساتھ کیا گزری؟

عقل عمومی اور منطقی استدلال کی رو سے جب قریبی نظر سے بغور جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ آسمان پر اٹھائے جانے کے سلسلہ وار واقعات کو آج کل کے مسیحی کسی انداز میں پیش کرتے ہیں تو ان واقعات میں پوشیدہ اور ان کے ساتھ وابستہ مزید نامعقولیتیں آشکار ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔ جہاں تک مسیح کے اسی انسانی جسم میں واپس لوٹ آنے کے سوال کا تعلق ہے اس کے بارہ میں پہلے ہی بہت کچھ روشنی ڈالی جاچکی ہے۔ ہم اس میں صرف ایک بات کا اضافہ اور کرنا چاہتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر بفرض محال آخر میں مسیح آسمان پر اٹھا ہی لیا گیا تھا تو جس مادی جسم کے ساتھ وہ آسمان پر اٹھایا گیا تھا وہاں اس جسم پر نہ جانے کیا گزری ہوگی۔

جب مسیحیوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا جاتا ہے کہ آسمان پر مسیح کے مادی جسم کا کیا بنا اور اس پر کیا بیتی تو بعض مسیحی کہہ دیا کرتے ہیں کہ جب وہ اپنے آسمانی باپ کے پاس پہنچا تو اس کا گوشت پوست کا مادی جسم منتشر ہوکر ایک شعلہ نما چمکار میں بھک سے اڑ کر نابود ہوگیا۔ اس سے بنیادی نوعیت کا ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسانی جسم سے مسیح کی علیحدگی نے ایسے دھماکہ خیز واقع پر منتج ہونا تھا تو انسانی جسم کے ساتھ یہ دھماکہ اس وقت کیوں نہ رونما ہوا جب اولاً مبینہ طور پر یہ کہا گیا تھا کہ وہ مر گیا ہے۔ مسیح کی موت کا جو حوالہ ہمیں بائبل میں ملتا ہے وہ اس موقع سے تعلق رکھتا ہے کہ جب وہ صلیب پر لٹکا ہوا تھا، متی کے الفاظ میں وہ حوالہ یہ ہے کہ "اس نے جان دے دی" اس کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ کہنے والے کے نزدیک روح اس کے جسم میں سے پرواز کر گئی۔ ظاہری طور پر تو بجز اس کے اور کچھ وقوع میں نہ آیا کہ روح آہستگی سے جسم سے نکل گئی۔ یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ وہ صلیب پر مرا نہ تھا کیونکہ روح کے انسانی جسم کو چھوڑنے کی صورت میں اس وقت بھی اس کا جسم اسی انداز میں بھک سے اڑ کر ختم ہو سکتا تھا۔ ایسا اس وقت کیوں ہوا

[7] (New World Translation)

جب مسیح نے دوسری مرتبہ جسم سے علیحدگی اختیار کی۔ اندریں حالات پر غور و فکر اور تحقیق کے دو ہی امکانی راستے کھلتے ہوئے نظر آتے ہیں:۔

1۔ اوّل یہ کہ جب مسیح کی روح انسانی جسم میں دوبارہ واپس آئی تو مسیح کی شخصیت دائمی طور پر اس کے ساتھ وابستہ نہ رہی اور یہ کہ اس نے آسمان پر اٹھائے جانے کے دوران انسانی جسم کو پرے پھینک دیا اور وہ خالص خدا کی روح کے طور پر آسمان پر چڑھ گیا۔

اس صورت حال کا نہ تو حقائق ساتھ دیتے ہیں اور نہ ہی یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ ایسا ہوا ہو گا کیونکہ ایسا تصور ایک ایسی بند گلی میں پہنچانے کا موجب بنتا ہے کہ جہاں یہ تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ مسیح پر ایک دفعہ نہیں بلکہ دو دفعہ موت وارد ہوئی۔ پہلی مرتبہ وہ صلیب پر مرا اور دوسری مرتبہ اسے پھر آسمان پر اٹھائے جانے کے دوران موت کے منہ میں جانا پڑا۔

2۔ دوسرا رستہ یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ مسیح انسانی جسم کے خول میں دائمی طور پر محدود و مقید رہا۔

اس صورت حال کو بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ہے ہی کلی طور پر گھناؤنی اور یک قلم رد کر دینے کے قابل کیونکہ ایسی صورت حال خدا کی ہستی کی شان اور جلال و جبروت سے قطعاً کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔

اس کے بالمقابل ایک عقل عمومی کا نقطۂ نظر بھی ہے "لیکن یہ سمجھنا بھی غلط ہو گا کہ مسیح کے آسمان پر اٹھائے جانے کو ایک قدیمی خلائی سفر تصور کیا جائے اور آسمان کو سورج، چاند اور کہکشاؤں سے بھی پرے واقع کوئی جگہ مانا جائے، "سچائی نہ یہاں ہے نہ وہاں۔[8]

ایسی انوکھی کہانی گھڑنے کا محرک وہ عقدۂ لاینحل ہوا ہو گا جس کا مسیحیوں کو مسیحیت کی نوزائیدگی اور ناپختہ کاری کے زمانہ میں واسطہ پڑا ہو گا۔ جب مسیح نظروں سے غائب ہو گیا تو قدرتی طور پر یہ سوال اٹھایا گیا ہو گا کہ وہ کہاں غائب ہو گیا اور اس کے ساتھ ہوا کیا؟ ابتدائی مسیحی اس حیرانی اور سرگشتگی کو علی الاعلان یہ کہہ کر تو دور نہ کر سکتے تھے کہ چونکہ وہ مرا نہیں تھا اس لیے پیچھے جسم چھوڑ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ وہ کہہ سکتے تھے کہ وہ اپنے زندہ جسم کے ساتھ یہاں سے ہجرت کر گیا ہے۔ اس اقرار سے جسم کے غائب ہو جانے کا معاملہ آسانی سے حل ہو سکتا تھا لیکن یہ اقرار کرنا ان کے لئے ممکن ہی نہ تھا۔ ان میں سے جو بھی اس امر کا اقرار کرنے کی جرات کرتے کہ مسیح زندہ نظر آیا تھا اور رفتہ رفتہ وہ یہودیہ کی حدود سے نکل

[8] The Lion Handbook of Christian Belief, Lion London (1982), p.120.

کر کہیں دور چلا گیا تو وہ رومن قانون کی گرفت میں آئے بغیر نہ رہتے کہ مسیح کے انصاف سے بچ نکلنے کے جرم میں وہ اس کے مدد و معاون ہوئے۔ آسمان پر اٹھائے جانے کی کہانی گھڑنے کا خیال خواہ کتنا ہی انوکھا اور نرالا کیوں نہ ہو اس راہ کو اختیار کرنے اور اس کی آڑ میں پناہ لینے کا راستہ نسبتاً محفوظ ضرور تھا لیکن اس میں شک نہیں کہ اس طرح جھوٹ میں ملوث ہونا پڑتا تھا۔ ہمیں مسیح کے ابتدائی شاگردوں کی امانت و دیانت کی صلابت کو خراج تحسین پیش کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے نہایت پر خطر صورت حال سے دوچار ہونے کے باوجود کسی جھوٹے اور خلاف واقعہ بیان یا من گھڑت کہانی میں پناہ نہیں لی۔ اناجیل اربعہ کے چاروں مصنفین نے غلط بیانیوں کے دھند کے پردہ کے پیچھے پناہ لینے کی بجائے اس بارہ میں خاموشی اختیار کرنے کی راہ اپنائے رکھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح انہیں اپنے مخالفین و معاندین کے تمسخر و استہزا اور ایذا رسانیوں کا نشانہ بننا پڑا ہوگا لیکن انہوں نے یہ سب کچھ خاموشی اور صبر سے برداشت کرنے کو ترجیح دی۔

ان لوگوں کی طرف سے جنہیں اندرونی کہانی یا یوں کہہ لیں کہ اصل حقیقت کا علم تھا پر اسرار خاموشی کا ایک اثر اس رنگ میں ظاہر ہوا کہ بعد کے زمانوں میں آنے والی عیسائی نسلوں کے ذہنوں میں شکوک و شبہات پیدا ہوتے اور پنپتے چلے گئے۔ صلیب پر مر جانے کی عام یہودی روایت کے زیر اثر وہ ضرور حیران ہوئے ہوں گے کہ یہ کیا بات ہے کہ جب مسیح کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی تھی تو پیچھے اس کے جسم کے باقی رہ جانے کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ وہ سوچتے ہوں گے کہ آخر جسم کہاں غائب ہو گیا اور اس کا بنا کیا؟ اگر یہ سمجھا جائے کہ مسیح کی روح اس کے جسم میں واپس لوٹ آئی تھی تو وہ واپس آئی کیوں اور اس کے واپس آنے میں کیا راز پوشیدہ تھا؟ ان بنیادی سوالات کا خاطر خواہ جواب نہ ملنے کے نتیجہ میں نت نئے سوالات کا ذہنوں میں پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ اگر زندگی بحال ہونے سے مراد یہ تھی کہ مسیح اسی جسم میں پھر واپس لوٹ آیا تو مادی انسانی ڈھانچہ کی قید میں دوبارہ لوٹ آنے کے بعد یسوع مسیح کے ساتھ کیا کچھ پیش آیا اور اسے دوسری مرتبہ کن حالات میں سے گزرنا پڑا؟ کیا اب کے وہ اس جسم میں دائمی طور پر مقید و مقفل ہو کر رہ گیا تھا اور اس سے دوبارہ رہائی ممکن نہ رہ تھی؟ برخلاف اس کے اگر مسیح کی روح ایک دفعہ پھر اس جسم سے رخصت ہوئی تو وہ زندگی کی بحالی عارضی تھی یا مستقل؟ اگر وہ اس جسم میں مقید و مقفل نہ رہا تھا تو دوسری بار موت واقع ہونے پر اس جسم کا بنا کیا؟ اسے دفنایا کہاں گیا؟ کیا اس کی تدفین کا تاریخی دستاویزات یا قدیم مخطوطات میں کوئی ذکر ملتا ہے؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اور اس قسم کی بعض اور سوالات ابتدائی زمانہ میں پیدا نہ ہوئے ہوں تو بعد کی صدیوں میں جبکہ ازروئے تاریخ مسیح کی پر اسرار زندگی کے بارہ میں مسیحی علما اور ماہرین دینیات کے مابین فلسفیانہ بحثوں کا سلسلہ چھڑا تو ذہنوں میں اس قسم کے سوالات نے کچھ کھلبلی نہیں مچائی ہوگی۔ لگتا یہ ہے کہ بعض بے اصول اور غیر ذمہ دارانہ کاتبوں اور نقل نویسوں نے اس مشکل میں سے نکلنے اور اس جھنجھٹ سے جان چھڑانے کے لئے سینٹ مرقس کی انجیل میں تصرف سے کام لیتے ہوئے آخری بارہ آیات کا اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہوگا اور اس کی طرف یہ جھوٹا بیان منسوب کر دیا ہوگا کہ آخر میں مسیح اس جسم کے ساتھ آسمان سے بلند ہوتا اور اوپر کی طرف چڑھتا ہوا نظر آیا۔ جھوٹی باتیں گھڑنے والے ذہنوں نے سینٹ لوقا کی انجیل کو بھی نہیں بخشا ہوگا اور اس میں بھی تحریف کر ڈالی ہوگی اور اس کے باب 24 کی آیت 51 میں بڑی ہوشیاری سے کیے گئے ان الفاظ کے اضافہ نے کہ "اس کو آسمان پر اٹھالیا گیا" تحریف کرنے کے مقصد کو پورا کر دکھایا ہوگا۔ اس طرح اس نے سوالات کی بھرمار کے طویل سلسلہ کو ہمیشہ کے لئے بند کرنے کا بندوبست کر دیا ہوگا۔ اور مسیحی عقیدہ کا کم از کم ایک بھید حل ہونے کی راہ نکل آئی ہوگی۔ لیکن یہ راہ نکالی بھی تو کس قیمت پر؟ ظاہر ہے راہ نکالی یسوع مسیح کی مقدس شخصیت سے تعلق رکھنے والے سنجیدہ و پروقار حقائق کی قربانی دے کر۔ سو گویا اتنی بھاری قیمت ادا کی کہ حقائق کی قربانی دے کر۔ سو گویا اتنی بھاری قیمت ادا کی کہ حقائق کو فسانہ طرازی اور داستاں سرائی کی بھینٹ چڑھا ڈالا۔ بس پھر کیا تھا چل سو چل حقائق سے فسانے کی طرف مسیحیت کا سفر ایسا شروع ہوا کہ بلا روک ٹوک اور بے دھڑک آگے سے آگے ہی چلتا چلا گیا۔

ہمارے علم کی رُو سے یہ بات یقینی ہے (اور ایسا ہونا ناگزیر تھا) کہ مسیح کے مردہ جسم کو نہ پا کر یہودی بہت برہم اور پریشان ہوئے۔ (متی باب 28 آیات 11 تا 15)۔ وہ مسیح کی موت کا حتمی اور یقینی ثبوت حاصل کرنا چاہتے تھے اس کے لئے انہیں ہمہ گیر نوعیت کا مسلمہ ثبوت درکار تھا اور وہ تھا مردہ جسم کا موجود اور دستیاب ہونا۔ حتمی ثبوت کے ناپید ہونے پر ان کا پیلاطوس کے پاس شکایت لے جانا ان کی بے چینی اور بے کلی کو واضح طور پر آشکار کر دکھاتا ہے۔ (متی باب 27 آیات 62 تا 64)

اگر دیکھا جائے تو سادہ اور حقیقی جواب اس حقیقت میں پنہاں تھا کہ چونکہ مسیح اس طور پر نہیں مرا تھا جس طور پر یقین کر لیا گیا تھا اس لئے جسم کے غائب ہونے کا سوال تھا ہی سرے سے بے محل۔ اس نے تو یقیناً اپنے وعدہ پر قائم رہتے ہوئے اسرائیل کے گھرانے کی گمشدہ بھیڑوں کی تلاش میں یہودیہ کو خیر باد کہہ دینا تھا۔ ظاہر ہے وہاں سے ہجرت کر جانے کے بعد وہ دوبارہ وہاں نظر نہیں آ سکتا تھا۔

احمدی مسلمانوں کا نقطۂ نظر

مسیح کے مفقود الخبر ہو جانے اور اس کے اتہ پتہ کے متعلق احمدی مسلمانوں کا نقطۂ نظر بالکل واضح ہے اس لئے کہ وہ منطقی استدلال پر پورا اترنے والا اور حقائق پر مبنی ہے۔ یہ نقطۂ نظر مسیح کی شخصیت کو اور جو کچھ اس کے ساتھ پیش آیا اسے حقائق کی روشنی میں پیش کرتا ہے۔ اس کے گرد حق و صداقت کا نورانی ہالہ بنا ہوا ہے۔ یسوع مسیح کی حقیقت خود اپنی ذات میں اس قدر حسین ہے کہ اس کے گرد کسی بھید اور راز کا سجا سجایا مرصع سنہری جال بننے کی ضرورت ہی نہیں۔ زندگی بھر وہ گنہگار اور خطاکار انسانوں کو راہ راست پر لانے کی خاطر دکھ اٹھاتا اور مصیبتیں جھیلتا رہا حتیٰ کہ اس کا دکھ اٹھانا صلیب پر لٹکائے جانے کی صورت میں اپنے عروج کو جا پہنچا۔ جیسا کہ خدائے قادر و کریم نے وعدہ کیا تھا اسے صلیب کی مصیبت سے نجات ملی یعنی وہ صلیب سے اس حال میں اتارا گیا کہ ہنوز زندہ تھا۔ بعد ازاں وہ اسرائیل کے دس گمشدہ قبائل کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا اور وہاں سے ہجرت کر گیا۔ اس طرح اس نے خدا کا پیغام نہ صرف ان قبائل تک پہنچایا جن سے وہ واقعۂ صلیب سے قبل ہم کلام ہوا بلکہ وہ اسرائیل کے تمام دوسرے قبائل تک بھی پہنچا اور اس طرح خدا کی طرف سے جو ذمہ داری سونپی گئی تھی اسے کماحقہ ادا کر دکھایا۔ جب یہ ذمہ داری پورے طور پر ادا ہو گئی تب کہیں جا کر اس کی بعثت کی غرض بہ تمام و کمال پوری ہوئی۔ یہ ہیں مستحسن اور رفیع الشان حقیقتیں مسیح کی زندگی کی جو خدا کے ایک سچے رسول کی حیثیت سے اس کی عظمت و صداقت کی آئینہ دار ہیں۔

بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ حضرت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ السلام نے آج سے قریباً ایک سو سال قبل اس امر کا اعلان فرمایا کہ مسیح خدا کا ایک سچا رسول تھا۔ جیسا کہ اس نے اپنے ابتدائی مواعظ میں اشارہ کیا تھا وہ صلیبی موت سے بچایا گیا۔ حضرت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ السلام نے جنہیں خدائی رہنمائی کا شرف حاصل تھا اسلام کی تاریخ میں پہلی بار مسیح کی زندگی کے روشن حقائق پر پڑے ہوئے پر اسرار پردوں کو اٹھایا۔ یہ آپ ہی تھے جنہوں نے فرسودہ اور دور از کار خیالات و نظریات رکھنے والے مسلمانوں کی طرف سے اظہار ناپسندیدگی و ناراضگی کے علی الرغم برملا یہ اعلان کیا کہ مسیح نہ تو صلیب پر فوت ہوا تھا اور نہ ہی جسد عنصری کے ساتھ آسمان پر اٹھایا گیا تھا بلکہ خدائی وعدہ کے عین مطابق اسے معجزانہ طور پر صلیب پر سے زندہ بچا لیا گیا تھا۔ اس کے بعد جیسا کہ اس نے خود وعدہ کیا تھا وہ اسرائیل کے گھرانے کی گمشدہ بھیڑوں کی تلاش میں وہاں سے ہجرت کر گیا۔ اسرائیلی قبائل کی ہجرت کے ممکنہ راستہ ذہن میں رکھتے اور اس کا تعاقب

کرتے ہوئے بڑی صحت کے ساتھ یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ کشمیر اور ہندوستان کے بعض دوسرے علاقوں کی طرف جاتے ہوئے وہ افغانستان میں سے بھی گزرا ہوگا کیونکہ ان سب علاقوں میں ان قبائل کی موجودگی کی اطلاعات پہلے سے موجود تھیں۔ اس امر کی بڑی پختہ تاریخی شہادت موجود ہے کہ افغانستان اور کشمیر دونوں میں آباد قومیں یہودیوں کے ہجرت کر جانے والے قبائل کی نسل سے ہیں۔ حضرت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ السلام نے اس امر کا انکشاف فرمایا کہ بالآخر مسیح نے کشمیر میں وفات پائی اس کے شہر سری نگر میں مدفون ہوا۔

جب احمدی حضرات اس علاقہ سے جہاں مسیح پیدا ہوا تھا جس مسیح کے غائب ہو جانے کا حقائق پر مبنی معقول اور اثر آفریں حل پیش کرتے ہیں تو اکثر ان کی بات کو یہ کہہ کر رد کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ مان بھی لیا جائے کہ مسیح صلیب پر سے زندہ اتر آیا تھا پھر بھی یہ انتہائی بعید از قیاس ہے کہ اس نے یہودیہ سے کشمیر تک کا جان جوکھوں میں ڈالنے والا پر خطر سفر اختیار کیا ہو۔ تردیدی رنگ میں دیئے جانے والے اس عجیب جواب پر احمدی حیران رہ جاتے ہیں کہ فلسطین سے کشمیر تک کا فاصلہ اور زمین سے لے کر آسمان کی انتہائی دور دراز کی پہنائیوں تک کا فاصلہ۔ ان دونوں میں سے کون سا فاصلہ زیادہ لمبا ہے۔ پھر احمدی اس بات پر بھی حیران ہوئے بغیر نہیں رہتے کہ مسیح کے اس وعدہ کا کیا بنا کہ وہ اسرائیل کے گھرانے کی گمشدہ بھیڑوں کی تلاش میں ضرور جائے گا۔ اگر وہ فلسطین سے سیدھا روانہ ہو کر اپنے ''باپ خدا'' کے دائیں ہاتھ جا بیٹھا تو کیا وہ اپنے اس عہد و پیمان کو بھول گیا تھا یا کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اپنے اس وعدہ کو نبھانا اور پورا کرنا اس کے لئے ناممکنات میں سے تھا؟ ماننا پڑے گا کہ یا تو یہ بات تھی یا پھر (جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں) توقع کے رنگ میں یہ سمجھ لیا جائے کہ اسرائیل کے گھرانے کی گمشدہ بھیڑیں پہلے ہی آسمان پر جا چڑھی تھیں اور ان کی تلاش میں پیچھے پیچھے مسیح بھی وہاں جا پہنچا؟

قریب المرگ لوگوں میں زندگی بحال ہونے کے بعض واقعات

جو لوگ اس منظر نامہ کو کہ مسیح صلیب پر سے زندہ اتر آیا دور از قیاس قرار دے کر اسے ناقابل قبول سمجھتے ہیں ہم ان کی توجہ اس حقیقت کی طرف دلاتے ہیں کہ تاریخ میں بہت سے ایسے لوگوں کا ذکر آتا ہے جو انتہائی خطرناک صورت حال پیدا ہو جانے کے باوجود خلاف توقع موت کے منہ سے بچ نکلے اور زندہ سلامت رہے۔ مسیح کو پیش آمدہ جو صورت حال ہم نے بیان کی ہے وہ نہ تو انوکھی اور نرالی ہے اور نہ ایسی کہ اسے قبول کرنا ناممکنات میں سے ہو۔ طبّی نقطۂ نگاہ سے ریکارڈ شدہ ایسے بہت سے مصدقہ واقعات موجود ہیں

جن میں لوگ قریباً ناممکن صورت حال کے باوجود موت کے منہ میں سے بچ نکلے اور پھر عرصہ تک زندہ سلامت موجود رہے۔ ایسے واقعات کی بے شمار شہادتیں عام ملتی ہیں۔

تقسیم برصغیر سے پہلے کے زمانہ میں ایک چھوٹی سی ریاست کے مہاراجہ کا بعینہٖ اسی طرح کا ایک مصدقہ اور ریکارڈ شدہ واقعہ اس قابل ہے کہ اسے یہاں بیان کیا جائے۔ اس مہاراجہ کو قریباً ایسی ہی ناممکن صورت حال سے دوچار کر دیا گیا تھا اور بظاہر حالات اس سے بچ نکلنے کا بہت ہی کم امکان ہو سکتا تھا۔ اس مہاراجہ کی بیوی نے اسے زہر دے دیا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ گویا وہ مر گیا ہے لیکن کالمیّت ہونے کے باوجود فی الاصل اس میں جان موجود تھی۔ اس کے بیٹے نے اس کی میت چتا پر رکھ کر آگ لگائی اور جب وہ بھڑکنے لگی تو اچانک زبردست طوفان بادوباراں نمودار ہوا۔ نتیجۃً نہ صرف یہ کہ آخرکار وہ موت کے منہ سے بچ نکلا بلکہ قانونی چارہ جوئی کی شکل میں ایک طویل جدوجہد کے بعد اپنے تخت پر وہ دوبارہ متمکن ہوا۔ اس کے بچ رہنے کی روداد اس طرح بیان کی گئی ہے۔

بھوال اسٹیٹ کا کمار رامیندرا نرائن راؤ ریاست جودھ پور کی زیر ولایت تھا۔ اس کے بارہ میں اس الزام کا چرچا عام سننے میں آیا تھا کہ اسے زہر دے دیا گیا تھا۔ اس کی حالت غیر ہوتی چلی گئی اور بالآخر اسے مردہ قرار دے دیا گیا اور مئی 1909ء میں اس کے بظاہر مردہ جسم کو کریا کرم کے لئے مردہ جلائے جانے والے گھاٹ کے احاطہ میں چتا پر رکھ دیا گیا۔ حالات سے اس امر کی نشان دہی ہوتی تھی کہ اس قتلِ عمد میں اصل کردار اس کی بیوی نے ادا کیا تھا۔ جلتی چتا پر کریا کرم مکمل ہونے سے پہلے پہلے یکدم زبردست طوفان بادوباراں نمودار ہوا۔ جو لوگ اس کے جسم کو جلا کر راکھ کر دینے پر مقرر تھے اس زبردست طوفان کی زد میں آنے سے بچنے کے لئے اس بظاہر مردہ جسم کو چھوڑ کر وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ بارش نے چتا کی آگ کو بجھا دیا۔ سادھوؤں کا ایک گروہ وہاں سے گزر رہا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ چتا پر پڑے ہوئے آدمی میں زندگی کے آثار موجود ہیں۔ اس طرح اسے بچا لیا گیا۔ اگلے روز جب سازشیوں کو پتہ چلا کہ کمار کا جسم تو غائب ہو چکا ہے تو انہوں نے کسی اور مرے ہوئے آدمی کے جسم کو جلا کر اور اس کا کریا کرم کر کے ظاہر یہ کیا کہ کمار واقعی مر چکا ہے۔

سادھو اس کمار کو اپنے ساتھ جگہ جگہ لئے پھرے۔ قریب المرگ ہو جانے کے تجربہ میں گزرنے کے باعث کمار اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ طاقت بحال ہونے کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ اس کی یادداشت لوٹنے

لگی۔ وہ بارہ سال کے بعد جودھ پور واپس پہنچا۔ اپنے ہی شہر کے مانوس ماحول اور قرب وجوار میں پہنچ کر بھولی بسری باتیں یاد آتی چلی گئیں اور اس طرح اس کی یادداشت پورے طور پر بحال ہو گئی۔ جب کمار نے اپنی اسٹیٹ دوبارہ حاصل کرنے کے لئے سرکار بالا میں جس کی ولایت اس کی اسٹیٹ تھی سول مقدمہ دائر کیا تو اس کی بیوی اور بعض دوسرے لوگوں نے اس کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے جوابی کارروائی کی۔ طرفین کی طرف سے بڑی زبردست مقدمہ بازی ہوئی۔ ایک ہزار سے زائد لوگوں نے کمار کے کے حق میں اور چار سو لوگوں نے اس کی بیوی کے حق میں گواہیاں دیں۔ اصل مابہ النزاع معاملہ کمار کی شناخت کا تھا کیونکہ عام طور پر لوگوں کے علم میں یہ بات تھی کہ وہ بارہ سال قبل مر گیا تھا۔

کمار نے جب اپنی بیوی کے جسم پر ایسی علامتوں کی نشاندہی کی جن کا علم صرف خاوند کو ہی ہو سکتا تھا تو مقدمہ کا فیصلہ اس کے حق میں کر دیا گیا اور اس کی اسٹیٹ اس کے حق میں بحال کر دی گئی۔[9]

اسی نوعیت کے اور اس سے ملتے جلتے سینکڑوں چھوڑ ہزاروں واقعات ایسے ہوئے ہوں گے جن کی رپورٹ درج نہیں ہوئی اور وہ ضبط تحریر میں نہیں آئے۔ جدید طبّی سہولتوں، اخبارات ورسائل اور ابلاغ عامہ کے دیگر وسائل کے طفیل اب تو ایسے بہت سے واقعات علم میں اور ضبط تحریر میں آکر محفوظ ہوتے رہتے ہیں۔ اگر معاشرہ کے تمام طبقوں اور مختلف مذاہب اور اخلاقی پس منظر رکھنے والے عام لوگوں کے معاملہ میں یہ بات عقل کے مطابق اور عین قرین قیاس قرار پاسکتی ہے تو ایسا مسیح کے ساتھ ہونا کیوں ممکن نہیں ہو سکتا۔ اگر محال کا درجہ رکھنے والی قریباً ناممکن صورت احوال میں کسی دوسرے کے زندہ بچ نکلنے کا امکان ہو سکتا ہے تو مسیح کے اردگرد جو مخصوص حالات موجود تھے اور جن میں سے وہ گزر رہا تھا ان کے پیش نظر مسیح کے زندہ بچ نکلنے کا امکان نسبتاً زیادہ تھا۔ بہت تعجب انگیز ہے یہ امر کہ متشکک مزاج لوگ اس بات کو تو فوراً رد کر دیتے ہیں کہ مسیح صلیب پر عمداً قتل کیے جانے کی کوشش سے زندہ بچ نکلا تھا لیکن اس کے بالمقابل وہ حتمی اور قطعی موت واقع ہونے کے بعد اس کے دوبارہ جی اٹھنے کی انوکھی و نرالی اور سراسر غیر حقیقی اور غیر قدرتی کہانی پر جھٹ ایمان لے آتے ہیں اور پھر وہ حقیقی موت بھی ان کے اپنے اعتقاد کے مطابق ایسی تھی جو پورے تین دن رات طاری رہی۔

میڈیکل ریسرچ کے شعبہ نے بھی قریب المرگ حالات کو پہنچنے کے واقعات میں دلچسپی لی ہے۔ ایک

[9] ("مقدمہ بھوال" مرتّبہ جے۔ ایم۔ مترا اور آر۔ سی۔ چکراورتی۔ شائع کردہ پیر اینڈ سنز کلکتہ)

تحقیق کے دوران موت کے قریب پہنچنے کے تجربات پر مشتمل 78 قریب المرگ مریضوں کے متعلق رپورٹوں کا گہری نظر سے جائزہ لیا گیا۔ ان میں 80 فیصد مریض ایسے تھے جن کا قریب المرگ حالت کے تجربات کے دوران ڈاکٹری عملہ خود موجود تھا یا ان کے تجربات کے اختتام پر فوراً ہی وہاں پہنچ گیا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ 41 فیصد لوگوں نے یہ رپورٹ دی کہ قریب المرگ حالت کے تجربہ کے دوران انہیں مردہ قرار دے دیا گیا تھا۔[10]

تمام تر طبّی آلات اور مشینوں کی موجودگی اور ان سے کام لینے کے باوجود اگر طبّی ماہرین غلطی سے ایک زندہ آدمی کو مردہ سمجھ کر اس کی موت واقع ہونے کا اعلان کرسکتے ہیں تو کتنی قابل اعتماد ہوسکتی ہے ایک فکرمند اور پریشان حال مبصر کی گواہی جس نے مسیح کو اس کے ہوش گم ہو جانے کی حالت میں دیکھا اور نتیجہ اس سے یہ نکال لیا کہ وہ مر گیا ہے؟ اس پر مستزاد یہ کہ اس کو دوبارہ دیکھنے کے بعد یہ نتیجہ نکالنا کہ مرنے کے بعد وہ پھر زندہ ہو گیا قطعی بلاجواز ہے۔

[10] (The Phenomenology of Near-Death Experiences by Bruce Greyson M.D. & Ian Stevenson M.D., The American Journal of Psychiatry 137: 10 October 1980)

باب ششم

تثلیث

اب تک ہم نے درپردہ اثر انداز ہونے والی ان مجبوریوں کا جائزہ لیا جو قصوں، کہانیوں اور اساطیر کے رنگ میں مسیح کو خدا کا درجہ دینے پر منتج ہوئیں۔ اور یہی مجبوریاں موجب بنیں خدا کے بیٹے کی حیثیت سے تثلیث میں مسیح کے نام نہاد کردار اور عمل دخل کو متعین کرنے کا۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو مسیحیت کے عقیدہ تثلیث کا ایک پہلو اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب اور انوکھا و نرالا ہے۔ وہ پہلو یہ ہے کہ مسیح کو تو خدا کے بیٹے کی حیثیت دے کر خدا کی الوہیت میں شامل کیا گیا لیکن روح القدس کو کس مجبوری یا مصلحت کے تحت یہ درجہ دیا گیا۔ آخر کس بنا پر اسے تیسرے اقنوم کی حیثیت دے کر تثلیث میں شرکت کا حق دار ٹھہرایا گیا۔ اس کی یہ حیثیت اور ہستی بھی اپنی جگہ ایک معمہ یا چیستاں سے کم نہیں ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "باپ، بیٹے" کی حیثیت سے "ایک میں دو" کا نظریہ کیوں ناکافی تھا؟ اُلوہیت کے بارہ میں مسیحیت کے بنیادی عقیدہ میں ایک تیسری ہستی کو بھی متعارف کرانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ دوسری کی طرح اس عقیدہ میں ایک تیسری ہستی کے آ داخل ہونے اور اس میں اپنا مقام بنانے کا بھی کوئی منطقی جواز نہیں بنتا۔ اس نظریہ یا عقیدہ کے ایک تبصرہ نگار ہارنیک (Harnack) کے نزدیک تو شروع شروع میں جب عقائد میں جدّت کے عمل دخل کا آغاز ہوا تو مسیحیت خدا اور مسیح کے باہمی اشتراک یا ان کی دو عملی سے ہی عبارت تھی۔ اس چکر یا گرداب میں کلیسیا بعد میں پڑا کہ روح القدس کو بھی الٰہی صفات کا حامل قرار دے کر اُلوہیت کو تثلیث کی شکل دی جائے۔ خطرہ یہ تھا کہ ایسا نہ کیا گیا تو بہت سے معتقدوں کے نزدیک وہ بھی اپنی جگہ ایک لایعنی اور مجہول قسم کی اُلوہیت کا حامل بنے بغیر نہ رہے گا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہودیوں سے اپنے آپ کو الگ اور ممتاز کرنے کے لئے تثلیث کو ایک امتیازی عقیدہ کے طور پر اختیار کیا گیا اور ان کے مقابلہ کے لئے اسے ایک ہتھیار سمجھ لیا گیا۔[11]

جہاں تک تثلیث کے عقیدہ کی بنیاد کا تعلق ہے اس کے بارہ میں ایک مسیحی مقالہ نگار ریورنڈ

[11] (The Constitution and Law of the Church in the First Two Centuries by Adolf Harnack. p. 264)

کے۔ای۔کرک(Rev. K. E. Kirk)"عقیدۂ تثلیث" کے زیر عنوان اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"قدرتی طور پر ہم اس زمانہ (یعنی جس زمانہ میں عقیدہ تثلیث نے معین شکل اختیار کی) کے لکھنے والوں اور ان کی تحریرات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تا کہ معلوم کر سکیں کہ وہ اپنے عقیدہ کی بنیاد اور وجوہات کیا بیان کرتے ہیں۔ ہم حیران ہوئے بغیر نہیں رہتے اور ہمارے لئے یہ تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ ان کے ہاں نہ اس عقیدہ کی بنیاد کا کوئی پتہ ملتا ہے اور نہ استدلال کے رنگ میں اس کی وجوہات کا بیان کہیں نظر آتا ہے۔ وہ جس سوال سے دوچار ہوئے وہ یہ نہیں تھا کہ تین اقنوم کیوں ہوں؟ بلکہ سوال درپیش صرف یہ تھا کہ تین اقنوم کیوں نہ ہوں؟"

ریورنڈ کرک نے اپنے اس مضمون میں اس امر کی بطور خاص نشان دہی کی ہے کہ مسیحی دینیات اپنے عقیدۂ تثلیث کا منطقی جواز پیش کرنے میں قطعی ناکام نظر آتی ہے۔ مسیحیت کی سہ رکنی الوہیت کے بارہ میں کہا جاسکتا ہے کہ اصل میں تو یہ دو رکنی الوہیت ہی کی تھی۔ اس میں بعد ازاں ایک اور ہی نوعیت کی ہستی کو بھی تزئین یا آرائش کے طور پر ٹانک دیا گیا تا کہ تصویر یا یوں کہہ لیں کہ تصور کے مکمل ہونے کا احساس ابھر سکے۔[12]

ہمیں یقین ہے کہ تیسرے اقنوم کے تصور نے نشوونما ان ملحدانہ فلسفوں اور قصوں کہانیوں سے پائی جو سلطنت روما میں عام پھیلے ہوئے تھے۔ ان ملحدانہ فلسفوں کے زیر اثر رفتہ رفتہ اس تیسرے اقنوم نے عقیدۂ تثلیث میں جگہ پائی۔ اس زمانہ میں دوسروں کے ساتھ تبادلہ خیالات نے مسیحی ماہرین دینیات کو اس طرف مائل کیا ہو گا کہ وہ بھی تیسرے اقنوم کی حیثیت سے تثلیث میں روح القدس کا مقام متعین کریں۔ چونکہ اس زمانہ میں ایسے عقیدوں اور مسلکوں کی موجودگی کے کافی ثبوت ملتے ہیں جن کی رو سے خدا کو تین علیحدہ علیحدہ ہستیوں پر مشتمل ایک ہستی تصور کیا جاتا تھا اس لئے کسی قدر کھوج لگا کر مسیحی عقیدۂ تثلیث کے اصل منبع وماخذ تک پہنچنا چنداں مشکل نہیں ہے۔ بہر حال جب ازروئے عقیدہ دووجود باہم مل کر ایک ہو سکتے تھے اور ایک وجود کو فی ذاتہٖ دو متصور کیا جاسکتا تھا تو دوسروں کے زیر اثر "تین" کو بھی "ایک" تصور کرنے میں کیا قباحت ہو سکتی تھی۔ یہ تو خیر محققین کا کام ہے کہ وہ تحقیق کرکے حتمی طور پر پتہ لگائیں کہ مسیحی دیومالائی عقیدہ کے طور اُلوہیت کے تصور میں تیسرے اقنوم نے کب اور کس طرح جڑ پکڑی اور پھر یہ جڑ کیسے

[12] (Essays on the Trinity and the Incarnation by A.E.J. Rawlinson, Longmans, London, 1923)

مضبوطی اختیار کرتی چلی گئی۔ اس سارے معاملہ کا پتہ لگانا ہماری موجودہ بحث کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ ہم فی الوقت صرف ایسے دعاوی اور عقائد کی نامعقولیت کا جائزہ لینا چاہتے ہیں جو انسانی فہم و فراست اور ادراک سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے کیونکہ انسانی فطرت ایسے خیالات و نظریات کو جو خود اپنی ذات میں باہم متناقض و متباین ہوں یکسر مسترد کر دیتی ہے۔

تثلیث کے عناصر ترکیبی کے باہمی رشتہ کی نوعیت

جب ہم مسیحی خدا اور اس کی الوہیت کے تین عناصر ترکیبی یا اقانیم (باپ، بیٹا اور روح القدس) کے باہمی تعلق کو تصور میں لانے کی کوشش کرتے ہیں تو احوال کی جو ممکنہ صورتیں یا منظر نامے ابھر کر سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں:

ا۔ وہ تینوں عناصر ایک ہی ہستی کی مرحلہ وار رونما ہونے والی حالتوں اور حیثیتوں یا اس کے مختلف پہلوؤں کے آئینہ دار تھے۔

ب۔ وہ تین مختلف ہستیاں تھیں جو باہمی طور پر ابدیت میں دائمی طور پر شریک تھیں۔

ج۔ وہ تین ہستیاں تھیں اور انفرادی حیثیت میں اپنی بعض امتیازی صفات یا خصوصیات رکھتی تھیں اور شریک نہیں تھیں۔

د۔ وہ تھیں تو تین ہی ہستیاں لیکن وہ تینوں ایک ہی ہستی میں سمائی ہوئی تھیں۔ وہ مکمل طور پر ایک ہی نوعیت کی صفات و خصوصیات اور ایک ہی نوعیت کی یکساں طاقتوں اور قدرتوں اور اختیارات کی مالک تھیں۔ اور وہ ایک دوسرے میں اس طرح پیوست و مدغم تھیں کہ ان کے علیحدہ علیحدہ کاموں کی تخصیص ممکن نہ تھی۔

اب ہم مندرجہ بالا چاروں امکانی صورتوں یا منظر ناموں کو سلسلہ وار باری باری اسی ترتیب سے زیرِ غور لاتے ہیں۔

ایک ہی یعنی اکیلی ہستی کی مختلف حیثیتیں یا مختلف پہلو

جہاں تک امکان مندرجہ عنوان بالا کا تعلق ہے اس پر لمبی چوڑی بحث کی ضرورت نہیں کیونکہ آج کے زمانہ میں شاید ہی کوئی عیسائی ایسا ہو جو مسیح کو ایک علیحدہ شخصیت کا مالک سمجھنے کی بجائے اس کی ہستی کو خدا کے کسی ایک پہلو یا کسی ایک حالت و حیثیت کا آئینہ دار یقین کرتا ہو۔ تثلیث پر ایمان رکھنے والے تین مختلف شخصیتوں کے علیحدہ علیحدہ وجود پر اصرار کرتے ہیں جو باہم مدغم ہو کر ایک ہستی میں بھی ڈھلی ہوئی تھیں۔

جس لمحہ بھی ایک انسان اس صورت احوال یا منظر نامہ کو تسلیم کرتا ہے کہ ہستی تو ایک ہی تھی پر اس کے مختلف پہلو بیک وقت ظاہر ہو کر اپنا جلوہ دکھارہے تھے اسی لمحہ تثلیث یعنی "ایک میں تین" علیحدہ علیحدہ خداؤں کے موجود ہونے کا تصور دھؤاں بن کر ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے اور تثلیث سرے سے باقی ہی نہیں رہتی۔ ایک ہی ہستی کے مختلف پہلوؤں کی ایک ساتھ جلوہ گری کی ممکنہ صورت میں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک یا اکیلا ہی "باپ خدا" تھا جس کا جذبہ رحم جوش میں آیا اور خدا ہوتے ہوئے اس نے انسانی گناہوں کی پاداش میں خود ہی موت کو گلے لگا لیا اور مر کر خس کم جہاں پاک ہوا۔ اس صورت میں اس اکیلی ہستی کا یہ فعل ایک عارضی مرحلہ یا دور کے مترادف ہو گا جو آیا اور گزر گیا۔ کسی ایک وجود کے مختلف پہلو خود اپنی ذات میں علیحدہ وجودوں کی حیثیت نہیں رکھتے۔ مختلف پہلو تو ادلتے بدلتے اور آتے جاتے رہتے ہیں۔ اسی طرح مختلف حیثیتیں یا مرحلہ وار ظاہر ہونے والے ادوار اپنی اپنی جگہ علیحدہ علیحدہ وجودوں کی حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ ظاہر ہوتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ کوئی بھی انسان دو یا تین علیحدہ علیحدہ شخصیتوں میں تقسیم ہوئے بغیر لاتعداد مزاجی کیفیتوں اور ان گنت پہلو وار حالتوں میں سے گزر سکتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر خدا نے گناہوں میں ملوث انسانیت کی نجات کی خاطر مرنے کا فیصلہ کیا تو اس کا بجز اس کے اور کوئی مطلب نہیں ہو سکتا کہ خود خدا نے موت کو قبول کیا نہ کہ اس کے کسی ایک پہلو یا حیثیت نے ایسا کیا۔

سو جہاں تک زیرِ نظر معاملہ کا تعلق ہے اس کی رو سے اگر خدا کے ایک پہلو نے گناہگار انسانیت کو گناہ کی آلودگی سے نجات دلانے کے لیے اہم کردار ادا کیا تو اس کا ایک ہی مطلب لیا جاسکتا ہے کہ خدا کی صفات میں سے ایک صفت یعنی صفت رحم کا ظہور عمل میں آیا اور اس کا ظہور انسانیت کی نجات پر منتج ہوا لیکن اگر خدا کے ایک پہلو یا اس کی ایک صفت یعنی صفت رحم کو ایک مجسم شخصیت قرار دے کر اس کا نام یسوع مسیح رکھ دیا جائے اور کہا یہ جائے کہ اس نے جان کی قربانی دے کر گناہ گار انسانیت کو نجات دلائی تو جان دینے کے نتیجہ میں موت وارد ہو گی خود خدا کی صفت رحم پر۔ کیسا عجیب تضاد ہے یہ کہ خدا کے رحم نے گناہ گار انسانیت پر اچھا ترس کھایا کہ اس ترس کھانے کے نتیجہ میں خود کشی کا ارتکاب کر ڈالا۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ تین رات تک (یعنی جب تک مسیح مرا رہا) خدا میں کوئی رحم باقی نہ رہا تھا۔

یہ امر یاد رہے کہ اس منظر نامہ میں یسوع کو ایک جداگانہ آزاد شخصیت کے طور پر پیش نہیں کیا جارہا بلکہ اسے پیش کیا جارہا ہے خدا کے ایک پہلو یا اس کی ایک صفت کے طور پر۔ اس لحاظ سے اس منظر نامہ میں

وہ ایک مجسم رحم کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے یعنی یہ کہ خدا کی صفت رحم نے یسوع کی شکل میں تجسم اختیار کرلیا۔ خدا کی صفت رحم کے تجسم اختیار کرنے کی وجہ سے وہ شخص بنارہا خدا کی ایک اور اکیلی غیر منقسم ہستی۔ سو اس ترس کھانے اور قربانی دینے کے نتیجہ میں اگر کسی کی جان گئی تو خود خدا کی اپنی ہستی کی گئی یا کم از کم اس کی صفت رحم کی گئی جس نے کہ اس سارے معاملہ میں بنیادی اہمیت کا کردار ادا کیا۔ پس ان دو باتوں میں سے ایک بات پر ایمان لائے بغیر چارہ نہیں رہتا کہ یا تو خدا کی صفت رحم پر موت وارد ہوئی یا خود خدائے رحیم و کریم کی اپنی ذات پر۔

اس دعویٰ کو درست تسلیم کرنے سے کہ ایک اکیلی شخصیت کے مختلف پہلو عارضی طور پر یا مستقل طور پر مٹ کر محو ہوسکتے ہیں بہت سی پیچیدگیوں کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس منظر نامہ کو انسانی تجربہ پر منطبق کرکے ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ ایک آدمی اپنی بینائی یا سماعت سے عارضی یا مستقل طور پر محروم ہوسکتا ہے۔ اس محرومی یا نقص کے باوجود وہ رہے گا پہلے ہی کی طرح ایک زندہ اور جان دار انسان۔ سو گویا ایک صلاحیت یا استعداد کی موت اس انسان کی جزوی موت ہوتی ہے۔ آخری تجزیہ کی رو سے کسی ایک صلاحیت سے محروم ہوجانے ولا شخص اپنی اسی واحد ہستی کا مالک رہتا۔

ابدیت میں شریک مختلف ہستیاں

دوسرا منظر نامہ یہ ہے کہ تثلیث کے اقانیم تین مختلف وجود تھے جو بیک وقت ابدیت میں یکساں طور پر شریک تھے۔ تو پھر سوال پیدا ہوگا کہ ان کا آپس میں تعلق یا رشتہ کیا ہے۔ اگر وہ دوامی حیثیت رکھنے والے تین وجود تھے اور انہوں نے مل کر ایک خدا کی حیثیت اختیار کررکھی تھی تو پھر ماننا پڑے گا کہ وہ اپنی اپنی جگہ ذاتی انا اور خودی کے بھی مالک تھے۔ اس لحاظ سے ایک کا دکھ اٹھانا (اگر دکھ اٹھانا ان کے لئے ممکن مانا جائے) اس کا اپنا ذاتی تجربہ ہوگا۔ باقی دو شخصیتیں اس کے ساتھ ہمدردی تو کرسکتی ہیں لیکن دکھ اٹھانے میں فی الحقیقت اس کے ساتھ شریک نہیں ہوسکتیں۔ یقیناً خدا کے خیالات اور ان کے بروئے کار آنے کے طریق کار نیز خدا کے فیصلہ کرنے کے انداز کو سمجھنا قریباً ناممکن ہے۔ لیکن یہ دعوٰی کہ تین ہستیاں ایک ہستی کے طور پر ڈھلی ہوئی ہیں اس امر کا جواز پیدا کردیتا ہے کہ تینوں کے ایک دوسرے سے آزاد طریقہ ہائے خیالات میں باہمی ربط جاننے کی کوشش کی جائے۔

اس نظریہ سے کہ تینوں آزاد طریقہ ہائے خیالات کی تین ہستیاں ایک ہستی میں ڈھلی ہوئی ہیں جو

منظر نامہ اُبھر تا ہے وہ ایک ایسے بچہ کی پیدائش کے منظر نامہ سے ملتا جلتا ہے جس کے تین سر ہوں۔ ایک سر، دو ہاتھ اور دو ٹانگیں وغیرہ، ایک دھڑ کی طرف منسوب ہوسکتے ہیں لیکن ایک دھڑ پر تین سروں کا موجود ہونا مسئلہ پیدا کر دیتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ان تین سروں کی اُفتادِ طبع اور فطرت طبیعی کا پتہ لگایا جائے۔ اگر قدرت کے یہ عجوبے اتنا لمبا عرصہ زندہ رہتے ہیں کہ خود بول سکیں اور جو ان پر بیت رہی ہے اس کا اظہار کر سکیں تب ہی ہم ان سے دریافت کر سکتے ہیں کہ ان کے سروں کے اندر فکری لحاظ سے کیا کچھ ہورہا ہے اور ہر سر میں الگ الگ کیا کیا افکار و خیالات جنم لے کر اپنے ایک ہی یا اکیلے جسم پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ یہ جانے اور معلوم کیے بغیر یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ وہ تینوں مل کر ایک ہی شخص ہیں اور یہ کہ وہ ایک شخص تین دماغوں میں شریک ہے۔ اسی طرح یہ کہنا بھی ممکن نہیں ہے کہ تین شخص ایک ہی جسم میں شریک ہیں۔

یہ بہت عجیب بات ہے کہ مسیحی اعتقاد کے اس اہم پہلو (تثلیث اور اس کے اقانیم کے باہمی ربط و ضبط) کی صحائف میں کوئی وضاحت موجود نہیں ہے۔ جہاں تک مسیح اور روح القدس کے ذکر یا حوالہ کا تعلق ہے ان کو ہر جگہ دو ایسی مختلف شخصیتوں کے طور پر پیش کیا گیا ہے جن کا نہ خیالات کا طریق ایک تھا اور نہ ہی ان کے جذبات و احساسات بالکل یکساں نوعیت کے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو روح القدس کو مسیح سے علیحدہ وجود کے طور پر تصور میں لانا ممکن ہی نہ ہوتا۔ خاص طور پر اس عرصہ میں تو جبکہ مسیح انسانی جسم میں محدود و مقید تھا ان کے علیحدہ وجودوں کو تصور میں لانا بدرجہ اولیٰ ناممکن ہوتا۔ مسیح کے ایک انسان کے طور پر تجسم اختیار کرنے کے دوران تثلیث کے دوسرے عناصر ترکیبی کے ساتھ رابطہ سے متعلق جن سوالات کا یقینی طور پر پیدا ہونا لازمی ہے وہ یہ ہیں:

1۔ کیا بقیہ دو عناصر ترکیبی یعنی "باپ خدا" اور روح القدس کسی لحاظ سے یسوع مسیح کے جسم اور جسم سے متعلق تجربات میں باہم مل کر اکٹھے شریک تھے؟

2۔ کیا اس انسانی جسم میں مسیح اکیلا ہی سمایا ہوا تھا اور جسم سے تعلق رکھنے والے تجربات میں اس نے تثلیث کے بقیہ دو عناصر ترکیبی کو شریک نہ کیا تھا؟

اول الذکر سوال کے شاخسانوں پر ہم پہلے ہی روشنی ڈال چکے ہیں۔ البتہ مؤخر الذّکر سوال کے سلسلہ میں ایک مزید پیچیدگی پیدا ہوتی ہے اور اس نئی پیچیدگی کا تعلق ہے اس امر سے کہ اس دوران تثلیث کے باقی دو اجزائے ترکیبی سے مسیح کے رشتہ کی نوعیت کیا تھی اور ان کے درمیان کوئی رابطہ تھا یا نہیں۔ کیا اس عرصہ کے دوران مسیح نے از خود بالکل ایک علیحدہ شخصیت اختیار کر لی تھی یا وہ اس دوران بھی دوسرے

اجزائے ترکیبی کا جزو لاینفک بنا رہا اور محض ایک اضافی مصروفیت کے رنگ میں وہ اپنے طور پر انسانی جسم میں بھی سمایا رہا۔ یہاں ایک اور سوال کا جواب حاصل کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے:

3۔ کیا انسانی جسم میں اس کی پوری کی پوری مقدس خدائی ہستی سمائی ہوئی تھی یا اس خدائی ہستی کا جس میں (باپ خدا) اور روح القدس بھی برابر کے شریک تھے صرف ایک حصہ (انسانی جسم میں سمانے کے لئے) اسی طرح آگے کو جھک گیا تھا جس طرح پانی میں پائے جانے والی امیبا (Amoeba) نامی زندہ کیڑے کی ایک انگلی اس کے باقی وجود سے باہر نکلی ہوئی ہوتی ہے؟

منظر نامہ کے طور پر ابھرنے والی اس صورت حال میں ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس دور میں مسیح اپنے دو شریک ساتھیوں ("باپ خدا" اور روح القدس دونوں) سے بھی عظیم تر تھا کیونکہ وہ "اپنے باپ" اور روح القدس کے ساتھ ایک ہی خدائی شخصیت میں شریک بھی تھا اور ایمیبا کیڑے کی باہر نکلی ہوئی انگلی کی طرح اپنی ایک علیحدہ ہستی بھی رکھتا تھا جس میں "باپ" اور روح القدس شریک نہ تھے۔ اس صورت حال اور اس کی مختلف کیفیات کو سمجھانے کی خاطر ہم بعض مفروضات کو ذہن میں لا کر اس صورت حال میں پوشیدہ تناقضات اور نامعقولیتوں کو ازراہِ امثال بیان کرتے ہیں۔ قارئین کو ان مثالوں کو زیرِ نظر صورت حال پر لفظاً لفظاً چسپاں کرنے اور اسے صحیح سمجھنے کی غلطی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ مفروضے محض سمجھانے کے لئے بیان کیے جاتے ہیں تاکہ اصل حقائق کو پرکھنے میں مدد مل سکے۔

اصل مسئلہ ہمارے سامنے یہ ہے کہ شخص ایک ہی ہے اور اس سے مختلف قسم کے اعمال و افعال اور احوال و عواقب ظاہر ہو رہے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ آیا ان کے ذریعہ وہ اپنی مختلف صفات کا اظہار کر رہا ہے یا یہ احوال و عواقب اس کے سلسلہ وار مختلف حالتوں اور حیثیتوں میں سے گزرنے پر دال ہیں۔ اس مسئلہ کی روشنی میں ہم نے "تین ہستیوں کے ایک" اور "ایک ہستی کے تین" ہونے کے مسیحی عقیدہ کا جائزہ لینا ہے اور جائزہ بھی لینا ہے اس زاویۂ نگاہ سے کہ "ایک میں تین" اور "تین میں ایک" کی کیفیت اس امر کے مترادف بھی تو ہو سکتی ہے کہ ایک ہی ہستی سے اس کی مختلف حیثیتوں یا مختلف ادوار میں اس کے اپنے مختلف اوصاف اور مزاجوں کا اظہار ہو رہا ہے۔ یعنی ہستی ایک ہی ہے لیکن اس کی صفات، اس کی حیثیتیں، اس کی حالتیں اور اس کے مزاج مختلف ہیں جنہیں نام دے دیا گیا ہے علیحدہ علیحدہ ہستیوں کا۔ اس صورت حال پر ہم ایک گزشتہ باب میں خاصی تفصیل سے غور کر چکے ہیں۔ یہاں ہم صرف اس نکتہ پر زور دینا چاہتے ہیں کہ ایک شخص یا ایک ہستی جب مختلف حیثیتوں کا اظہار کرتی ہے تو وہ اپنے آپ کو مختلف حصوں میں تقسیم کیے

بغیر ان مختلف حیثیتوں کا بیک وقت اظہار نہیں کر سکتی۔ مثال کے طور پر ایک خاص پیمانہ یا مقدار میں پانی ہی کو لے لیں۔ اس پانی کی ہستی کی اکائی یا وحدانیت پر اثر انداز ہوئے بغیر اسے مکمل طور پر بخارات یا برف میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر اسے ان مختلف شکلوں اور حیثیتوں میں بیک وقت دیکھنا مطلوب ہو تو پھر اسے تقسیم کرنا ضروری ہو جائے گا تاکہ اس کا ایک تہائی برف بن سکے۔ ایک تہائی بخارات میں تبدیل ہو سکے اور ایک تہائی اپنی سیال شکل ہی بر قرار رکھے۔ ہر شکل دوسری شکل سے مختلف ہو گی اور کوئی ایک شکل بھی بیک وقت بقیہ دوسری شکلوں یا حیثیتوں میں شریک نہیں ہو سکے گی۔ پانی کی مقدار کو تین حصوں اور ان کی تین حالتوں میں تقسیم کر دیا جائے گا لیکن ہر ایک کا حجم پانی کی مقدار سے کم یا چھوٹا ہو گا۔ کوئی ان کو ”تین میں ایک“ اور ”ایک میں تین“ نہیں کہہ سکتا۔ اسی طرح مسیح کا یسوع کی انسانی شکل میں تجسم اختیار کرنا اور پھر انسان یسوع اور ”باپ خدا“ کے درمیان تعلق میں فرق نہ آنے دینا اور اس بندھن کو پورے طور پر بر قرار رکھنا ایک ایسی بات ہے جسے تصور میں لانا ممکن نہیں ہے۔

تمام بنی نوع انسان ایک ہی قسم کے عناصر سے بنے ہوئے ہیں لیکن بلحاظ عناصر ان کی باہمی یکسانیت اور بلحاظ نوع ان کی یکساں حیثیت انہیں ایک ہی شخص یعنی فرد واحد یا ایک ہی شخصیت میں نہیں ڈھال دیتی۔ باہمی یکسانیت کے باوجود وہ باہم ہوتے ایک دوسرے سے الگ ہی ہیں۔ اگرچہ وہ بنیادی طور پر ایک ہی مادہ کے بنے ہوئے ہوتے ہیں لیکن ان کے کردار، ان کی انفرادیتیں اور ان کی جداگانہ حیثیتیں انہیں لاتعداد شخصیتوں میں بانٹ دیتی ہیں۔ اس کے باوجود کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ ”پانچ ارب میں ایک“ اور ”ایک میں پانچ ارب“ ہیں۔

آیئے اب ہم اسی سوال کا ایک اور زاویۂ نگاہ سے جائزہ لیتے ہیں۔ اگر وقت یا زمانہ کی ایک مقررہ مدت میں یسوع ایک طرف ”باپ خدا“ سے اور دوسری طرف روح القدس سے یکسر مختلف تھا اور ان کے درمیانی امتیاز قطعی واضح تھا تو مسیح کی امتیازی رنگ میں واضح اور قطعی طور پر وہ علیحدہ اور جداگانہ ہستی اور موجودگی کس حساب کتاب میں شمار ہو گی اور کس جداگانہ کھاتہ میں ڈالی جائے گی؟ یاد رہے کہ اس حالت میں مسیح کو ”باپ“ اور روح القدس سے اس قدر کلی طور پر مختلف علیحدہ اور بے تعلق سمجھنا پڑتا ہے کہ کوئی نسبت اور مماثلت ہی باقی نہیں رہتی۔ اور ایسا اس لئے سمجھنا پڑتا ہے تاکہ بنی نوع انسان (یا یوں کہہ لیں کہ اپنے جزوی انسانی بھائیوں) کی خاطر اس کی جانی قربانی کلی طور پر اس کا اپنا ذاتی تجربہ شمار ہو سکے۔ اس کے بغیر یہ نتیجہ نکل ہی نہیں سکتا کہ ہم یہ باور کریں کہ مسیح نے اکیلے ہی اپنے ذہن یا سلسلہ خیالات اور راس کے

طریقۂ کار کو یسوع کے مادی جسم میں منتقل کیا۔ بالفاظ دیگر مسیح تن تنہا اور اکیلا ہی ایک ایسے تجربہ میں سے گزرا جس میں مسیحی تثلیث کے دوسرے دو اجزائے ترکیبی ("باپ خدا" اور روح القدس) سرے سے شامل ہی نہ تھے۔ کیا یہ ایسا گورکھ دھندا نہیں ہے جس سے ذہن ٹھٹک ٹھٹک کر ضغطہ میں پڑے بغیر نہیں رہتا!

مختلف خصائص و کردار رکھنے والی شخصیتیں

اگر وہ (یعنی تثلیث کے تینوں اجزائے ترکیبی) تین علیحدہ علیحدہ ہستیاں تھیں اور اپنے علیحدہ علیحدہ ذاتی خصائص واوصاف کی مالک تھیں اور ایک دوسرے کے خصائص واوصاف اور صفات میں باہم شریک نہ تھیں تو پھر انہیں "ایک میں تین" اور تین میں ایک" قرار نہیں دیا جاسکتا۔ تثلیث کے تینوں اقانیم کے وحدانیت کی آئینہ دار اکیلی ہستی میں ڈھل جانے کو صرف اسی صورت میں متصور کیا جاسکتا ہے کہ جب ان کے خصائص و اوصاف اور تمام صلاحیتیں بھی ایک دوسرے سے بکلی مطابقت اختیار کرلیں اور کوئی ایسے امتیازی پہلو باقی نہ رہیں جو انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کر دکھانے والے ہوں۔

اس سے ایک منظر نامہ ابھرتا ہے جو کسی حد تک مشابہت رکھتا ہے پیدائشی طور پر ایسے تین جڑواں وجودوں سے جن کے ذہن، دل، دیگر اعضا اور جذبات واحساسات اور اسی طرح جن کی حرکات و سکنات اور اعمال وافعال میں ایسی مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے کہ ان میں سے کسی ایک کے تجربہ میں دوسرے دو بھی برابر کے شریک رہتے ہیں۔

اگر ایسا ہی وقوع میں آتا ہے تو "باپ خدا" بیٹے اور روح القدس کی تثلیث ایسی شکل اختیار کرلیتی ہے جسے کسی نہ کسی حد تک قابل فہم قرار دیا جاسکتا ہے لیکن ان کے تین علیحدہ علیحدہ جسموں اور ان کے علیحدہ علیحدہ شخصیتوں کے مالک ہونے کا مسئلہ پھر بھی موجود رہے گا۔ اس لحاظ سے یہ بات بھی یقیناً عیسائی عقیدۂ تثلیث پر صادق نہیں آتی۔ دوبارہ غور کرنے سے انسان ایک ایسی اکیلی شخصیت کا تصور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جو تین شناختوں کی مالک ہے۔ ایسے نام نہاد تین جڑواں وجودوں کی شناخت اسی صورت میں متصور ہوسکتی ہے جب تین علیحدہ علیحدہ وجودوں کی بجائے ایک ہی شخص اپنے اندر تین شخصیتوں کا حامل ہو۔ یہ صورت حال خود اپنی ذات میں کئی مسائل اور الجھنیں کھڑی کرنے کا موجب بنتی ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ خدا کا کوئی جسم نہیں ہے اس لئے یہاں انسانی جسم سے مماثلت کے اطلاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یقیناً ہم خوب جانتے ہیں کہ انسانی اصطلاح کے مطابق خدا کا کوئی جسم نہیں ہے لیکن یکسانیت کی حامل

تین جڑواں روحانی ہستیوں کا مسئلہ تو پھر بھی قائم رہے گا۔ اپنی انفرادی حیثیت میں وہ علیحدہ علیحدہ ہستیاں ہوں گی اور اس کے باوجود ہر لحاظ سے وہ ہوں گی ایک اور اکیلی ہستی کے مترادف۔

مفروضہ کے طور پر ایک جیسی تین جڑواں ہستیوں کی موجودگی تسلیم کرنے کی صورت میں ایک مسئلہ اور بھی پیدا ہوگا اور وہ ہوگا عبادت کے معاملہ میں ان تینوں کے باہمی رشتہ اور تعلق کا۔ کیا خدا کی ہستی میں موجود "ایک میں تین" کی مصداق روحانی شخصیتیں بھی ایک دوسرے کی عبادت کریں گی؟ اگر یہ کہا جائے کہ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ خدا ہوتے ہوئے باہم ایک دوسرے کی عبادت سے مبرّا ہوں گی تو پھر سوال پیدا ہوگا کہ کیا وہ ایک دوسرے کی عبادت سے مبرا ہوتے ہوئے اس بات کی سزاوار ہوں گی کہ ان کی مخلوق ہستیاں ان کی عبادت کریں؟

اگرچہ عہد نامہ جدید میں بار بار اس بات کا ذکر آتا ہے کہ مسیح خدا کی عبادت کرتا تھا اور دوسروں کو بھی خدا ہی کی عبادت کرنے کی تلقین کیا کرتا تھا لیکن روح القدس کے بارہ میں ایسا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ وہ بھی "باپ خدا" کی عبادت کرتا تھا۔ مزید برآں عہد نامہ جدید میں بار بار اس امر کا بھی کوئی ذکر موجود نہیں ہے کہ مسیح نے کبھی دوسروں کو یہ تلقین کرنے کی کوشش کی ہو کہ وہ خود اس کی یا روح القدس کی عبادت کریں۔ "باپ خدا" کی عبادت کے سوا کسی اور کی عبادت کے ذکر کا سرے سے مفقود ہونا ایک ایسا امر ہے جس کی وجہ سے انسان اپنے اندر خدائے واحد کی عبادت کا ایک شوق آفریں جذبہ محسوس کرتا ہے۔

ہر چند کہ ایک عام رواج کے طور پر اب عیسائیوں کا دستور العمل یہی ہے کہ وہ "باپ خدا" کے ساتھ اس کے بیٹے کی بھی عبادت کرتے ہیں تاہم اس کی ضبط تحریر میں آئی ہوئی ریکارڈ شدہ کوئی مثالیں یا واقعاتی شہادتیں موجود نہیں ہیں کہ یسوع مسیح کے شاگردوں میں سے کبھی کسی نے اس کی (یعنی مسیح کی) عبادت کی ہو یا یہ کہ مسیح نے زمین پر اپنے عارضی قیام کے دوران انہیں ایسا کرنے کی ترغیب دلائی ہو۔ اگر اس نے ایسا کیا ہوتا تو ایسے سوال ضرور پیدا ہوتے جن کا کوئی جواب نہ بن پڑتا۔ یہی بات روح القدس کے بارہ میں بھی صادق آتی ہے یعنی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ روح القدس نے بھی کیوں کسی سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ اس کی عبادت کریں۔

اس معاملہ پر کہ وہ بایں معنی ایک میں تین تھے کہ ان کا اپنی ہستی کا شعور ایک ہو گیا تھا پہلے ہی خاصی تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ ایسی صفات کے حامل وجودوں کو جو اپنی علیحدہ ہستی کا شعور رکھتے ہوں منطقی طور پر "ایک میں تین شخصیتوں" کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ مزید برآں نہ ایک ہستی کے مختلف پہلوؤں

اور حیثیتوں کی عبادت کی جاتی ہے اور نہ وہ باشعور مختلف پہلو اور حیثیتیں خود اپنی مرکزی خودی کی آپ عبادت کرتے ہیں۔ ان مختلف پہلوؤں اور حیثیتوں کو علیحدہ ہستیاں تصور کرنے کے لئے بہرحال ان کی اپنی علیحدہ خودی اور انا کی شکل میں ان کی اپنی آزاد انفرادی شناخت ہونی چاہیے۔ یہ مخصوص انفرادیت ہی ہوتی ہے جو کسی کو اپنی علیحدہ شخصیت کے شعور سے بہرہ ور کرتی ہے اور اس کی اپنی علیحدہ شخصیت کے شعور سے بہرہ ور کرتی ہے اور اس کی اپنی علیحدہ شخصیت کو دوسروں پر آشکار کرنے والے حوالہ کا کام دیتی ہے۔ بصورت دیگر اپنے یا دوسروں کے ذکر کے لیے "میں" "تم" اور "وہ" وغیرہ کے استعمال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تثلیث کے لفظ کو ایک وجود کے لیے استعمال کرنا اس کی مختلف صفات کو ظاہر کرنے کے لیے ہی ہوسکتا ہے۔ اس سے زیادہ اس کا اور کوئی مطلب ممکن نہیں۔ اور جہاں تک صفات کا تعلق ہے وہ تین تک محدود نہیں۔ خواہ ہمیں ان کا علم ہو یا نہ ہو خدا کی بے شمار صفات ہوسکتی ہیں اور فی الحقیقت اس کے بے شمار صفات ہیں۔

خلاصہ اور اختصار کے طور پر اس بحث کو انجام تک پہنچانے کے لیے ہم دوبارہ اس بات پر زور دینا چاہتے ہیں کہ تثلیث کے مختلف اجزائے ترکیبی کے مابین ایک دوسرے کی عبادت کا سوال اس وقت پیدا ہوسکتا ہے جب وہ تینوں ہستیاں ایک دوسرے سے مختلف ہوں اور مرتبہ میں ایک دوسرے کی ہم پلّہ نہ ہوں یعنی ان کے مرتبے اور ان کے خصائص ایک دوسرے سے مختلف ہوں۔ اس صورت یعنی تفاوُت مراتب کی صورت میں تینوں میں سے صرف ایک ہی عبادت کے لائق ٹھہرے گا اور باقی دو درجہ میں کمتر ہونے کی وجہ سے اس بات کے پابند ہوں گے کہ وہ بھی اس کی عبادت کریں۔ ہرچند کہ جواب دو اور دو چار کی طرح واضح ہے لیکن اس کو قبول اسی صورت میں کیا جاسکتا ہے کہ "تثلیث" میں وحدانیت کے تصور کو دل و دماغ سے محو کر دیا جائے۔ اس کی سرے سے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ آپ بیک وقت "ایک میں تین" اور "تین میں ایک" دونوں پر ایمان رکھتے ہوں۔

اس صورت حال کے پیش نظر مجھے ایک مزاحیہ واقعہ یاد آگیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اس سے لطف اندوز ہوں اس لیے اسے یہاں درج کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بغداد میں جوہا نامی ایک درباری مسخرا تھا جو اپنے فن میں بہت طاق اور شہرۂ آفاق تھا۔ جب تیمور لنگ نے بغداد پر حملہ کیا۔ وہاں وہ اس کے مزاح اور پر لطف باتوں کے پیرایہ سے بہت خوش ہوا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ جوہا کو بھی مال غنیمت کے طور پر اپنے ساتھ لے جائے گا اور اسے اپنے ہاں دربار کے مسخرۂ اعلیٰ کے طور پر مقرر

کرے گا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز جوہا کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اکیلا بیٹھ کر بھنا ہوا گوشت کھائے اور کھائے بھی خوب جی بھر کے۔ اشتہا اتنی تیز تھی وہ اسے دبا نہ سکا۔ وہ سیدھا بازار گیا اور وہاں سے بہترین قسم کا دو کلو گوشت خرید لایا۔ گوشت کو اپنی بیوی کے حوالہ کرتے ہوئے اسے ہدایت کی کہ وہ اس سے بھنے ہوئے گوشت کا بہترین اور لذیذ ترین کھانا تیار کرے۔ کوئی اور اسے ہاتھ نہ لگائے اور پورے کا پورا اس کے لئے مخصوص رہے۔ حتیٰ کے اس نے بیوی کو بھی منع کر دیا کہ وہ خود اس میں سے ایک آدھ بوٹی چکھنے کی بھی جرأت نہ کرے۔ بد قسمتی یہ ہوئی کہ جونہی اس کی بیوی گوشت بھوننے سے فارغ ہوئی اس کے چند بھائی اپنی بہن سے ملنے کے لئے آوارد ہوئے۔ اس کے اپنے لئے تو اچانک بھائیوں کا آنا بہت خوش گوار حیرت اور پر مسرت اچنبہ کا موجب تھا لیکن جوہا کے لیے ان کا یوں آدھمکنا بد قسمتی کے پیش خیمہ سے کسی طرح کم نہ تھا۔ تازے بھنے ہوئے لذیذ گوشت کی خوشبو پر ان نو وارد مہمانوں کا دل ایسا للچایا کہ بے چین ہو ہو کر لگے ہونٹوں پر زبان پھیرنے۔ پھر وہی کچھ ہوا جس کا ہونا منطقی نتیجہ کے طور پر ناگزیر تھا۔ مزے لے لے کر گوشت چٹ کرنے اور اس کا اس طرح صفایا کرنے کے بعد اس کا کوئی بھورا اور ذرّہ بھی باقی نہ رہا۔ انہوں نے پریشان حال فکر مند بہن سے رخصت ہونے کی اجازت لی اور وہاں سے چلتے بنے۔ جوہا کے آنے سے پہلے پہلے اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ہوش بجا کر کے ایسا بہانہ تراشا کہ اس کے نزدیک جس کا کوئی توڑ ممکن نہ تھا۔ مگر جوہا بھی اپنی جگہ کچھ کم چالاک و ہوشیار اور عیار نہ تھا۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو ابھی بھنے ہوئے گوشت کی بچی کھچی اور فضا میں رچی بسی خوشبو باقی تھی۔ اس نے بڑے اشتیاق سے مطالبہ کیا کہ اس کا بھنا ہوا دو کلو گوشت اس کے سامنے پیش کیا جائے تا کہ وہ کھا کر مونچھوں پر تاؤ دے سکے۔ بیوی نے اس کی لاڈلی بلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا اگر ہو سکے تو مطلوبہ گوشت اپنی اس پیاری اور لاڈلی بلی کے پیٹ میں سے نکال لو۔ میں جب گھر کے دوسرے کام کاج میں مصروف تھی تو اس نے گوشت پر ایسا دھاوا بولا کہ صفایا کر ڈالا۔ جوہا کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور بلی کو ترازو میں رکھ کر لگا اس کو تولنے۔ بلی کا وزن پورے دو سیر نکلا۔ اس نے اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر بڑی نرمی سے جس میں درپردہ گرمی سموئی ہوئی تھی کہا میری پیاری بیوی مجھے تمہاری بات کا پورا یقین ہے لیکن اگر یہ دو کلو گوشت میرا ہے تو میری بلی کہاں گئی؟ اور اگر یہ میری بلی ہے (اور واقعہ بھی یہی ہے کہ یہ ہے میری بلی) تو میرا لایا ہوا دو کلو گوشت کہاں گیا؟

یہ تو ہے ایک لطیفہ جس میں مسئلہ زیر غور کی سراسر غیر منطقی صورت حال کی طرف ایک لطیف

اشارہ مضمر ہے۔ کہنا مجھے اب یہ ہے کہ میں اس مسئلہ پر مسیح کی اصل اور حقیقی تعلیم کی رُو سے بحث کرنا نہیں چاہتا۔ اس مقالہ میں موجودہ زمانہ کے عیسائی عقائد پر تنقیدی نظر ڈالنے اور انہیں پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان عقائد کے بارہ میں ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ عقائد مسیح کی اصل تعلیم سے بہت دور ہٹ کر کچھ اور ہی شکل اختیار کر چکے ہیں۔

میری طرف سے اس انکار کے بعد کہ بائبل میں ایسا کوئی حوالہ یا اشارہ موجود نہیں ہے جس کی رو سے یہ ثابت ہو سکے کہ خدا کے علاوہ مسیح کی بھی باقاعدہ عبادت کی جاتی تھی میرے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ میں لوقا کی انجیل کے باب 24 کی آیت 52 میں پوشیدہ ایک اس نوعیت کے حوالہ کی وضاحت کروں۔ بعض مسیحی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ آیات اس امر کا ثبوت مہیا کرتی ہیں کہ مسیح نے خود اپنے پیروؤں کو تلقین کی کہ وہ اس کی بھی عبادت کیا کریں۔ عصر حاضر کے عیسائی سکالرز اس امر سے خوب باخبر ہیں کہ یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یہ آیات اصلی نہیں بلکہ وضعی ہیں اور اس بات کی ہرگز حق دار نہیں ہیں کہ انہیں سینٹ لوقا کی انجیل کا اصلی اور مستند حصہ شمار کیا جائے۔

اب ہم مسیحی صاحبان کے عام مروّجہ طریق اور عمل کی طرف آتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ آیا ان کے اس مروّجہ طریق اور عمل کو انجیل کی تائید حاصل ہے یا نہیں۔ فی زمانہ بہت سے مسیحی فرقوں کے طرزِ عمل کی رُو سے خدا کے بیٹے کی حیثیت سے مسیح کی یقیناً پرستش کی جارہی ہے۔ بایں ہمہ وہ سب فرقے اس بات پر بھی متفق ہیں کہ وہی مسیح جس کی وہ پرستش کرتے ہیں وہ خود صرف ''باپ خدا'' کی اور صرف اور صرف اسی کی عبادت کیا کرتا تھا۔ میں نے بارہا مسلّمہ عیسائی سکالرز سے اس بات کی وجہ پوچھی ہے کہ اگر مسیح خود خدا کا جزو لاینفک تھا اور اس طرح کامل اور مکمل طور پر اس میں مدغم تھا کہ تین علیحدہ علیحدہ شخصیتیں موجود ہونے کے باوجود ان کے باہم مدغم ہونے سے خود ان میں وحدانیت کا تصور ابھرے بغیر نہ رہتا تھا تو پھر مسیح کے ''باپ خدا'' کی عبادت کرنے کی وجہ کیا تھی اور وہ کیوں اس کی عبادت کرتا تھا لیکن کوئی ایک سکالر بھی مجھے اس کا جواب نہیں دے سکا اور میری یہ کوشش ہمیشہ رائیگاں ہی گئی۔ ایک نہیں، اس بارہ میں کئی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ کیا مسیح نے کبھی تثلیث کے تیسرے جزو یعنی روح القدس کی بھی عبادت کی؟ کیا وہ کبھی اس امر کا بھی مرتکب ہوا کہ اپنی پرستش آپ کرے؟ کیا روح القدس نے کبھی مسیح کی پرستش کی؟ کیا ''باپ خدا'' نے کبھی تثلیث کے بقیہ دو اقانیم کو لائق عبادت گردانا اور اپنے لئے خود ان کی عبادت کو

لازم پکڑا؟ اگر نہیں تو کیوں؟ شاید یہ سوال اور ان کے واضح اور غیر مبہم جواب کبھی نہ کبھی عیسائیوں کو اس اقرار پر مجبور کر دیں گے کہ "باپ خدا" کو تثلیث کے بقیہ دو اجزا پر یقیناً برتری اور بالادستی حاصل ہے۔ اس سے یہ امر ثابت ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ تثلیث کے تین اجزا یا اقانیم بلحاظ مرتبہ ہم پلّہ نہیں ہیں۔ لہٰذا اگر وہ تین ہی ہیں تو لازماً وہ "تین میں تین" ہیں اور یقیناً وہ "ایک میں تین" نہیں ہیں۔

بعض اوقات جب مسیحی صاحبان کو مسیح کے متعلق جسے وہ خدا کا بیٹا یقین کرتے ہیں اس سوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ وہ تو خود "باپ خدا" کی عبادت کیا کرتا تھا تو پھر آپ لوگ کیوں مسیح کی عبادت کرتے ہیں تو وہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ وہ تو "انسان مسیح" تھا جو خدا کی عبادت کرتا تھا، "بیٹے" نے اپنے "باپ خدا" کی کبھی عبادت نہیں کی۔ یہ جواب ہمیشہ پھر اسی بحث کی طرف لے جاتا ہے جو ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ کیا دو باشعور ہستیوں نے مسیح کے اکیلے جسم پر قبضہ جمایا ہوا تھا۔ ان دو ہستیوں میں سے ایک انسانی شعور کی حامل تھی اور دوسری ہستی اس شعور کی حامل تھی کہ وہ خدا کا بیٹا ہے؟ پھر یہ سوال بھی پیدا ہو گا کہ اس جسم میں موجود انسان نے اسی میں بیک وقت موجود "خدا کے بیٹے" کے ساتھ ایک ہی جسم میں موجود تھا، تیسرے اقنوم یعنی روح القدس کی بھی عبادت کرنی چاہیے تھی جو اس نے کبھی نہیں کی۔

عبادت فی الاصل ذہن اور روح کے باطنی عمل سے عبارت ہوتی ہے جس کا بعض اوقات جسمانی حرکات و سکنات کی مرئی علامتوں سے بھی اظہار کیا جاتا ہے۔ اس نظر آنے والی مرئی اظہار کے باوجود عبادت انسان کے ذہنی اور جذباتی وجود یا ہستی میں جڑ کی طرح پیوست ہوتی ہے لہٰذا یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ جب مسیح خدا کی عبادت کرتا تھا تو عبادت کا عمل کس سے سرزد ہوتا تھا؟ ہم اس منظر نامہ کو اس کی تمام تر باریکیوں اور پیچیدگیوں کے ساتھ قبل ازیں اچھی طرح کرید اور کھنگال کر ثابت کر چکے ہیں کہ یہ "خدا کا بیٹا" ہی تھا جو خدا کی عبادت کرتا تھا اور اس نے انسان ہوتے ہوئے اپنے ساتھی اور شریک مسیح کی کبھی عبادت نہیں کی۔ تو پھر عیسائی صاحبان زمین پر خود یسوع کے اس پاک نمونہ اور اُسوہ کی کیوں خلاف ورزی کرتے ہیں؟ جبکہ انسان یسوع نے اپنے شریک کار مسیح کی اس کے ساتھ اپنی انتہائی قربت کے باوجود کبھی عبادت نہیں کی تو وہ (یعنی عیسائی صاحبان) خدا کے ساتھ ساتھ مسیح کی بھی عبادت کیوں کرنے لگتے ہیں؟

یکساں اور مساوی خصوصیات رکھنے والی مختلف ہستیاں

تثلیث کے اندر "ایک میں تین" کے فارمولا کا اب ہم ایک اور زاویۂ نگاہ سے جائزہ لیتے ہیں۔ اس

وقت ہم جس منظر نامہ کی رو سے اس فارمولہ کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ تثلیث کے تینوں اجزا یا اقانیم باہم ایک جیسے اور ایک دوسرے کے ہم پلہ ہیں۔ ان کے مابین کسی لحاظ سے بھی کوئی فرق ہے ہی نہیں۔ اس منظر نامہ میں ہم ایک ایسی شخصیت کی بات نہیں کر رہے جس میں مختلف نوعیت کے خدوخال، خطوط واقواس، نقش و نگار اور اعضاو قُوٰی آ جمع ہوئے ہوں بلکہ وہ تین جڑواں بچوں کی طرح تین علیحدہ علیحدہ شخصیتوں کے مالک ہیں۔ یہ اس قسم کی تین جڑواں شخصیتیں ہیں کہ ان میں مکمل یکسانیت پائی جاتی ہے۔ مکمل یکسانیت سے مراد یہ ہے کہ ان کے مابین پائی جانے والی یکسانیت ان کی شکل و صورت اور بناوٹ تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ان کی یکسانیت سوچ، بچار، افکار و خیالات اور جذبات و احساسات کے پورے طریق عمل و طریق کار بلکہ ان کو باہم منضبط کرنے والے پورے سلسلہ ہائے نظام تک ممتد ہے۔ وہ اپنے افکار و خیالات، احساسات و جذبات اور تجربات میں الغرض ہر چیز اور ہر بات اور ہر کام میں پوری یکسانیت کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ ایسی صورت میں ہر شخص یہ تسلیم کیے بغیر نہیں رہے گا کہ تثلیث کے تین اجزائے ترکیبی میں سے دو کا وجود محض فالتو ہے۔ اگر ان میں سے دو کو ختم بھی کر دیا جائے تو تثلیث میں باقی رہ جانے والا ایک جزو یا اقنوم باقی دو کے ختم ہو جانے سے خفیف سا بھی متاثر نہیں ہو گا کیونکہ وہ خود اپنی ذات میں مکمل ہے اور مکمل رہے گا۔ قرآن مجید نے بھی ایک رنگ میں اس سوال کو اٹھایا ہے۔ جب وہ توجہ دلاتا ہے کہ اگر خدا یسوع مسیح اور روح القدس کو ہلاک اور نابود کرنا چاہے تو کیا فرق پڑ سکتا ہے اس کے جلال و جبروت، اس کی ابدیت اور اس کے کمال لازوال پر اور کون روک سکتا ہے اس کو اگر وہ ایسا کرنا چاہے (18:5) اس سے مراد یہ ہے کہ صفات الٰہیہ دائمی اور ابدی طور پر اپنا جلوہ ظاہر کرتی رہیں گی۔ ان کی جلوہ گری میں کوئی رخنہ یا رکاوٹ کبھی اور کسی حال میں پڑ ہی نہیں سکتی۔ اس لحاظ سے تثلیث کا نظریہ جو اس منظر نامہ میں پیش کیا گیا ہے سراسر نامعقول اور بلا ضرورت ثابت ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

ہاں اگر فرض یہ کیا جائے کہ نظریہ تثلیث میں پائی جانے والی تین شخصیتیں تین علیحدہ علیحدہ کام انجام دیتی ہیں ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ خدا کی خداوندی کو پورا اور مکمل کرنے کے لئے تینوں اجزا کا وجود لازمی اور ضروری ہو گا لیکن واضح طور پر اس کے ساتھ تین خداؤں کی موجودگی کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا اور یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ ایک دوسرے سے تعاون کر رہے ہوں گے اور باہم خوب گھل مل کر رہ رہے ہوں گے لیکن ایسی صورت میں انہیں "تین میں تین" خدا ہی مانا جائے گا نہ کہ مروجہ عیسائی عقیدہ کی رو

سے ''ایک میں تین خدا۔''

اب اگر اس مشکل سے بچنے کے لیے یہ تجویز کیا جائے کہ کہنے کو یہ ہے تو ''تثلیث'' لیکن فی الاصل یہ ہے ایک ایسی اکیلی شخصیت کی طرح جس کے تین مختلف نامیاتی کام ہیں اور وہ سب ایک ہی شخصیت کے ساتھ وابستہ ہونے کے باعث اسی کی ذات میں مجتمع ہیں۔ ایسی صورت میں یقیناً وحدانیت کو تو برقرار رکھا جاسکتا ہے لیکن تثلیث کا کوئی نام ونشان باقی نہیں رہتا لیکن یہاں بہت سے نامیاتی کام انجام دینے والی ایک واحد ہستی کی بات نہیں ہو رہی ہے۔ بات ہو رہی ہے اس منظر نامہ میں تین مساوی الحیثیت ہستیوں کی۔ ان میں سے ہر ایک بعینہٖ وہی کام انجام دے رہی ہے جو اس کے دوسرے ساتھی دے رہے ہیں اور بعینہٖ ایک ہی کام انجام دینے کے باوجود ان میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہوئی ہے۔ جو کچھ ہم یہاں بیان کر رہے ہیں اس سے دراصل تو ایک یعنی اکیلی ہستی کا تصور ہی ابھرتا ہے لیکن وہ ایک ایسی ہستی ہے جس کے مختلف اعضا ہیں۔ یہاں تک اتنا ضرور ہے کہ ایسی اکیلی ہستی کے تصور میں کوئی غیر منطقی بات محسوس نہیں ہوتی لیکن جب اس ہستی کے اعضا میں سے ہر عضو کو ایک علیحدہ ہستی یا شخصیت قرار دیا جائے اور ساتھ ہی یہ بھی یقین کیا جائے کہ ان میں سے ہر عضو کی شخصیت اپنی ذات میں ہر طرح مکمل ہے اور ان معنوں میں واحد، اکیلی اور مکمل ہے کہ وہ کسی احتیاج سے مبرّا ہے تو پھر اس سے ایک ایسی صورت حال ابھرتی ہے جہاں منطق اور عقل کی کچھ پیش نہیں جاتی۔ اس کی حدود یکسر ختم ہو کر رہ جاتی ہیں اور یہ بحث از اول تا آخر ناقابل قبول بن جاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اعضا کی بھی اپنی ایک ہستی اور انفرادیت ہوتی ہے لیکن ان کی یہ انفرادیت ایک بڑی شخصیت کا جزو ہوتی ہے کیونکہ اس بڑی شخصیت کا ایک عضو نہیں ہوتا بلکہ اس کے اور بہت سے دوسرے اعضا بھی ہوتے ہیں۔ جب ہم کسی انسان کی شخصیت کا ذکر کرتے ہیں۔ تو اس کے سارے اعضا اپنی مجموعی حیثیت میں انسان کہلاتے ہیں۔ بے شک ان میں سے بعض اعضا چھوٹے اور نسبتاً کم اہم کام کرتے ہیں اور ایک انسان ان اعضا کے بغیر بھی انسان رہ سکتا ہے۔ لیکن ایسا انسان اپنی ذات میں نقص اور خامی کا حامل ہوتا ہے۔ ایک مکمل انسان کے لئے ضروری ہے کہ اس کے وہ تمام اعضا صحیح حالت میں موجود ہوں جو ایک عام انسان کے ہوتے ہیں۔ اور ان کی کارگزار و کار آمد حالت کی مجموعی ہیئت اسے ایک مکمل انسان کہلانے کا مستحق بناتی ہے۔

اگر ہم ایک انسان کو بطور مثال لے کر مذکورہ بالا منظر نامہ کی رو سے ابھرنے والی ہستی کو واضح کرنا

چاہیں تو ہم فرض کر لیتے ہیں ایک شخص ہے جس کا نام پال (Paul) ہے۔ اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ چونکہ پال کا جگر اور دل اور اسی طرح اس کے پھیپڑے اور گر دے اپنی انفرادیت رکھتے ہیں اور اپنے اپنے مفوّضہ کام انجام دیتے ہیں تو وہ بھی اپنی اپنی جگہ اپنی ذات میں پاؤل ہی کی طرح اس جیسے انسان ہیں۔ ان اعضا میں سے ہر ایک عضو کی پورے اور مکمل انسان کے ساتھ یکسانیت صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے کہ ہم ازراہِ امتثال یہ کہیں کہ اکیلے گر دے اپنی جگہ کلیۃً وہ سارے امور انجام دے رہے ہیں جو پاؤل کو مکمل انسان ہونے کی حالت میں انجام دینا ہوتے ہیں۔ اور اسی انداز سے اس کے دوسرے اعضا کے بارہ میں بھی یہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں تو یہ بھی کہنا پڑے گا کہ ہر عضو کی غیر موجودگی پاؤل کے کاموں اور کردار میں سرِ مُو کوئی فرق نہ ڈالے گی۔ بالفاظ دیگر مطلب یہ ہوا کہ پاؤل کے پھیپھڑے، دل، گر دے اور دماغ بلکہ اس کے تمام اعضا بھی نکال باہر کیے جائیں تو پاؤل پھر بھی اپنی ذات میں مکمل رہے گا یعنی اس کے مکمل ہونے میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ ایسا اس لیے ہو گا کہ آخری تجزیہ کی رُو سے تمام اعضا کے مابین اپنی اپنی جگہ مکمل یکسانیت موجود ہو گی اور باہم ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے کی صورت میں بھی ان کے درمیان کوئی فرق آئے گا ہی نہیں۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو پاؤل کی اپنی شخصیت بھی ان اعضا کی عدم موجودگی کے باوجود صحیح سالم رہے گی۔ اگر ''تین میں ایک'' کا یہی منظر نامہ بنتا ہے تو پھر منطق کی رو سے مسیحی عقائد پر تنقید کرنا ہی کارِ بے مقصد ٹھہرے گا۔ موجودہ زمانہ کے مسیحی اعتقاد پر جو منطق صادق آئے گی وہ میکبتھ (Macbeth) کی جادوگرنیوں والی الٹی منطق ہو گی جو یہ کہتی ہے کہ ''خوب ناخوب ہے اور ناخوب ہے خوب'' جس کا مطلب یہ ہے کہ نیکی فی الاصل بدی کے مترادف ہے اور بدی اپنی ذات میں نیکی ہے۔

باب ہفتم

مسیحیت کا ارتقا

مسیحی ایمانیات میں تثلیث کے عقیدہ کو بنیادی عقائد میں سے ایک مرکزی عقیدہ کی حیثیت حاصل ہے بایں ہمہ حقیقت یہ ہے کہ مسیح کے اپنے زمانہ حیات میں اس نام نہاد عقیدہ کا کہیں کوئی نام و نشان نہیں ملتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ واقعۂ صلیب کے بہت بعد اس عقیدہ نے رفتہ رفتہ مختلف شکلیں اختیار کرنا شروع کیں۔ اسے آخری اور معین شکل دینے میں کئی صدیاں لگ گئیں لیکن پھر بھی یہ ایک ایسا معمہ بنا رہا اور ہنوز بنا ہوا ہے کہ جسے واضح طور پر حل کرنا ممکن نہ ہو سکا اور نہ آج تک ہو سکا ہے۔ یہ عقیدہ ایک مابہ النزاع امر کی حیثیت سے مسیحی ماہرین دینیات اور مسیحی فلسفیوں کے مابین بہت طویل اور تلخ بحث و تمحیص کا موضوع بنا رہا۔ اس بحث میں حصہ لینے والے مسیحی ماہرین دینیات اور فلسفی وغیرہ مختلف مذہبی، ثقافتی اور روایتی پس منظروں اور ان کے ناگزیر اثرات کے حامل تھے چنانچہ وہ اپنے اپنے رنگ میں اس بحث پر اثر انداز ہوتے رہے۔

یہ عقیدہ مختلف سرزمینوں کے دیومالائی قصوں کہانیوں، رسوم و رواج اور روایتوں وغیرہ سے بڑی حد تک متاثر ہوتا رہا ہے۔ یہ وہ سرزمینیں تھیں جنہوں نے شروع زمانہ میں عیسائیت کو اپنے ہاں آنے دیا، اسے برداشت کیا اور ایک رنگ میں اس کی میزبانی کے فرائض انجام دیئے۔ مسیحیت کی شاخ فی الاصل شجر یہودیت کے تنے سے ہی پھوٹی تھی اس لئے قدرتی طور پر اس کے ابتدائی دور میں جس حد تک بھی ممکن ہو سکا اس کی خبر گیری اور تشکیل و صورت گری میں اسی نے حصہ لیا۔ مسیحی تاریخ کے تمام تر ابتدائی حصہ میں خود یہودیوں کی طرف سے مخالفت کے پہلو بہ پہلو مسیحیت پر یہودی اثر ہی غالب رہا۔ مسیح کے شاگردوں نے مسیحیت کا درس براہ راست خود مسیح سے ہی لیا اور اس کے معانی و مفہوم اور مالہ وماعلیہ کو تمام تر اسی سے سمجھ کر اسے اپنے دل میں جگہ دی۔ پھر یہی نہیں بلکہ جو کچھ سیکھا خود مسیح کی ذات میں اس کا عملی نمونہ مشاہدہ کیا۔ مسیح کے وہ سب شاگرد یہودیوں میں سے ہی آئے تھے۔ آغاز کار ہی آشامل ہونے کی وجہ سے وہ مسیحیت کے ابتدائی محافظ تھے۔ مسیحیت پر ان کے ایمان کی جڑیں مسیح کی مقدس ہدایات اور اس کی

زندگی کے طور طریق اور عملی نمونہ میں پیوست تھیں۔ پھر وہی تھے جنہوں نے مسیح کے واقعۂ صلیب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور قتل کیے جانے کی عملی کوشش سے ان کے زندہ بچ نکلنے کا بچشم خود مشاہدہ کیا تھا۔

مسیح پر ایمان لانے والے اور ابتدائی پیرو

معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی زمانہ کے مسیحیوں میں آگے چل کر دو امور کے متعلق اختلاف پیدا ہو گیا تھا اور وہ امور یہ تھے (1) مسیح کا مرتبہ و مقام کیا ہے؟ (2) آیا موسوی شریعت سے وابستہ رہتے ہوئے اس کی پیروی کی جائے یا نہ کی جائے؟ ہوا یہ کہ آگے چل کر جسے ہم مسیحیت کی نشو و نما اور ترقی کے دوسرے دور سے تعبیر کر سکتے ہیں سینٹ پال (پولوس) نے مسیحیت کو ایک نیا فلسفہ اور نیا نظریہ دینے میں مرکزی کردار کی حیثیت حاصل کر لی۔ پولوس اور جیمز کے درمیان جو راستباز جیمز (James the Righteous) کے نام سے موسوم تھا، بنیادی نوعیت کے نظریاتی اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ جیمز یروشلم کے کلیسیا کا نگہبان اور سربراہ تھا جبکہ پولوس مغربی سرزمینوں میں عیسائیت کا پرچار کر رہا تھا اور کر بھی رہا تھا غیر یہودی اقوام میں۔ سو یروشلم کے کلیسیا کے بالمقابل مغربی کلیسیا نے خاص طور پر پولوسی عقائد کے انداز میں نشو و نما پائی جبکہ یروشلم کا کلیسیا مسیح کی اصل تعلیم پر ہی قائم رہا جس میں توحید باری کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

جیمز نے اپنے دور امارت میں مسیح کی جس تعلیم کو عام کیا اسی کے زیر اثر آگے چل کر ایبیونائٹس (Ebionites) کے نام سے ایک فرقہ بنا۔ اس کا نام عبرانی لفظ ایبیونم (Ebionim) سے ماخوذ تھا جس کے معنے تھے "غریب" اس سے مراد تھی فقر کو ترجیح دینے والے دل کے غریب۔ وہ دراصل یہودی مسیحی تھے۔ یسوع ان کے نزدیک مسیح کی حیثیت سے ظاہر ہوا تھا۔ اور یہ کہ اس کا ظہور "خدا کے بیٹے" کے طور پر نہیں تھا۔ وہ بڑے جذبہ و جوش کے ساتھ موسوی شریعت پر عمل پیرا تھے۔ ان کی اپنی ایک انجیل تھی جو مختلف نسبتوں کے اعتبار سے "عبرانیوں کی انجیل" (Gospel of Hebrews)، "ایبیونائٹس کی انجیل" (Gospel of Ebionites) اور "ناضریز کی انجیل" (Gospel of Nazarenes) کہلاتی تھی۔

تاریخ کلیسیا کے نام سے جو کتاب سیزاریا (Caesarea) میں لکھی گئی تھی اس کے مصنف یوسیبس Eusebius نے اس کی تیسری کتاب "ویسپاسیئن ٹو ٹراجن" (Vespasian to Trajan) میں ایبونائٹس کا ذکر کیا ہے۔ وہ ان کے نظریات کا ذکر کرتے ہوئے تضحیک سے کام لیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان کا

نام اس لیے "ابیونائٹس" کہلاتا ہے کہ وہ مسیح کے بارہ میں بہت گھٹیا اور ذلت آمیز خیالات کے حامل تھے۔ حالانکہ ابیونائٹس مسیح کو تمام دوسرے انسانوں کی طرح ایک فانی انسان سمجھتے تھے۔ وہ اس کی نیکی اور راستبازی کو جو اس نے اپنی بلند کرداری اور اخلاقی رفعت کی وجہ سے حاصل کی تھی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہودی ہونے کی وجہ سے وہ سبت کے دن کا احترام کرتے تھے۔ شریعت کی ہر تفصیل پر عمل پیرا تھے اور اس پولوسی نظریہ کے قائل نہ تھے کہ نجات صرف ایمان کے وسیلہ سے نصیب ہوتی ہے۔ اس نے ابیونائٹس کے ایک گروہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس گروہ کے لوگ مسیح کے کنواری کے بطن سے جنم لینے کے قائل تھے۔ وہ روح القدس پر بھی ایمان رکھتے تھے لیکن اس نظریہ کے قائل نہیں تھے کہ مسیح پیدائش سے قبل خدا کے کلام اور اس کی حکمت بالغہ کے روپ میں پہلے سے موجود تھا۔ وہ ہیبریوز کی انجیل کی پیروی کرتے تھے۔ وہ ممکنہ طور پر متی کی انجیل ہو سکتی تھی۔ وہ سبت کا دن مناتے تھے اور یہودی طور طریق پر عمل پیرا تھے۔ البتہ وہ مسیح کے جی اٹھنے کا دن بھی مناتے تھے اور اس پر خوشی کا اظہار کرتے تھے۔

(The History of the Church by Eusebius, p. 90-91 Penguin, 1989)

آر آئزن مین (R.Eisenman) نے اپنی کتاب The Dead Sea Scrolls Uncovered (یعنی بحر مردار کی گولائی میں لپٹے ہوئے صحائف کے مندرجات کا انکشاف) میں ابیونائٹس فرقہ کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جیمز دی رائیٹیٹس پہلی صدی عیسوی کے وسط میں (قریباً 40 تا 46 بعد از مسیح) کلیسیائے یروشلم کا سربراہ تھا۔ یہ کلیسیا کی وہ شاخ تھی جو ماضی قریب کی نسبت سے فلسطین میں "یہودی مسیحیت" کہلاتی تھی۔ ابیونائٹس نے اسی شاخ سے ابھر کر ایک فرقہ کی شکل اختیار کی تھی۔

(The Dead Sea Scrolls Uncovered by R. Eisenman & M. Wise, p. 186, Element Books, 1992)

جو جماعت جیمز دی رائیٹیٹس کی پیرو تھی اس کے افراد "غربا" (یعنی دل کے غریب" کہلاتے تھے۔ (سلتیوں کے نام خط باب 2 آیت 10) نیز (یعقوب کا خط باب 2 آیت 3 تا 5)۔ یہ ایک ایسا لقب ہے جو مسیح کے پہاڑی وعظ میں بھی آتا ہے اور "ڈیڈ سی سکرولز" (بحر مردار کے لپٹے ہوئے صحیفوں) میں بھی آتا ہے۔ مذکورہ مصنف آئزن مین کا احساس یہ ہے کہ کئی لحاظ سے ابیونائٹس "ڈیڈ سی سکرولز (بحر مردار کے صحیفوں) کے مصنفوں سے ملتے جلتے لوگ تھے۔ وہ جیمز دی رائیٹس کا بہت احترام کرتے تھے اور یسوع کا اپنا مسیحا یقین کرتے تھے لیکن سمجھتے تھے اسے دوسرے انسانوں کی طرح ایک فانی انسان۔ ان کے نزدیک پولوس نے شریعت موسوی سے ارتداد اختیار کر لیا تھا۔ وہ خود شریعت موسوی پر پوری طرح عمل کرتے

تھے نیز سبت کا بھی بڑے جذبہ وجوش سے احترام کرتے تھے اور اس کی پوری طرح پابندی کے دل سے قائل تھے۔ جیمز کو وہ بہت اونچا مقام اور مرتبہ دیتے تھے جبکہ پولوس کو اصل مسیحیت کا دشمن گردانتے تھے۔

(متی باب13 آیت25تا40)
Ibid. p. 233-34

بیجنٹ(Baigent)،لائیگ(Leigh)اور لنکن(Lincoln)کے نزدیک ابتدائی زمانہ کے مسیحی فرقے ایبیونائٹس (Ebionites)، نوسٹکس (Gnostics) مانیچیئنز (Manicheans)، مانڈینز (Mandeans)، سابئنز(Sabians)، نسطوریز(Nestorians)، ایلکاسائٹس (Elkasites) وغیرہ ناضریز(Nazarene) فلاسفی کے ماننے والے تھے۔ مذکورہ بالا سب مصنّفین ناضریز کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ سمجھتے تھے کہ:

ناضریز کے طور طریق اور اقوال سے اخذ کردہ یسوع اور اس کی بیان کردہ اصل تعلیم کی طرف اپنے رخ کو قائم رکھنا اور اس سے ادھر ادھر نہ ہونا ضروری ہے۔ اور یہ وہی تعلیم تھی جسے جیمز، جیوڈاز اور تھامس اور ان کے ساتھیوں نے تبلیغ کے ذریعہ پھیلایا اور عام کیا۔ناضریز کی تقلید میں ان سب فرقوں کے عقائد یہ تھے۔

1. موسوی شریعت کے ساتھ پوری وابستگی اور اس کی مکمل پابندی۔
2. یسوع کے متعلق یہ یقین رکھنا کہ وہ مسیح تھا۔
3. اس امر کو تسلیم کرنا کہ مسیح عام انسانوں کی طرح ہی پیدا ہوا تھا۔
4. پولوسی نظریات کو غلط سمجھنا اور ان کی مخالفت کرنا۔

استنبول کی لائبریری میں عربی مخطوطات کا ایک مجموعہ رکھا ہوا ہے جو ایک اور قدیمی مخطوطہ کے متن کے اقتباسات پر مشتمل ہے۔ یہ متن ”النصاریٰ“ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور پانچویں یا چھٹی صدی عیسوی کے زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ ملک شام کی ایک قدیمی زبان میں لکھا ہوا ہے۔ مخطوطات کا یہ مجموعہ ایران عراق سرحد کے قریب جنوب مغربی ایران کے علاقہ میں واقع خوزستان کی ایک خانقاہ سے ملا تھا۔ اس مجموعہ مخطوطات سے ناضریز (Nazarene) کے مذہبی پیشواؤں کے عقائد و نظریات کی عکاسی ہوتی ہے۔ یہ 66 عیسوی میں رونما ہونے والی تباہی کے بعد یروشلم سے بچ بچا کر یہاں پہنچا تھا۔ اس میں یسوع کا

ایک انسان کے طور پر ذکر کیا گیا ہے اور یہودی قانون شریعت کو اس میں بہت اہمیت دی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پولوس کے ماننے والوں نے مسیح کے مذہب کو ترک کر دیا تھا اور وہ اہل روما کے مذہبی عقائد کی طرف مائل ہو گئے تھے۔"

('The Messianic Legacy' M.Baigent, R.Leigh, H.Lincoln. p.135-138, Corgi Books)

مسیحی عقائد کی تشکیل کے مراحل میں جو عقائد ابھر کر سامنے آئے ان میں سے صرف ناضرینز (Nazarene) کے عقائد ہی اس بات کے سزاوار ہیں کہ انہیں دوسروں کے عقائد پر ترجیح دی جائے۔ یہ ابتدائی مسیحی وہ تھے جنہیں مسیحیت کی تعلیم کے معانی و مفہوم سے خود مسیح نے آگاہ کیا تھا۔

پولوس کا کردار

ظاہر ہے اس وقت وہاں (یروشلم اور اس کے گرد و نواح میں) پولوس اور اس کے مکتب فکر کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ بعد میں جب پولوس مسیحیت میں داخل ہوا تو اس وقت سے مسیحیت بیرونی سرزمینوں اور خاص طور پر سلطنت روما کے مغربی علاقوں میں پھیلنی شروع ہوئی جہاں ملحدانہ مذاہب نے اپنے پنجے گاڑے ہوئے تھے۔ یہ نئے نئے علاقوں میں پہلے سے پھیلی ہوئی ثقافتوں اور ان کے دیومالائی قصوں کہانیوں کا زبردست اثر قبول کرتی اور ان کی طرف مائل ہوتی چلی گئی۔ اس طرح یہ اپنی قدرتی ماہیت اور ابتدائی پاکیزگی سے محروم ہو کر اس سے دور سے دور تر ہوتی چلی گئی۔ ادھر خود پولوس نے بھی جو ان علاقوں میں عیسائیت کا پرچار کر رہا تھا خود اپنی پراسرار ضعیف الاعتقادی کا کچھ نہ کچھ عنصر اس میں متعارف کرایا اور اس طرح وہ خود بھی مسیحی خیالات و نظریات میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر اثر انداز ہوتا چلا گیا۔ اس طرح مسیحی نظریات میں انحطاط کی کیفیت کا رونما ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ پولوس نہ تو خود یہودی النسل تھا اور نہ اس کا مسیح سے براہ راست کوئی رابطہ یا تعلق قائم ہوا تھا سوائے اس کے کہ اس کے اپنے دعویٰ کے بموجب وہ مسیح سے خواب میں ملا تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ پہلے ہی سے اجنبی ثقافتوں کے زیر اثر تھا اور ان کا زبردست اثر قبول کرتا رہا تھا۔ پولوس کے سامنے دو ہی راستے تھے کہ وہ سلطنت روما میں خدا جانے کب سے پھیلے ہوئے توہمات، دیومالائی قصوں اور روایتی داستانوں کے خلاف زبردست تبلیغی جہاد کرتا اور بحث و تمحیص کا سلسلہ شروع کر کے ان سے پوری طرح نبرد آزما ہوتا یا پھر وہ ان کے آگے ہتھیار ڈال دیتا اور ان کی ضرورتوں اور خواہشوں کے عین مطابق عیسائیت کو نیا روپ اختیار کرنے دیتا۔ یہ مؤخر الذّکر راہ ایسی تھی

کہ ان سرزمینوں اور علاقوں کے لوگوں کے لئے اس پیغام کی حامل تھی کہ مسیحیت ان کی روایتی داستانوں اور دیومالائی قصوں سے چنداں مختلف نہیں ہے۔ پولوس کو دوسرا طریق کار زیادہ مفید اور آسان نظر آیا چنانچہ اس نے عیسائیت کو ایسے روپ میں ڈھالنے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا جو ان آرزوؤں، تمناؤں اور فلسفیانہ خیالات سے پوری مناسبت رکھتا ہو جو اس زمانہ کی غیر یہودی دنیا میں عام پھیلے ہوئے تھے اور لوگوں پر اثرانداز ہو رہے تھے۔

پولوس کی یہ "حکمت عملی" اس لحاظ سے بہت کامیاب رہی کہ اس کے نتیجہ میں اس نئے مذہب میں لوگوں نے بڑی تعداد میں شامل ہونا شروع کر دیا۔ بصورت دیگر ان کے لئے اس نئے مذہب کو قبول کرنا اتنا آسان نہ ہوتا۔ اپنی اس پالیسی سے پولوس نے لوگوں کے لئے اس نئے مذہب میں دھڑادھڑ داخل ہونے کی راہ ہموار کر دکھائی۔ مگر راہ ہموار کر دکھائی کس قیمت پر؟ بدقسمتی یہ ہے کہ اس طرزِ عمل کے نتیجہ میں مقابلہ آپڑا ایک طرف پاکیزگی کی آئینہ دار مسیحی اقدار اور دوسری طرف ملحدانہ قصوں اور زمین و آسمان کے قلابے ملانے والی داستانوں کے مابین۔ تبدیلی پولوس نے صرف یہ کی کہ ملحدوں کے خداؤں کو مسیح "باپ خدا" اور روح القدس کے نام دے ڈالے۔ اس نے ان پرانے خداؤں کی بجائے ان نئے ناموں والے خداؤں کو لوگوں سے متعارف کرا دیا۔ فی الحقیقت یہ پولوس نہیں تھا جس نے تثلیث کی دیومالائی کہانی خود اپنے دماغ سے اختراع کی اور اسے ملحدوں کی دنیا میں عیسائیت کے نام سے رواج دیا۔ برخلاف اس کے اس نے یہ کیا کہ تثلیث کی دیوملائی کہانی ملحدوں کے علم الاصنام سے مستعار لے کر اور اسے مسیحیت پر چسپاں کر کے اس کا حلیہ بدل ڈالا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اور ہوتا چلا گیا وہ یہ تھا کہ الحاد تو علی حالہٖ قائم رہا البتہ وہ نئے ناموں اور نئے چہروں کے ساتھ پنپتا رہا اور پھر پنپتا ہی چلا گیا۔

اس لحاظ سے سے اگر دیکھا جائے تو پولوسی مسیحیت دنیائے الحاد کے ملحدانہ عقائد اور دیوملائی داستانوں کو بدلنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اس ناکامی سے دوچار ہونے پر اس نے الٹا یہ کیا کہ انجام کار خود مسیحیت کو ان کے مطابق بدل کر رکھ دیا۔ اگر آواز دینے پر پہاڑ حرکت میں آکر اس کے پاس نہ آیا تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود چل کر پہاڑ تک جا پہنچے۔ مراد یہ ہے کہ جب مسیحیت کے مطابق دوسروں کو بدلنے میں کامیاب نہ ہو سکا تو خود کو بدل ڈالا اور اپنے ساتھ مسیحیت کو بھی بدل کر رکھ دیا۔

مسیح کی اصل حقیقت

پولوس کے منظر عام پر آنے اور اس کے مغربی سرزمینوں میں مسیحیت کا پرچار کرنے کے بعد مسیحیت واضح طور پر دو حصوں میں منقسم ہوگئی تھی۔ ایک تو تھی پولوسی مسیحیت اور دوسری تھی وہ اصل مسیحیت جس پر جیمز دی رائیٹیٹس اور اس وقت کے دوسرے عیسائی لیڈر (جو مسیح کے شاگرد بھی تھے) ایمان رکھتے تھے۔ بلاشبہ ہر ایک کو یہ حق حاصل ہے کہ ان دونوں کے مسیحی مسلکوں میں سے جس کے مسلک کو چاہے اختیار کرے لیکن ہم یہاں یہ بات بطور خاص واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ان میں سے جو اصل مسیحیت تھی وہ وحدانیت کے خطوط پر ہی پنپتی رہی اور اس نے اپنے آپ کو ان جدت طرازیوں سے الگ تھلگ اور پاک رکھا جو آگے چل کر مسیحی ایمانیات میں بے سروپا باتوں اور عجیب در عجیب گنجلکوں کا اضافہ کرنے کا موجب ہوئیں۔ ایسی بے سروپا باتوں میں بیٹے کی حیثیت سے مسیح کی اپنی الوہیت، تثلیث، موروثی گناہ، کفارہ، نجات اور جسمانی طور پر مسیح کے دوبارہ جی اٹھنے کے عجیب وغریب مسائل شامل ہیں۔ کلیسیا کے ابتدائی لیڈروں کے مذہبی نظریات (جنمیں جیمز دی رائیٹیٹس کو نمایاں حیثیت حاصل ہے) بہت سہل اور عام فہم تھے اور ان تضادات کی گنجلکوں سے پاک تھے جو پراسرار دھند اور دھوئیں کی تہہ کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ کلیسیا میں خدائے واحد پر ایمان رکھنے والے مسلک کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت ثابت ہوئے بغیر نہیں رہتی کہ تثلیث کے نعرہ سے یکسر مبرّا توحید خالص کا عقیدہ سرکاری سطح پر اس وقت کے حقیقی کلیسیا کا طُرّۂ امتیاز بنا رہا۔

ہم واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس مختصر مقالہ کا مقصد یہ نہیں ہے کہ عیسائیوں کو خود مسیح کے اپنے عقیدہ سے منحرف کر کے انہیں کسی اور عقیدہ کا معترف بنایا جائے۔ اس مقالہ کی حیثیت محض ایک پرخلوص کوشش کی ہے اور وہ کوشش یہ ہے کہ مسیحی بھائیوں کو اس خالص مذہب اور طریق عمل کی طرف دعوت دی جائے جو مسیح کا اپنا مذہب اور طریق عمل تھا۔ کلیتہً اخلاص پر مبنی ہماری یہ دردمندانہ کوشش ہے کہ مسیحی بھائیوں کی توجہ قصے کہانیوں سے ہٹا کر ان کا رخ پھر عیسائیت کے اصل حقائق کی طرف پھیر دیا جائے۔ یہ حقائق صاف ستھری اور نکھری ہوئی اصلیت کے آئینہ دار ہونے کے باعث اتنے حسین ہیں کہ ان سے آگاہ ہو کر قلوب واذہان کو عجب تسکین وطمانیت کا احساس ہوتا ہے۔

یہ مسیح کی حقیقت کے گرد دو ہزار سالہ قصے کہانیوں کے بنے ہوئے جال کی بدولت نہیں ہے کہ جس

نے مسیحیت کے وجود کو مجتمع حالت میں بر قرار رکھا ہوا ہے اور نہ ان قصے کہانیوں نے اسے عقل اور سائنس کی بڑھتی ہوئی علمی روشنی کے نت نئے چیلنجوں سے بچانے میں اس کی مدد کی ہے اور نہ ہی عجیب و غریب دھندلکوں میں لپٹے ہوئے تثلیث کے عقیدہ نے اسے باقی رکھنے میں کوئی کردار ادا کیا ہے۔ جو چیز مسیحیت میں پوشیدہ صداقت اور اس کی روح کو بر قرار رکھنے کا موجب ہوئی ہے وہ ہے خود یسوع مسیح کی شخصیت کی دلآویزی اور اس کی حقیقی تعلیم کا باطنی حسن۔ یہ بعد میں گھڑی جانے والی مصنوعی اُلوہیت کی آئینہ دار شخصیت نہیں بلکہ یہ انسان مسیح کے حسین اور مقدس و مطہر عمل و کردار کی کشش ہے جو اس کے ساتھ دلوں کی وابستگی کا موجب ہوئی ہے۔ نیک مقاصد اور مقدس اُصولوں کی خاطر دکھ اٹھانا اس راہ میں صبر کا اعلیٰ نمونہ پیش کرنا غیر متزلزل عزم و استقلال کا مظاہرہ کرنا اور اصولوں پر سودا بازی نہ کرنے میں تمام آمرانہ اور ظالمانہ کوششوں کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہ دینا مسیح کے یہ وہ اعلیٰ و ارفع اوصاف ہیں جنہوں نے مسیحیت کے وجود کے حق میں ریڑھ کی ہڈی کا کام کیا اور جو اس کی پشت پناہ بن کر اسے قائم و بر قرار رکھنے کا موجب ہوئے۔ یہ اوصاف آج بھی اسی طرح حسین اور دلکش ہیں جس طرح کہ پہلے تھے۔ ان اوصاف نے عیسائیوں کے قلوب و اذہان کو اس قوت سے متاثر کیا کہ وہ آج بھی مسیح کے دامن سے وابستہ چلے آرہے ہیں۔ وہ عقائد کی بحثوں میں منطقی استدلال کی واضح خامیوں سے صرف نظر کر سکتے ہیں لیکن مسیح سے تعلق توڑنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے۔

مسیح کی اصل عظمت کا راز اس حقیقت میں پنہاں ہے کہ اس نے تاریکی کی زبردست قوتوں کو جنہوں نے اسے ختم کرنے کی سازش کی تھی اور جو اسے کالعدم کرنے پر تُلی ہوئی تھیں انہیں محض اور محض ایک انسان ہوتے ہوئے نہ صرف زیر کیا بلکہ ان پر زبردست فتح حاصل کی۔ مسیح کی یہ عظیم الشان فتح اس قابل ہے کہ اولاد آدم اس پر فخر کرے اور اس میں اپنے آپ کو شریک سمجھے۔ جب ہم اس تمام صورت حال پر وسیع تر اسلامی نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالتے ہیں تو مسیح اولاد آدم کے بہت قابل احترام وجودوں میں سے ایک نظر آتا ہے جس نے اپنے عملی نمونہ سے مصائب و شدائد کا نہایت پامردی اور ہمت و استقلال سے مقابلہ کرنے کا درس دیا۔ آزمائشوں اور ابتلاؤں میں گھرے ہوئے ہونے کے باوجود ہمت نہ ہارنا اور حق و صداقت پر مبنی اپنے مؤقف پر ڈٹے رہنا اور پائے استقلال میں ذرا بھی لغزش نہ آنے دینا وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جو مسیح نے انجام دے کر اپنے رنگ میں دنیا کے سامنے ایک مثال قائم کر دکھائی۔ یہ اس کی دکھوں بھری زندگی ہی

تھی جو انسانیت کو چار چاند لگانے کا موجب بنی اور جس نے اسے موت پر فتح بخش کر کامیابی کے ساتھ جینے اور مقصد حاصل کرنے کا ڈھنگ سکھایا۔ اگر وہ مقصد حیات کو فراموش کر کے رضاکارانہ طور پر مرنا قبول کر لیتا تو ایسا فعل مصائب و شدائد سے فرار کے مترادف ہوتا۔ کوئی اسے کس طرح بہادری اور شجاعت کے اقدام سے تعبیر کرتا۔ کیا جو لوگ نامساعد و پر مصائب حالات کے دباؤ کو برداشت نہ کرتے ہوئے خودکشی کے مرتکب ہوتے ہیں ان کے اس فعل کو بزدلی قرار نہیں دیا جاتا؟ زندہ رہ کر مصائب و شدائد کی چکی میں پسنے کو ترجیح دینا اور حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا، مصائب سے چھٹکارے کی خاطر موت کو گلے لگانے اور زندگی کی بازی ہارنے سے بدرجہا افضل ہوا کرتا ہے۔ اس لحاظ سے انسانیت کے گناہوں کی خاطر موت قبول کرنے کی شکل میں مسیح کی بظاہر عظیم قربانی کا انسانیت کے گناہوں کی خاطر موت قبول کرنے کی شکل میں مسیح کی بظاہر عظیم قربانی کا تصور کھوکھلی اور بے وزن جذباتیت سے زیادہ اپنے اندر کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

ہم پھر باصرار و بہ تکرار اس بات پر زور دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ مسیح کی عظمت اس امر میں پوشیدہ ہے کہ اس نے صرف ایک بار قربانی پیش کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ زندگی بھر مسلسل عظیم قربانی دیتا چلا گیا۔ زندگی بھر اس نے اس ترغیب و تحریص کا بڑی پامردی اور بے جگری سے مقابلہ کیا کہ وہ دکھوں اور مسلسل پہنچنے والی تکلیفوں سے جان چھڑا کر سکھ چین اور آرام کی زندگی بسر کرے۔ ہر دن جو چڑھتا تھا اور ہر رات جو گزرتی تھی اسے موت درپیش ہوتی تھی کہ وہ اس کی آغوش میں جاکر دکھوں سے نجات حاصل کرے۔ لیکن اس نے بزدلی نہیں دکھائی بلکہ مصائب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ زندہ رہا اور زندہ رہتا چلا گیا تاکہ جان جوکھوں میں ڈال کر گناہگاروں کو گناہوں سے پاک کرے اور اس طرح انہیں روحانی حیات سے ہمکنار کرتا چلا جائے۔ اس نے اپنے آپ کو موت کے حوالہ کرنے سے انکار کر کے اور اس کے آگے جھکنے اور گھٹنے ٹیکنے سے منہ موڑ کر موت پر فتح پائی۔ اس نے لوگوں کو گناہوں کے ذریعہ ہلاک کرنے والی موت کو چاروں طرف سے گھیر کر اسے چاروں شانوں چت کر دکھایا اور اس طرح اس کے شکنجے سے بہتوں کو نکالنے میں کامیاب رہا۔ اس سے کم ہمت کوئی اور ہوتا تو دوسروں کو بچانا تو کجا خود تباہ ہوئے بغیر نہ رہتا۔ اس طرح اس نے اپنی صداقت کو آشکار کر دکھایا اور اپنے وعدے کو پورا کر کے چھوڑا۔ یہی تو اس کی وہ خوبی ہے جس کی وجہ سے ہم اس کی عزت کرتے ہیں اور اس سے اس قدر محبت رکھتے ہیں۔ وہ اپنی مرضی اور اپنی خواہش سے نہیں بولتا تھا بلکہ خدا کے کہے سے بولتا تھا اسی لئے اس کی آواز خدا کی آواز تھی۔ اس نے وہی کچھ کہا جس کے کہنے پر وہ مامور کیا گیا تھا۔ اس میں کمی بیشی کیے بغیر بعینہٖ وہی اس نے کہہ دکھایا اور پھر

اسے پورا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ زندگی بھر اس نے صرف اور صرف خدا کی عبادت کی اور کسی فانی انسان سے اس نے کبھی یہ نہیں کہا کہ وہ اس کے اپنے آگے یا اس کی ماں کے آگے یا روح القدس کے آگے جھکے اور ان کی عبادت کرے۔ یہ ہے مسیح کی اصل حقیقت جس کی طرف ہم تمام فرقوں اور گوناگوں عقیدوں کی طرف منسوب ہونے والے مسیحیوں کو واپس لوٹنے کی دعوت دیتے ہیں۔

مذہب کا تسلسل

ہم مذہب کے تسلسل اور اس کی آفاقیت پر ایمان رکھتے ہیں اور مذہب کی اس آفاقیت کی وجہ سے ہی ہم مقام نبوت کو ایک آفاق گیر مظہر حقیقت یقین کرتے ہوئے اس کی اہمیت پر بہت زور دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے نزدیک خدا کی طرف سے مبعوث ہونے والے تمام نبیوں کو تسلیم کرنا اور ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔ زمرۂ انبیاء میں سے کسی ایک نبی کا انکار جملہ انبیاء کے انکار کے مترادف ہوتا ہے۔ درحقیقت انسان نبیوں کے آگے سر تسلیم و اطاعت اس لئے خم کرتا ہے کہ وہ سب ایک ہی خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ صرف اور صرف اس کی عبادت کی طرف نوع انسانی کو بلاتے ہیں۔ اس سیاق و سباق میں ''تسلسل'' کے لفظ کو بایں معنی سمجھنا چاہیے کہ جیسا کہ دو چیزوں میں ایک جیسی کیفیت اور بنیادی نوعیت کی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ مذہب کے اس تسلسل سے زندگی یعنی حیات میں پائی جانے والی ارتقائی کیفیت ہرگز مراد نہیں ہے۔ ہم تمام شعبوں میں انسانی جدوجہد کی عمومی ترقی کے مطابق قدم بہ قدم ملنے والے پیغام کی ترقی پذیر کیفیت کے قائل ہیں۔ ظاہر یہ ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے آنے والے مذاہب کی ابتدائی شکلیں اگرچہ ایک ہی نوعیت کی بنیادی تعلیمات پر مشتمل ہوتی تھیں لیکن تفصیلی ہدایات کے اعتبار سے وہ حسب حالات و حسب ضرورت نسبتاً چھوٹے دائروں پر محیط ہوتی تھیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حسب ضرورت اوامر و نواہی کی تعداد محدود ہوا کرتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ ان اوامر و نواہی کی تعداد بڑھتی چلی گئی اور یہ انسانی جہد و عمل اور جدوجہد کے وسیع تر حلقوں یا میدانوں پر محیط ہوتی چلی گئی۔ مزید برآں یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جن مذاہب کا تعلق قدیم تہذیبوں سے تھا ان کے مخاطب خاص قبیلوں یا برادریوں یا علاقوں کے لوگ ہوتے تھے۔ ان کے لائے ہوئے پیغام کی نوعیت بھی علاقے، وقت اور زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق محدود ہوتی تھی۔ اس لحاظ سے انہیں قبائلی، گروہی یا قومی مذہب قرار دیا جاسکتا ہے۔ بنی اسرائیل اور دیگر یہودیوں کو جو تعلیمات ملیں ان کا معاملہ ایک بہت مناسب اور کارآمد مثال کی

حیثیت رکھتا ہے جس سے اس کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے۔

لہٰذا مذہب کے تعلق میں تاریخی رجحان کی ترقی کو دو حلقوں کی نسبت سے مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

1۔ نازل ہونے والی تعلیموں کی درجہ بدرجہ ترقی پذیر تفصیل و توضیح اور اپنے محدود دائرہ میں نسبتی لحاظ سے ان کی مرحلہ وار تکمیل۔

2۔ تعلیم کے نسبتاً چھوٹے درجہ سے بڑے اور وسیع تر درجہ کی طرف ترقی پذیر منتقلی اور اس کا تکمیلی مرحلہ

مذہب کے تسلسل کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو مذہب آدم پر ظاہر کیا گیا تھا وہی مذہب کُرّۂ ارض پر پھیلنے والے تمام بنی نوع انسان کو مخاطب کرتا چلا گیا اور اس میں درجہ بدرجہ ترقی پذیر تبدیلی آتی چلی گئی اور اس طرح اس کے دائرۂ ہدایت اور دائرۂ خطابت میں وسعت پیدا ہوتی رہی بلکہ مذکورہ تسلسل سے مطلب یہ ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں جو تہذیبیں جڑ پکڑتی اور پنپتی رہیں وہاں الہامِ الٰہی کے نتیجہ میں ایسے مذاہب معرض وجود میں آتے رہے جو دنیا کے ان حصوں میں انسان کی معاشرتی ترقی سے ہدایت و رہنمائی کے رنگ میں مناسبت رکھتے تھے۔ ایسے تمام مذاہب حسب ضرورت جہاں جہاں بھی معرض وجود میں آئے وہ اسی انداز اور اسی سمت میں ترقی کرتے رہے۔

مذہبی ترقی کی معراج

ہمارے یقین اور ایمان کے مطابق متعدد حیثیتیں رکھنے والے ایسے ہی مذاہب میں سے ایک مذہب مشرق وسطیٰ کے علاقہ میں پرورش پا رہا اور پنپ رہا تھا۔ جو ایسے بڑے بڑے مذاہب کو معرض وجود میں لانے کا موجب بنا جنہوں نے دنیا میں مذہبی عروج و ارتقا کے حق میں بنیاد کا کام دینا تھا۔ مذہبی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ یہودیت کے بعد عیسائیت اور پھر اسلام کا یکے بعد دیگرے آنا مذہبی تعلیم کے ارتقا کی سمت کو اجاگر کیے بغیر نہیں رہتا۔ ان مذاہب کے مطالعہ سے ان کی تعلیموں میں آگے کی سمت یا پیچھے کی سمت حرکت (یعنی پیش قدمی یا پسپائی) کا بآسانی پتہ لگایا جا سکتا ہے اور ان میں پائے جانے والے باہمی ربط کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا سلسلہ وار رونما ہونے والے احوال و واقعات کے اس عظیم منصوبہ کے مالہ و ماعلیہ کو سمجھنا انتہائی ضروری ہے جس نے ان تعلیموں کو درجۂ کمال تک پہنچانے پر منتج ہونا تھا اور جو فی الحقیقت ان تعلیموں کی معراج کے طور پر ایک عالمگیر مذہب یعنی اسلام کے ظہور پر منتج ہو کر رہا۔

اس سیاق و سباق کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات یہودیوں کے اپنے حق میں ہے کہ وہ ہر قسم کے

تعصبات سے بالا ہو کر پوری سنجیدگی سے یسوع مسیح کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اسے شناخت کرنے میں ناکام رہ کر یہود کا معاملہ ان بے شمار انواع و اقسام کی نامیاتی مخلوق جیسا ہو جاتا ہے جو تاریخ ارتقا کی اتھاہ گہرائیوں میں مدفون پڑی ہیں اور اب وہ درخت حیات کے بڑھنے اور اس کے چوٹی تک پہنچنے کے ارتقائی عمل میں کوئی اہم اور نمایاں کردار ادا نہیں کر رہیں۔ اپنی اس حالت میں وہ تاریخ کے ایک بچے کھچے غیر اہم حصہ کے طور پر شمار تو ہوتی ہیں لیکن وہ اپنے وجود کے ایک بہت تنگ دائرہ میں ہی زندہ و موجود رہنے پر مجبور ہیں۔

پھر مسیحیوں کا معاملہ بھی یہودیوں کے معاملہ سے چنداں مختلف نہیں ہے۔ وہ ان سے صرف ایک قدم آگے ہیں۔ اور تاریخی و زمانی ترتیب کے لحاظ سے اسلام کے ذرا زیادہ قریب ہیں۔ بایں ہمہ یہ بات اپنی جگہ بہت اہم ہے کہ یسوع مسیح کے اصل راستہ سے منحرف ہونے کے بعد انحطاط کی طرف لے جانے والے اس راستہ پر پڑ کے جو ابتدا پولوس نے متعین کیا تھا اس راستہ نے مسیحیوں کو یہودیوں سے بھی کہیں زیادہ اسلام سے دور کر دیا۔ یہودیوں نے اپنے وجود میں آنے پر چار ہزار سال گزارنے کے باوجود اور کچھ نہ سہی کم از کم توحید کا سبق بڑی پختگی سے سیکھ لیا ہے جو کسی بھی مذہب میں روحانی زندگی کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن بعض بنیادی عقائد میں اسلام سے اس قربت کے باوجود بعض دوسرے عوامل ایسے ہیں جنہوں نے انہیں بہت بڑی تعداد میں قبول اسلام سے انکار پر مصر رہنے میں سنگ خارا بنا چھوڑا ہے۔

غور و فکر کے آئینہ دار اس مطالعہ کے نتیجہ میں میں یہ یقین کرنے پر مجبور ہوں کہ جب تک یہود اپنی افتاد طبع اور طرز فکر میں وہ تبدیلی پیدا نہیں کریں گے جس کا پیدا کرنا مسیح کی آمد اول کو سمجھنے اور شناخت کرنے کے لئے ضروری ہے وہ بعض عقائد میں مسلمانوں کے ساتھ یکسانیت کے باوجود اسلام سے مسیحیوں سے بھی زیادہ دور اور پرے رہیں گے۔ انہوں نے اپنے اور حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے درمیان تعلق یا رابطہ قائم کرنے والی نہایت اہم کڑی یسوع مسیح کو ہی اپنے ہاتھ سے گنوا دیا۔ آسمانی صداقت کے اس انکار اور صریح استرداد نے انہیں ایسا پتھر دل بنا دیا ہے کہ وہ نفسیاتی طور پر کوئی نیا پیغام قبول کرنے کی صلاحیت سے ہی بے بہرہ ہو چکے ہیں۔ مسیح آ کر جا بھی چکا ہے اور وہ ہیں کہ ہنوز مسیح کی آمد کا انتظار کیے جا رہے ہیں۔ ایک دفعہ اسے شناخت کرنے میں ناکام رہنے کے بعد اس کا بہت ہی کم امکان ہے کہ وہ اس کی آمد ثانی میں اسے شناخت کر لیں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقدر ہی یہ ہے کہ وہ خوابوں میں بسے ہوئے اپنے مسیحا کا ابد تک انتظار کرتے رہیں۔

مسیح نے ارفع تر مذہب یعنی اسلام کی پیروی کے لئے راستہ ہموار کرنا تھا۔ ہمارے اس بیان کو پتھر کی لکیر سمجھ کر اس سے غلط مطلب اخذ کرنا نہیں چاہیے۔ ہمارے کہنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ یہودی پہلے عیسائیت کو قبول کریں اور پھر اسلام کی طرف قدم بڑھائیں۔ اگر ایسا سمجھا جائے تو مذہبی صداقتیں ظاہر ہونے اور ان کے منظر عام پر آنے کے طریق سے متعلق ایسی سمجھ انتہائی سادہ لوحی کی آئینہ دار ہو گی۔ ہم جو کچھ کہنے یا بتانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک قوم جس نے ایک ایسے نبی یا پیغمبر کا انکار کر دیا جو ایک عام نبی نہیں تھا بلکہ جس نے ایک ارفع تر صداقت کے ظاہر ہونے سے پہلے اس قوم کی ذہنی اور روحانی تربیت کا اہم کام انجام دینا تھا اس کا ایسے نبی کو مسترد کر دینا اس بات کی علامت ہے کہ وہ قوم ایک گہری نفسیاتی اور روحانی بیماری میں مبتلا ہے۔ سو جب تک اس کا یہ مرض دور نہیں ہوتا اور جب تک صداقت کے بارہ میں اس کے بگڑے ہوئے رویہ اور کج روی کی آئینہ دار روش کی اصلاح نہیں ہوتی اس قوم کے بارہ میں اس امر کا امکان بہت کم ہے کہ وہ ایک ایسے نبی کی پیروی کرے جو تعلق جوڑنے والی اس کڑی کے بعد مبعوث ہوا ہے جس کڑی کو وہ پہلے ہی خود اپنے ہاتھوں گنوا بیٹھی ہے۔

جہاں تک مسیحیوں کے اپنے رجحان اور طرزِ عمل کا تعلق ہے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی صداقت تک ان کی رسائی اسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے کہ وہ مسیح کی اصل حقیقت اور صداقت کی طرف واپس لوٹیں۔ مسیح انسانوں کو خدا تک پہنچانے والا راستہ ہی نہ تھا بلکہ تمام دوسرے نبیوں کی طرح اس عظیم الشان نبی کی بھی راہ دکھانے والا تھا جس کا اس کے اپنے بعد آنا مقدّر تھا۔ مسیح کی بیان کردہ تاکستان (انگوروں کے باغ) کی تمثیل میں خود مسیح کی اپنی حیثیت ایک درمیانی کڑی تھی۔ اس کی رو سے خدا کی راہ دکھانے والے خدا کے آخری کامل نمونہ (یعنی مظہر اتم الوہیت) نے ابھی آنا تھا۔ پس جب تک عیسائی صاحبان مسیح کے جھوٹ موٹ کے خیالی اور دیومالائی تصور کو خیرباد کہہ کر اپنے روحانی آقا کی رفیع اور عظیم حقیقت کی طرف واپس نہیں آتے ان کی رسائی اس راستہ تک نہیں ہو سکتی جس راستہ پر چل کر مسیح کی محمد رسول اللہ ﷺ تک رسائی ہوئی تھی۔ محمد رسول اللہ ﷺ ایک زندہ و تابندہ حقیقت تھے کہانی یا قصہ نہیں تھے۔ اور حقیقتیں ہی دوسری حقیقتوں تک پہنچا سکتی ہیں۔ اس لئے مسیح کی کہانی نہیں بلکہ ان کی حقیقت ہی مسیحیوں کو محمد رسول اللہ ﷺ کی صداقت کو شناخت کرنے کی سعادت سے بہرہ ور کرے گی۔

باب ہشتم

مسیحیت آج کے دور میں

آج مسیحیت کو جس سب سے بڑے مسئلہ کا سامنا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ لوگوں میں صداقت کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رہی یا اس میں کمی آرہی ہے بلکہ اصل مسئلہ اسے یہ در پیش ہے کہ لوگوں میں صداقت کو قبول کرنے کی خواہش اور امنگ ہی مفقود ہوتی جارہی ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ فی زمانہ مسیحیت (اس کی حیثیت افسانوی ہو یا حقیقی) مغربی تہذیب کا جزولاینفک بنی ہوئی ہے۔ مغربی تہذیب کے نو آبادیاتی نظام کے قیام اور اس کی سامراجی فتوحات میں سب سے زیادہ عمل دخل اسی کا ہے۔ یہ ان کے سیاسی اور اقتصادی نظام کے لئے سہارے اور تائید و حمایت کا کام دے رہی ہے اور انہیں باہم اکٹھا رکھنے کی قوت مہیا کر کے انہیں ایک طاقتور اور متحدہ اکائی کی حیثیت سے قائم و برقرار رکھنے کا موجب بنی ہوئی ہے۔ مغرب کے پیچیدہ سماجی، سیاسی اور اقتصادی نظام کی تعمیر اور اس کے استحکام میں بنیادی کردار عیسائیت نے ہی ادا کیا ہے۔ مغربی تہذیب یا مغربی سامراجی نظام اور اس کے اقتصادی غلبہ کی عملی شکل وصورت اور ہیئت اجتماعی میں مسیحی عناصر سرایت کیے ہوئے ہیں۔ اپنی موجودہ حالت میں مسیحیت روحانی مقصدیت سے کہیں بڑھ کر مغرب کے مادی مفادات کا آلہ کار بننے کی طرف زیادہ مائل ہے اور اس جانب اس کے جھکاؤ میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ برخلاف اس کے ازمنۂ گزشتہ میں اس کا جھکاؤ مسیحی عقائد اور ان کی روحانی اقدار کو آگے بڑھانے کی طرف تھا اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ یہی اس کا مقصد حیات ہے۔

لیکن اگر دیکھا جائے تو تاریخی اہمیت کے اعتبار سے مسیحیت کا اصل کردار جس شکل میں ظاہر ہوا وہ یہی ہے کہ وہ فی زمانہ مغربی سامراجیت کو آگے بڑھانے کا موجب ثابت ہوئی ہے۔ مشرق کو فتح کرنے کی مہم مذہبی جذبہ و جوش کے ساتھ انجام دی گئی۔ بالخصوص وہ جنگیں جو مسلم سلطنت کے خلاف لڑی گئیں ان کا پر جوش جذبۂ محرکہ ایک ہی تھا اور وہ تھا اسلام کے خلاف مسیحی بغض و عناد اور نفرت و حقارت کے دیرینہ جذبات۔

مسیحیت اور نو آبادیاتی نظام

جب استعماری حکمرانی اور فرمانروائی نے امریکہ اور افریقہ کے پورے براعظم کو اپنے زیر نگیں کر لیا

اور وہاں کی پوری آبادی کو اس نے سر سے پاؤں تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر بے بس کر دیا تو پھر ان کے ہاتھوں اور پیروں میں اقتصادی غلامی کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈالنے میں بھلا کیا دیر لگتی تھی۔ سیاسی غلامی کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے اقتصادی غلامی بھی ان پر مسلّط کر دی گئی۔ اگر مفتوحہ علاقوں کے لوگوں کو اقتصادی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا نہ جائے تو سامراجی فتوحات بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ افریقہ میں سیاسی اور اقتصادی غلامی کے پیچھے پیچھے ان پادریوں کی آمد کا مقصد ان کے سیاسی اور اقتصادی پیش رو فاتحین کے مقصد سے بالکل متضاد نظر آتا تھا۔ انہوں نے آکر اعلان یہ کیا کہ وہ غلام بنانے کے لئے نہیں بلکہ افریقہ کی روحوں کو آزادی کی نعمت سے مالا مال کرنے آئے ہیں۔ یہ امر واقعی تعجب انگیز ہے کہ اہل افریقہ نے ان کو بظاہر نیک نظر آنے والے اس ارادہ پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ انہوں نے کلیسیا کے ان نووارد مشفق و مہربان خادمان خلق سے بصد ادب یہ کیوں نہ دریافت کیا کہ انہیں صرف اور صرف ان کی روحوں پر ہی کیوں ترس آرہا ہے؟ کیا خود انہیں نظر نہیں آرہا تھا کہ ان کے جسموں کو بڑی بے رحمی سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے؟ کیسے اندھا دھند ظالمانہ طریق پر ان کی سیاسی آزادی کو لوٹ کر انہیں بے دست و پا کر دیا گیا ہے؟ ان مشفق و مہربان اور سراپا حسن و احسان پادریوں کو ان کی جسمانی غلامی کی حالت زار پر کیوں رحم نہ آیا؟ اور ان کی ہمدردی غلام بنائے جانے والے بے بس لوگوں کی روحوں کو آزادی سے ہمکنار کرنے تک ہی کیوں محدود ہو کر رہ گئی؟

یہ امر ظاہر و باہر تھا کہ یہ صورت حال ایک واضح تضاد کی حامل تھی لیکن افسوس! یہ تضاد ان لوگوں کی نظر سے اوجھل رہا جو ان مسیحی منصوبوں اور سازشوں کا شکار ہوتے چلے گئے۔ آج بھی افریقہ اتنا ہی بھولا اور سادہ لوح ہے جتنا آج سے دو سو سال پہلے تھا۔ اہل افریقہ ابھی تک اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ایک نئے قسم کے نو آبادیاتی نظام کے بظاہر دور از کار لیکن اپنے قابو میں لانے اور زیر تسلط رکھنے کے خفیہ اور پُراَسرار طریق کار کے ذریعہ ان کی اقتصادی غلامی کو دوامی حیثیت دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔ وہ ابھی تک اس احساس سے عاری ہیں کہ انہیں مغرب کے زیر نگیں اور مغلوب رکھنے کا ایک ذریعہ مسیحیت بھی ہے۔ یہ ذریعہ ایک ایسی افیون آمیز دوا کی حیثیت رکھتا ہے جس نے لوریاں دے دے کر اور گہری نیند سلا کر ان پر خود فراموشی کی کیفیت طاری کر دی ہے۔ مسیحیت اگر وہ دیکھیں اور غور کریں، ان کے اپنے اندر یہ جھوٹا احساس پیدا کرنے کا ذریعہ ہے کہ وہ اپنے حاکموں کے ساتھ کسی نہ کسی حد تک برابری کی سطح پر آکر ان

جیسے ہی بن گئے ہیں۔ کہنے کو اس میں اپنائیت کا جذبہ مضمر ہے لیکن سوچنے والی بات یہ ہے کہ یہ اپنائیت ہے کس نوعیت کی؟ اپنائیت کے اس جذبہ نے انہیں نہایت مہنگے مغربی انداز زیست کی نقل کرنے کی ترغیب دلائی ہے۔ اگر اس کو ایک اور نقطۂ نگاہ سے دیکھیں تو کہا جاسکتا ہے کہ درخت اب بھی اجنبی زمینوں میں ہی لگے ہوئے ہیں لیکن ان کے پھل سمندر پار سرزمینوں میں پہنچا کر وہاں کے لوگوں کو ان کے مزے اور ذائقہ کا نشہ کے رنگ میں چسکا لگا دیا گیا ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے اس امر کی کہ تیسری دنیا پر مغربی سامراج کا اقتصادی غلبہ برقرار رکھنے کے لئے عیسائیت ہمیشہ میٹھی چھری کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہے۔

خود مغرب میں ایک عام آدمی اس امر کا کوئی لحاظ کیے بغیر کہ وہ مسیحی عقائد کی پیچیدگیوں اور الجھنوں کو سمجھتا ہے یا نہیں وہ مسیحیت کو اپنی ثقافت اور اپنی تہذیب کا ایک لازمی جزو سمجھتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مسیحی اقدار جہاں کہیں بھی پائی جاتی ہیں ان کی اصل جڑ دیومالائی کہانیوں پر مبنی مخصوص نوعیت کے عقائد میں پیوست نہیں ہے اس کی بجائے ان کا تمام تر انحصار کرم نوازی، ہمدردی، دکھی انسانیت کی خدمت اور اسی طرح کی دوسری مسلمہ اقدار کو اہمیت دینے پر ہے۔ یہ عام انسانی اقدار ہیں اور ان کی اہمیت بین الاقوامی طور پر مسلم ہے۔ کلیسیا کی طرف سے منظم طور پر کئے جانے والے زبردست پراپیگنڈہ کی وجہ سے یہ اقدار مسیحیت کے مترادف سمجھی جانے لگی ہیں۔ ہر چند کہ یہ دنیا کے تمام مذاہب کی مشترکہ اقدار ہیں اور ہر مذہب میں ان اقدار کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے اور یہ خدا کی طرف سے اس لئے مقرر کی گئی ہیں کہ تمام بنی نوع انسان انہیں اپنائیں اور ان پر عمل پیرا ہوں تاہم بڑی ہوشیاری اور سمجھ داری سے عیسائی بہت منظم پراپیگنڈے کے ذریعہ مسلسل اس امر پر زور دیتے چلے آرہے ہیں کہ یہ اقدار صرف مسیحیت کا خاصہ ہیں اور وہ لوگوں کو اس کا قائل کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوگئے ہیں۔ ہمدردی، مہربانی، خدا ترسی اور شرافت کا رویہ رسیلی نغمگی کی طرح دوسروں کو سحر زدہ کرنے کا موجب بنتا ہے۔ ان اقدار پر زور دینے کا یہ رومانوی انداز ہی ہے جو لوگوں کو زیادہ تر مسیحی مذہب کی طرف کھینچتا ہے۔ اس کے پہلو بہ پہلو اس رومانویت سے ماورا مغربی انداز زیست کی کشش، اہل مغرب کی سیاسی اور اقتصادی برتری نیز باقی دنیا کو اپنے زیر نگیں لانے کی روش یہ ساری باتیں بھی اپنا تاثر دکھا رہی ہوتی ہیں اور مسیحی منادا نہیں مسیحیت کو تقویت پہنچانے میں استعمال کر رہے ہوتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسیحی عقائد کے تضادات جو ان کے دینی مزاج میں رچ بس گئے ہیں کسی نہ کسی

طور پر ان کے عام دنیوی طرزِ عمل میں بھی راہ پاتے اور منتقل ہوتے رہے ہیں۔ اسی لئے مہربانی، عاجزی، رواداری، قربانی و ایثار اور اسی طرح کے دوسرے نیک الفاظ کی زبانی اور عملی بازگشت کے پہلو بہ پہلو ظلم و زیادتی، دھونس و دھاندلی، انتہائی ناانصافی اور دنیا کی نہتی و کمزور قوموں کو بڑے پیمانہ پر اپنے زیر نگیں لانے کا ناروا سلسلہ بھی جاری ہے۔ بالعموم قانون کی حکمرانی، عدل پروری، باہمی تعلقات میں صاف ستھری روش، اور حسن سلوک کو سکہ رائج الوقت کی طرح صرف مغربی معاشروں میں اندرونی طور پر ہی روا رکھا جاتا ہے برخلاف اس کے بین الاقوامی تعلقات کے شعبہ میں ان مسلمہ اوصاف و اقدار کو احمقانہ، گھسی پٹی اور ناقابل عمل روش تصور کرتے ہوئے چنداں اہمیت نہیں دی جاتی بلکہ انہیں عمداً پامال کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا۔ سیاست، حکمت عملی، سفارت کاری اور اقتصادی روابط میں عدل و انصاف اور مساوات کی نہیں بلکہ صرف اپنے قومی مفادات کی پاسداری اور حکمرانی چلتی ہے۔ انسانی اقدار کو (جنہیں مسیحی اقدار کا نام دے کر کچھ کم فخر و مباہات کا اظہار نہیں کیا جاتا) مغربی سیاست اور اقتصادیات کے دائروں کی طرف آنے اور ان میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اس زمانہ کے دور جدید کا یہ سب سے زیادہ المناک تضاد ہے۔

جب تعریفوں کے پل باندھ کر مسیحیت کو متعارف کرانا ہوتا ہے تو اسے بڑے فخر سے دلکش مغربی تہذیب و ثقافت کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے اور اس طرح مشرقی دنیا کو تفکرات سے مبرا پر آزمائش اور آزاد زندگی کے سبز باغ دکھا کر ان کو دعوت دی جاتی ہے اور اس کا مشرق کے زوال پذیر معاشروں کے بالعموم غیر لچکدار قواعد و ضوابط سے مقابلہ کر کے مسیحیت کی برتری کے گیت گائے جاتے ہیں۔ تیسری دنیا کے نیم خواندہ عوام جو نام نہاد آزادی کے اس پیغام کی اصل حقیقت سے ناواقف ہوتے ہیں انہیں اس میں بڑی کشش محسوس ہوتی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ سمجھتے ہیں کہ عیسائیت کی شکل میں مذہب سے وابستگی بھی برقرار رہ سکتی ہے اور ترقی یافتہ دنیا کے ساتھ اپنائیت کا نفسیاتی فائدہ بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسیحیت اس حربہ کے ذریعہ کچلے ہوئے طبقوں اور ظلم و دباؤ کا شکار اچھوت قسم کے لوگوں کو جو اپنے معاشروں کے انتہائی نچلے طبقوں میں شمار ہوتے ہیں بڑی تعداد میں اپنی طرف مائل کرنے اور انہیں اپنا حلقہ بگوش بنانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ مسیحی عقائد اور ان کی نامعقول پیچیدگیوں کو سمجھنا ایسے لوگوں کی استعداد سے بالا ہوتا ہے۔ مسیحیوں کا یہ حربہ انہیں ان کے سماجی مرتبہ کو بلند کرنے کے خواب دکھاتا ہے جو

کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوتے۔

مندرجہ بالا تصریح سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ہم جس مسیحیت کی بات کر رہے ہیں وہ یسوع مسیح کی سکھائی ہوئی مسیحیت سے کس قدر مختلف ہے۔ مغربی ثقافت کو مسیحیت سمجھنا یا قرار دینا بالبداہت غلط ہے۔ مروّجہ مسیحیت اور اس کے مختلف شعبوں کو مسیح کی طرف منسوب کرنا اس کی کھلی کھلی توہین کے مترادف ہے۔ یقیناً ہر قاعدہ قانون میں استثنا کی گنجائش ہوتی ہے۔ انسانوں کے کسی بڑے گروپ یا سوسائٹی پر کسی وضاحتی بیان کو اس کی پوری تفاصیل کے ساتھ چسپاں کرنا ممکن نہیں ہوا کرتا۔ بلاشبہ دنیائے عیسائیت میں زندگی اور امید کے حامل انفرادی نوعیت کے بعض چھوٹے چھوٹے جزیرے بھی ملتے ہیں جہاں مسیحیت محبت اور قربانی وایثار کے اصولوں پر فی الحقیقت عمل کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ وہ ننھے منھے جزیرے ہیں جن کے گرد بے دینی، بے عملی اور بدقماشی کے سمندر ٹھاٹھیں مار رہے ہیں اور وہ آہستہ آہستہ ان کے کناروں میں کٹاؤ ڈال ڈال کر انہیں اپنے اندر ہڑپ کرتے جا رہے ہیں۔ اگر دنیائے عیسائیت میں کہیں کہیں ایک دوسرے سے بہت دور فاصلہ پر واقع ہیروں جیسی چمک دکھانے والے یہ چھوٹے چھوٹے جزیرے بھی (جن میں مسیحیت پر اس کی اصل روح کے ساتھ عمل کیا جاتا ہے) نہ ہوں تو مغرب کا افق مکمل تاریکی کی لپیٹ میں آ جائے۔ اس رہی سہی اور بچی کھچی مسیحیت کے بغیر مغربی تہذیب میں فی ذاتہ روشنی کی کوئی رمق بھی موجود نہیں ہے۔ لیکن افسوس! اب یہ مدھم روشنی بھی مدھم تر بلکہ معدوم ہوتی جا رہی ہے۔

دنیائے عیسائیت کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ مسیح کی اصل حقیقت کی طرف واپس لوٹے اور وہ اپنی بکھرنے اور تتّر بتّر ہونے والی شناخت اور باطنی منافقت سے پیچھا چھڑانے اور اس طرح روحانی طور پر شفایاب ہونے کی کوشش کرے۔ دیومالائی قصے کہانیوں اور ماورائی داستانوں کی خیالی دنیا میں زندگی بسر کرنا اور کرتے چلے جانا مہیب خطرات میں گھرتے چلے جانے کے مترادف ہے۔ ہماری اس کوشش اور کاوش کا مقصد یہی ہے کہ ہم دنیائے عیسائیت کو ان حقیقی خطرات سے آگاہ کریں جو عقیدہ اور عمل کے مابین پائی جانے والی خلیج کے وسیع اور وسیع تر ہوتے چلے جانے کی وجہ سے مسلسل بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ دیومالائی کہانیاں اس وقت تک ہی حسین لگتی ہیں جب تک وہ معاشرہ کے نچلے طبقوں کو مذہبی پیشوائیت کے نظام کے تابع رکھنے میں ممد ثابت ہو رہی ہوتی ہیں۔ انہیں قابو میں رکھنے والا یہ نظام ان کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر انہیں سحر آفریں، سراسر غیر حقیقی روحانیت کے نشہ میں مدہوش بنائے رکھتا ہے۔ لیکن جب ناگزیر حالات کے پیش نظر یہ مرحلہ آتا ہے کہ حقیقی عقائد روحانی مردوں کو زندہ کرنے میں پھر اہم کردار ادا کریں اور

تیزی سے گرتی ہوئی اخلاقی اقدار کو پھر بحالی سے ہمکنار کریں تو پھر دیو مالائی کہانیاں کسی کام نہیں آیا کرتیں۔ ان کی حیثیت خیالی پلاؤ یا سہانے سپنوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ایسے خیالی پلاؤ اور سہانے سپنے انسانی معاملات میں کبھی کوئی معنی خیز کردار ادا نہیں کرسکتے۔ بالآخر ایک وقت آتا ہے کہ جب ان سے جان چھڑائے بغیر چارہ نہیں رہتا۔

مسیح کی بعثت ثانی

اب ہم ایک ایسے مرحلہ پر پہنچ چکے ہیں کہ جائزہ کے طور پر یہ بتا اور دکھا سکیں کہ ہم نے اب تک تبصرہ اور تجزیہ کے رنگ میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ عملی اعتبار سے کس حد تک موزوں، بر محل اور بروقت ہیں۔ اس زمانہ میں انسانیت کی بقا کے اہم معاملہ کا یسوع مسیح کی شخصیت سے بہت گہرا تعلق ہے۔ اس لئے اس امر کو بے انتہا اہمیت حاصل ہے کہ ہم مسیح کی شخصیت کی اصل حقیقت کو پہچانیں۔ وہ کیا تھا اور جب پہلی بار وہ آیا تھا تو اس نے یہودیت کے بگڑے ہوئے اور انحطاط پذیر معاشرہ میں کیا کردار ادا کیا؟ اب آخری زمانہ میں اس کے دوبارہ آنے کے وعدہ کو کس قدر سنجیدگی سے لینا اور اسے اہمیت دینا ضروری ہے؟ یہ وہ بنیادی سوالات ہیں جن پر غور کر کے صحیح نتائج تک پہنچنا بہت ضروری ہے۔

بالفرض اگر یسوع مسیح کی شخصیت حقیقی نہیں تھی بلکہ وہ تھی ہی انسانی تخیل کی پیداوار تو پھر اس کی آمد ثانی کو تصور میں لانا ہی ممکن نہیں رہتا۔ اس امر کا تذکرہ ہم نے اس لئے کیا ہے کہ مسیح خواب و خیال کی پیداوار نہ تھا۔ وہ ایک حقیقی انسان تھا۔ انسان ہونے کے ناطے وہ اپنی آمد ثانی کے زمانہ میں بھی ایک انسانی بچہ کے طور پر ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ نہ یہ کہ کسی بھوت پریت یا ماورائی مخلوق کے طور پر ظاہر ہو محض خواب و خیال میں بسی ہوئی ہستیاں انسانی زندگی اور اس کے حقائق کا روپ کبھی نہیں دھارا کرتیں۔ جو لوگ خواب و خیال اور قصے کہانیوں کی دنیا میں جی رہے ہوتے ہیں ان کے لئے ممکن نہیں ہوتا کہ جب ان کے درمیان کوئی نجات دہندہ مبعوث ہو تو وہ اسے شناخت کرلیں۔

اگر عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق یسوع واقعی خدا کا بیٹا تھا تو پھر اس کی آمدِ ثانی کے بارہ میں یہی سمجھا جائے گا کہ وہ بڑی شان اور جاہ و جلال کے ساتھ اپنے فرشتوں کے جلو میں ان پر ہاتھ رکھے واپس آئے گا۔ لیکن اگر یہ محض ایک رومانوی خیال آفرینی اور تصور کا نیرنگ کمال ہے تو ایسی صورت میں بڑی شان اور جاہ و جلال کے ساتھ واپس آنے کا واقعہ کبھی پیش نہیں آئے گا۔ دنیا اس انوکھے واقعہ کو رونما ہوتے ہوئے کبھی نہ

دیکھے گی۔ خدا انسان کے روپ میں اس شان سے اتر رہا ہے کہ فرشتوں کے ایک جمِ غفیر نے اسے سہارا دیا ہوا اور ساتھ کے ساتھ وہ اس کی حمد کے ترانے بھی گا رہے ہیں۔

یہ پورا تصور ہی ایسا ہے کہ انسانی عقل و دانش اور منطق نیز انسانی ضمیر ان میں سے ہر ایک اس سے کراہت محسوس کرتا اور اسے دھتکار دیتا ہے۔ یہ پریوں کی کہانیوں کی طرح سراسر لایعنی ایک ایسی کہانی ہے جو انسانی استعدادوں اور صلاحیتوں کو تھپک تھپک کر سلا دینے کے لئے پہلے شاید ہی کبھی گھڑی گئی ہو۔ برخلاف اس کے اگر یسوع مسیح کی حیثیت اور مقام کے متعلق فہم وادراک پر پورے اترنے والے جماعت احمدیہ کے نظریہ اور عقیدہ کو تسلیم کر لیا جائے تو سہانے خوابوں کی پوری تخیلاتی صورت حال حقیقت کے آئینہ دار ایک ایسے منظر نامہ میں بدل جاتی ہے جو نہ صرف انسانی فہم کے لئے قابل قبول ہے بلکہ وہ جسے نوع انسانی کو پوری تاریخ کی زبردست تائید و حمایت حاصل ہے ایسی صورت میں ہم ایک ایسے نجات دہندہ کے منتظر ہوں گے جو بعثت اولیٰ کے مسیح سے ہرگز مختلف نہیں ہوگا۔ ہم ایک ایسے عاجز انسان کے مبعوث ہونے کی توقع کر رہے ہوں گے جو بعثتِ اولیٰ کے مسیح کی طرح عام انسانوں کے مانند پیدا ہوا ہوگا اور جو اپنی اصلاحی مہم کا اسی انداز سے آغاز کرے گا جیسے کہ پہلے مسیح نے کیا تھا۔ وہ مذہباً انہی لوگوں میں سے ہوگا جو اپنے اعمال و کردار اور حال احوال کی رو سے یہودیہ (Judea) کے یہودی باشندوں سے مماثلت رکھتے ہوں گے اور وہ لوگ اس کے موعود مصلح ہونے کے دعویٰ کو جھٹلا کر نہ صرف اس سے لاتعلقی کا اعلان کریں گے بلکہ اسے اور اس کے مشن کو ملیامیٹ کرنے کے لیے وہ سب حربے استعمال کریں گے جنہیں استعمال کرنا ان کے بس میں ہوگا۔ دوسری بار آنے والا مسیح وہ پوری زندگی دوبارہ بسر کرے گا جو پہلی بار آنے والے نے اس سرزمین پر بسر کی تھی اور اس کے ساتھ بھی پہلے جیسا ہی نفرت بھرا، اہانت آمیز اور کبر و غرور کا آئینہ دار سلوک کیا جائے گا۔ وہ اپنے لوگوں کے ہاتھوں دکھ نہیں آٹھائے گا بلکہ ایسی ہی معاند طاقتوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے گا جنہوں نے بعثت اولیٰ کے وقت پہلے مسیح کی مخالفت کی تھی اور اسے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنایا تھا۔ وہ نیا آنے والا اس عظیم بیرونی حکمران طاقت کے ہاتھوں بھی دکھوں میں مبتلا کیا جائے گا جس کے زیر تسلط وہ محکوم لوگوں میں پیدا ہوا ہوگا۔

بیسویں صدی کے اوائل زمانہ کے ایک ممتاز روسی صحافی پی۔ڈی۔ آؤں پنسکی (P.D. Ouspensky) نے مسیح کی آمد ثانی کے موضوع پر لکھتے ہوئے اپنی کتاب میں اس جیسے ہی نظریہ کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

”یہ کسی لحاظ سے بھی کوئی نیا نظریہ نہیں ہے کہ اگر بعد میں آنے والے کسی زمانہ میں پیدا ہوا تو نہ صرف یہ کہ وہ اس وقت کے مسیحی کلیسیا کا سربراہ نہیں بن سکے گا بلکہ اغلباً اس کا مسیحی کلیسیا سے کوئی تعلق یا واسطہ ہی نہ ہو گا۔ ہو گا یہ کہ کلیسیا کے بہت ہی پر شکوہ اور قوت و اقتدار کے دور میں اس نووارد مدعی مسیحیت کے ملحد ہونے کا اعلان کر دیا جائے گا اور اسے تعذیبی ستون یا کھمبے سے باندھ کر نذر آتش کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی جائے گی۔ خود ہمارے انتہائی روشن خیال زمانہ میں کلیسیا نے اپنے مخالف مسیح کے خدوخال اور خصائص کو اگر ترک کیا بھی ہے تو ظاہری لحاظ سے کیا ہے (فرق یہ پڑا ہے کہ) اب وہ انہیں چھپانے لگے ہیں۔ شاید مسیح فقیہوں اور فریسیوں کے ہاتھوں دکھ اٹھائے اور ظلم سہے بغیر (آبادیوں سے دور) صرف روسی راہب خانہ میں ہی زندگی گزار سکتا تھا۔“

(P.D. Ouspensky, 'A New Model of the Universe' p. 149-150. Kegan paul, Trench, Trubener & Co. Ltd. 1938)

یہی وہ واحد طریقہ ہے جس کے مطابق خدائی پیغمبر اور آسمانی مصلح دنیا میں بھیجے جاتے ہیں۔ اس کے سوا نبیوں اور مصلحین کے مبعوث کیے جانے کا جو بھی تصور یا نظریہ ہے وہ محض بناوٹی اور جعلی ہے اور اپنے اندر کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

ہمیشہ یہی ہوتا ہے اور ہمیشہ یہی ہوتا چلا آرہا ہے کہ جب آسمانی پیشگوئیوں کے مطابق خدائی ماموروں کی بعثت ظہور میں آتی ہے تو وہی لوگ جن کی اصلاح اور نجات کے لئے ان ماموروں کو بھیجا جاتا ہے انہیں شناخت کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ تاریخ کے اس مرحلہ میں وہ پہلے ہی اپنے آنے والے مصلح اور نجات دہندہ کی ہستی کو حقیقت کی بجائے تصوراتی سانچے میں ڈھال چکے ہوتے ہیں۔ وہ توقع یہ کر رہے ہوتے ہیں کہ آنے والے مصلح کا ان کے خواب و خیال میں جو نقشہ بسا ہوا ہے اس کے مطابق ہی کوئی مصلح ان کی نجات کے لئے مبعوث ہو گا۔ جبکہ تاریخی حقیقت اسی انداز میں اپنے آپ کو دہراتی ہے جس انداز میں وہ سب سے پہلے مصلح کی بعثت کے وقت سے اپنے آپ کو دہراتی چلی آرہی ہے۔ آسمانی مصلح ہمیشہ عاجز انسانوں کی حیثیت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ انسانی ماؤں کے بطن سے ہی جنم لیتے ہیں اور اپنی زندگی میں وہ ہمیشہ انسان ہی تصور کیے جاتے ہیں اور انسانوں والا سلوک ہی ان کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ ان کی وفات کے بہت بعد ایسا ہوتا ہے کہ لوگ انہیں خدائی صفات سے متصف کرنے اور انہیں رفتہ رفتہ خدا کا

درجہ دینے کی مساعی کا آغاز کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کی بعثت ثانیہ کے وقت یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ لوگ انہیں آسانی سے قبول کر لیں۔

جب اپنے خیالات کی دنیا میں مگن رہنے والے اس طرح کے مذہبی لوگوں کو آسمانی مصلحین کی صداقتوں کی حقیقتوں سے واسطہ پڑتا ہے جو ہمیشہ عام انسانوں کی طرح ظاہر ہوتے ہیں تو وہ انہیں فی الفور مسترد کر دیتے ہیں۔ جب کوئی کسی پری کے آنے یا بھوت پریت کے ظاہر ہونے کا منتظر ہو وہ اس کی بجائے کسی عام انسان کے ظاہر ہونے کو کیسے قبول کر سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ دنیا مسیح کی بعثت ثانی کو جو پہلے ہی ظہور میں آچکی ہے مشاہدہ کرنے اور پہچاننے میں ناکام رہی۔ اس نے ظاہر ہونے والے مسیح کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔

شاید بعض لوگوں کے نزدیک یہ ایک بہت بڑا دعویٰ ہو (کہ مسیح کی بعثت ثانی پہلے ہی ظہور میں آچکی ہے پر بعثت اولیٰ کی طرح اب کے بھی اسے پہچاننے میں ناکام رہی) اور عین ممکن ہے کہ اکثر قارئین اس دعویٰ کو یکدم مسترد کر دیں اور سوچیں کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ مسیح آیا بھی اور چلا بھی گیا اس حال میں کہ دنیا کو اس کے آنے کی کوئی خاص خبر نہ ہوئی اور اس نے اتنے اہم واقعہ کی طرف کوئی توجہ ہی نہ کی؟ وہ اس طرح کیسے آسکتا اور آنے کے بعد واپس جا سکتا تھا کہ پوری دنیائے عیسائیت اور سارے عالم اسلام نے اس کی طرف کوئی دھیان ہی نہ دیا؟ ازمنۂ جدید نے ایسے بہت سے مدعی دیکھے ہیں جنہوں نے وقتی ہلچل مچائی لیکن آج وہ کہاں ہیں اور کون انہیں جانتا ہے؟ یہ ایک ایسا زمانہ ہے کہ اس میں بہت سے ملکوں میں خودرو پودوں کی طرح نئے نئے مسلک پھوٹ نکلتے ہیں اور اسی طرح وقفہ وقفہ سے مسیح کے واپس آنے کے بڑے ہی انوکھے دعوے یا اس کے عنقریب آنے کا اعلان کرنے والے نقیبوں کے دعوے سننے میں آتے رہتے ہیں۔ شاید یہ دعویٰ بھی ایسے ہی دعووں میں سے ایک دعویٰ ہو سکتا ہے اس لئے ایک سنجیدہ مزاج شخص اس کے متعلق غور اور سوچ بچار سے کام لے کر اپنا وقت کیوں ضائع کرے؟ یہ صحیح ہے کہ اس بارہ میں بڑے ہی گہرے شبہات پیدا ہوں گے اور لوگوں کو ایک عجیب الجھن در پیش آئے گی لیکن ہم ایسے قاری کی توجہ ایک خاص امر کی طرف مبذول کرانے کی جسارت کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ وہ ذرا اس صورت حال کو ذہن میں لائیں اور ذہنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کریں کہ جب مسیح فی الحقیقت دنیا میں آجائے گا لیکن اس سے پہلے ذہنی طور پر یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ کیا اس کا آنا محض ایک خیال یا تصور کی حیثیت رکھتا ہے وہ بنفس نفیس یا اپنے کسی نمائندے کے ذریعہ فی الحقیقت دنیا میں دوبارہ آسکتا ہے؟ قبل اس کے کہ ہم لوگوں کے مندرجہ بالا شبہات کے ازالہ کے رنگ میں کچھ عرض کرنے اور جواب دینے کی

کوشش کریں اس سوال کو حل کرنا ازبس ضروری ہے۔

کیا دنیا(خواہ وہ عیسائی دنیا ہو یا مسلم دنیا) نفسیاتی طور پر اس ذہن اور مزاج کی حامل ہے کہ وہ یسوع کی آمدِ ثانی کو قبول کرنے کے لئے بے تاب بیٹھی ہو؟ اگر وہ اسے قبول کرنے کے لئے تیار ہے تو سوال یہ ہے کہ وہ کس شکل اور انداز میں اس کے آنے اور اسے قبول کرنے پر آمادہ ہے؟ جب مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کے واضح اور غیر مبہم نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو ان کے نزدیک اگر یسوع نے واپس آنا ہی ہے تو بڑی شان و شکوہ کے انداز میں اور بڑے ہی روشن نشانوں کے ساتھ آئے گا۔ وہ بقول ان کے دن کے روشن اُجالے میں آسمان سے، اپنے فرشتوں کا سہارا لیے اس طور سے نازل ہو گا کہ انتہائی شکی مزاج انسان کے لئے بھی اسے قبول کرنے سے انکار کرنا ممکن نہ رہے گا۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ آج کی دنیا کے لئے محض خوابوں کی دنیا میں بسا ہوا ایک خیالی یسوع ہی قابل قبول ہے۔ ایسا یسوع نوع انسان کی پوری تاریخ میں پہلے کبھی ظاہر نہیں ہوا۔ اگر مذہبی تاریخ کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے تو بیسیوں مثالیں ایسی نظر آتی ہیں کہ بانیان مذاہب یا دوسری مقدس ہستیوں کے بارہ میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ سب آسمان کی طرف صعود کر گئے تھے۔ ایسے دعاوی اس قدر وسیع پیمانہ پر اور اس قدر زیادہ تعداد میں ملتے ہیں کہ ان کا شمار بھی مشکل ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ عالمگیر سطح پر انسان میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ اپنے مذہبی رہنماؤں کا مرتبہ بلند کرنے اور انہیں انسانیت کی حدود و قیود سے بالا ہستی کا حامل قرار دینے کے لئے وہ ایسی بے سروپا کہانیاں ضرور گھڑ لیتے ہیں۔ سوال یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ ہم اس نوعیت کی مبیّنہ باتوں کو جنہیں دنیا کے اربوں انسان آج بھی درست تسلیم کرتے ہیں کیسے جھٹلا سکتے ہیں؟ صرف ان مسلمانوں اور عیسائیوں کی تعداد جو ان یا ان جیسے دوسرے انوکھے واقعات پر ایمان رکھتے ہیں اور انہیں دل سے سچا جانتے ہیں دو ارب سے بھی زیادہ ہے سو ایک قاری یہ پوچھ سکتا ہے کہ ہمیں یا دنیا میں کسی اور کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وسیع پیمانہ پر مسلّمہ ایسے عقائد کو غیر حقیقی اور تصوراتی قرار دے کر ان کا انکار کر دیا جائے۔ ہم اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ ایسے دعاوی کو جھٹلانے اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ خود ان مذاہب کے صحائف (اور بالخصوص ان کے قدیم نسخوں) سے ان دعاوی کی تائید نہیں ہوتی، بے انتہا محنت و مشقت درکار ہو گی۔ ایک دفعہ مماثل و متبادل توجیہات و تشریحات کی دھند میں قدم رکھنے کے بعد معاملہ آ کر ختم ہو جاتا ہے انتخاب و ترجیحات پر یعنی کوئی کسی تشریح کو پسند کرتا ہے اور کوئی کسی اور تشریح یا توجیہ کو باقی تمام دوسری تشریحات و توجیہات پر ترجیح دیتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں صحائف یا مرقومہ مذہبی

تاریخ کو لفظاً لفظاً صحیح ماننے یا اسے استعارہ کے رنگ میں تمثیلی حیثیت دینے کا مشغلہ ہر کسی کے لیے ایک کھیل بن کر رہ جاتا ہے۔ اندریں حالات باہم مخالف و متناقض تشریحات کی دلدل میں قدم رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں اور نہ اس طرح یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اس بھاری مشقت سے بچنے اور الجھن سے نکلنے کا ایک راستہ ہم قارئین کو دکھا سکتے ہیں سو ہم انہیں اس راستہ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اب یہ ان کی مرضی پر منحصر ہے کہ چاہیں تو اس راستہ کو اختیار کریں اور چاہیں تو اسے رد کر دیں۔

بحث و تمحیص اور استدلال کی خاطر آیئے ہم ایسے تمام مذہبی رہناؤں کے بارہ میں دعاوی کو کہ وہ آسمان پر چڑھ گئے تھے درست تسلیم کر لیتے ہیں اور انہیں جس طرح کہ وہ بیان کیے جاتے ہیں لفظاً لفظاً درست مان لیتے ہیں۔ اگر یسوع مسیح کے آسمان پر جانے کے مبیّنہ واقعہ کو سطحی انداز میں جوں کا توں تسلیم کر لیا جائے اور اس کی آمد ثانی کو بھی لفظاً لفظاً مبنی بر حقیقت مان لیا جائے تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم دنیا میں بیان کیے جانے والے اسی طرح کے دوسرے واقعات کو درست تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔ الیاس، شاہ عالم یا اسلام میں شیعہ فرقہ کے بارہویں امام یا ہندوؤں کے خداؤں یا دوسری مقدس ہستیوں کے آسمان پر جانے کو (جن کے متعلق گمان کیا جاتا ہے کہ خدا نے ان کی شخصیت میں تجسم اختیار کیا تھا) آخر کیوں درست تسلیم کرنے سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ لہٰذا محفوظ اور بہتر طریق یہی ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ جو ایسی بے سروپا باتوں پر اعتقاد رکھتے ہیں بے مقصد بحثوں میں الجھنے سے پرہیز کیا جائے۔ خیالی پلاؤ کے رنگ میں بے سروپا تصوراتی باتوں پر ایمان رکھنے والے ایسے بھولے اور ضعیف الاعتقاد لوگوں سے پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا وہ ان لوگوں میں سے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ آسمان پر چڑھ کر بہت دور دراز واقع اپنی آسمانی آرام گاہوں میں جا چھپے اور وہیں غائب ہو گئے کسی ایک کے متعلق بتا سکتے ہیں کہ وہ کبھی زمین پر واپس آیا تھا۔ کیا پوری انسانی تاریخ میں سے ایک مثال ایسی پیش کی جا سکتی ہے کہ کوئی شخص جو مبیّنہ طور پر جسدِ عنصری کے ساتھ آسمان پر گیا تھا وہ جسمانی طور پر واپس بھی آیا ہو؟ اگر کوئی ایسی مثال ہے تو ہمیں بھی دکھائی جائے۔

ایسے دعاوی کے کبھی پورا نہ ہو سکنے اور پورا ہونے کی کسی ایک مثال کے بھی موجود نہ ہونے کے پیش نظر ہمارے لیے دو راہوں میں سے ایک منتخب کرنے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ یا تو ہم ایسے دعاوی کو دھوکے یا مغالطہ پر مبنی قرار دے کر یک قلم مسترد کر دیں یا انہیں استعارہ قرار دے کر تمثیلی رنگ میں انہیں قبول

کریں جیسا کہ خود مسیح نے الیاس کی آمد ثانی کے بارہ میں اس کے برنگ استعارہ پورا ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ امر ظاہر ہو جاتا ہے کہ جو لوگ مسیح کے لفظی معنوں میں آسمان سے نازل ہونے کے منتظر ہیں انہوں نے اپنے اور مسیح کی اصل حقیقت کے درمیان ایک رکاوٹ حائل کر دی ہے۔ اگر مسیح دوبارہ آئے گا تو اپنے سے پہلے آنے والے تمام مقدس مصلحین کی طرح ایک انسان کے طور پر ہی آئے گا۔ اگر وہ ایک عاجز انسان کے روپ میں آج آ جاتا ہے اور ایک ایسی سرزمین میں پیدا ہوتا ہے جو فلسطین میں واقع یہودیہ کی سرزمین جیسی ہے اور اسے اس امر پر مامور کیا جاتا ہے کہ وہی کردار پھر ادا کرے جو اس نے اپنی پہلی بعثت کے وقت ادا کیا تھا تو کیا اس بار اس نئی سرزمین کے رہنے والے اس کے ساتھ ایسے طریق اور انداز کا سلوک کریں گے جو اس طریق اور انداز کے سلوک سے مختلف ہوگا جو اس کے ساتھ پہلے یہودیہ میں روا رکھا گیا تھا؟

بعثت مسیح موعود علیہ السلام

ہمارے ایمان اور یقین کی رو سے مسیح کی آمدِ ثانی کی اصل حقیقت وہی ہے جسے ہم نے اوپر بیان کیا۔ ٹھیک آج سے ایک سو سال قبل کی بات ہے کہ خدا کے ایک عاجز بندہ کو جس کا نام مرزا غلام احمد صاحب قادیانی ہے خدا کی طرف سے بتایا گیا کہ مریم کا بیٹا مسیح ناصری جس کے بجنسہٖ آمدِ ثانی کا عیسائی اور مسلمان دونوں یکساں طور پر انتظار کر رہے ہیں خدا کا ایک خاص نبی تھا، تمام دوسرے نبیوں کی طرح وہ بھی وفات پا چکا ہے۔ مرزا غلام احمد صاحب نے اعلان کیا کہ یسوع جسمانی طور پر زندہ نہیں ہے اور نہ اسے کبھی جسمانی طور پر آسمان پر واقع کسی جگہ اٹھایا گیا کہ جہاں قیام کر کے وہ زمین پر دوبارہ نازل ہونے کا انتظار کرے۔ وہ تمام دوسرے نبیوں کی طرح وفات پا گیا تھا، وہ صرف خدا کا ایک نبی تھا، اس سے بڑھ کر اسے کوئی اور درجہ یا مقام حاصل نہیں تھا۔ آپ کو منجانب اللہ بتایا گیا کہ مسیح کی آمد ثانی (جس کے عیسائی اور مسلمان یکساں طور پر انتظار کر رہے ہیں) سے مراد اس کی روحانی آمد ہے نہ کہ جسمانی آمد۔ پھر خدا نے آپ پر یہ بھی انکشاف فرمایا کہ خدا نے آمد ثانی کی پیشگوئی کو پورا کرنے کی غرض سے اس آخری زمانہ میں آپ کو مسیح بنا کر بھیجا ہے۔ مرزا غلام احمد صاحب کا پنجاب کے ایک معزز گھرانے سے تعلق تھا۔ آپ کے خاندان کی تمام تر جدوجہد خاندان کی دولت اور عزت و وجاہت کو بڑھانے اور اضافہ کرنے کے لئے وقف تھی۔ آپ نے اپنے آپ کو اس دوڑ دھوپ اور عام دنیوی مشاغل سے دور رکھا۔ آپ کا اکثر وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے یا مذہبی

کتب کے زیر مطالعہ رکھنے میں گزرتا تھا۔ آپ ایک ایسے شخص کی طرح زندگی گزار رہے تھے کہ جس کی دنیا اور دنیوی مشاغل سے قریباً کوئی تعلق باقی نہ رہا تھا حتی کہ آپ کو اس چھوٹے سے قصبہ میں بھی جہاں آپ پیدا ہوئے تھے کوئی نہ جانتا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ رفتہ رفتہ آپ ہندوستان کے مذہبی افق پر اسلام کے بطل جلیل اور فتح نصیب جرنیل کی حیثیت سے ابھرنا شروع ہوئے اور ایک پاک باز اور مقدس و مطہر انسان کی حیثیت سے آپ کی شہرت پھیلنے لگی اور اس شہرت میں تیزی سے اضافہ ہوتا چلا گیا حتی کہ صرف مسلمانوں میں ہی آپ کو عزت و احترام کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا بلکہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی آپ کا احترام کرنے اور آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ لوگ بالعموم یہ محسوس کرنے لگے کہ آپ ایک ایسے مرد خدا ہیں جس کا خدا تعالیٰ سے براہِ راست تعلق ہے اور خدا جس سے ہم کلام ہوتا ہے۔ جس کی دعاؤں کو وہ سنتا ہے اور ان دعاؤں کے جواب سے جس کو وہ نوازتا ہے اور یہ کہ نوع انسان کے دکھوں کے ازالہ کے لیے جس کی پر خلوص تڑپ ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہے۔

بدقسمتی سے اس زمانہ میں اسلام ہندوستان میں بہت قابل رحم حالت میں تھا۔ عیسائی مشنریوں نے اسے اپنے تابڑ توڑ حملوں کا نشانہ بنایا ہوا تھا اور سلطنت برطانیہ کے طے شدہ اصولی طرزِ عمل کے مطابق انہوں نے نہ صرف اسلامی تعلیمات کے خلاف بلکہ مقدّس بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بھی ایک دل خراش و جگر پاش مہم کا آغاز کر رکھا تھا۔ مزید بر آں ہندوستان کے سب سے بااثر مذہب ہندومت میں بھی دو مقاصد کے پیش نظر انتہائی پر جوش و پرولولہ تحریکیں سر اٹھا رہی تھیں۔ ان کا ایک مقصد تو ہندو ثقافت اور تہذیبی و تمدنی روایات کا از سرِ نو احیا تھا اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی سرزمین سے اسلام اور مسلمانوں کا صفایا کر دیا جائے۔ وہ تحریکیں اسلام اور مسلمانوں کی تصویر کشی اس رنگ میں کر رہی تھیں کہ گویا ہندوستان میں باہر سے آوارد ہونے والے ناقابل برداشت اجنبی ہیں اور انہیں اس سرزمین میں جڑ پکڑنے اور یہاں پھیلنے پھولنے حتی کہ قائم رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ان میں سے سب سے زیادہ جارحانہ تحریک آریہ سماج کی تحریک تھی۔ جس کی بنیاد پنڈت سوامی دیانند سرسوتی (1824ء تا 1883ء) نے 1875ء میں ڈالی تھی۔ حضرت مرزا غلام احمدؑ کے لئے شاید یہ صورت حال مزید محرک ثابت ہوئی اس امر کی کہ آپ دفاع اسلام کی غرض سے مذاہب کے تقابلی مطالعہ اور اس بارہ میں تحقیق و تدقیق کی طرف خاص توجہ دیں۔ اس وسیع مطالعہ اور تحقیق و تدقیق نے اسلامی تعلیمات کی حقانیت اور برتری و بالا دستی پر آپ

کے مضبوط و مستحکم ایمان کو مزید جلا بخشی۔ آپ انسانی مسائل کی گہرائی تک قرآن کی رسائی اور ان کے انتہائی شافی اور کافی حل سے بے حد مسرور ہوئے۔ آپ نے محسوس کیا کہ اسلام انسان کی عادات واطوار اور چال چلن و کردار کی اصلاح کے لئے لائحہ عمل پیش کرنے میں ازراہِ تحکیم ہدایات دینے پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ ان ہدایات کی حکمت واضح کرنے کے لئے نہایت مضبوط منطقی دلائل بھی دیتا چلا جاتا ہے اور وہ دلائل بھی ایسے ہیں جو اس امر کی واقعات اور عملی شہادت کی تائید کے حامل ہیں کہ کسی بھی موضوع پر صورت حال اور اس کے سیاق و سباق میں اسلام کا تجویز کردہ لائحہ عمل ہی موقع محل کے مطابق ہونے کے باعث بہترین راہ عمل ثابت ہوتا ہے اور یہ کہ کوئی اور لائحہ عمل اس کا متبادل ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کدوکاوش اور انتھک جدوجہد کے نتیجہ میں آپ نے اسلام کا جو اس وقت بالکل بے یار و مددگار نظر آتا تھا اس شان سے دفاع کیا کہ آپ اسلام کے بطل جلیل اور فتح نصیب جرنیل ثابت ہوئے بغیر نہ رہے۔ اس طرح اس کڑے وقت میں آپ نے ہندوستان میں دفاع اسلام کے انتہائی اہم تقاضوں کو کمال حسن وخوبی اور مہارت سے پورا کر دکھایا۔ آپ نے ملکی اور قومی سطح پر اسلام کی خدمت کا آغاز نسبتاً چھوٹے حلقہ میں بحث مباحثوں اور مناظروں کے انعقاد سے کیا۔ پھر یہ جدوجہد وسیع تر حلقوں تک ممتد ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ اسلام کے دفاع میں سب سے زیادہ پیش پیش رہنے والے اور غایت درجہ اہل اور طاقتور و جری مرد میدان کی حیثیت سے دور دور تک آپ کی شہرت میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا۔

اسی زمانہ میں آپ نے ادب عالیہ کے انداز کی عظیم ترین مذہبی تصنیف کے ایک طویل سلسلہ کا آغاز کیا۔ آپ کی اس زیر تصنیف کتاب براہین احمدیہ کے متعلق آپ کا منصوبہ یہ تھا کہ آپ اسے پچاس جلدوں میں پایہ تکمیل تک پہنچائیں گے لیکن آپ اس کی پہلی پانچ جلدیں ہی شائع کر سکے۔ دریں اثنا بہت سے ہنگامہ خیز واقعات کی طرف آپ کو متوجہ ہونا پڑا۔ اس کے بعد آپ کے لئے ممکن نہ رہا کہ آپ اس نہایت گہرے اور وقیع علمی کام کو اس کے انجام تک پہنچا سکیں۔ تاہم بعد ازاں آپ نے ضرورت وقت کے تقاضوں کے پیش نظر بہت سی دوسری کتب تصنیف فرمائیں۔ آپ کی یہ کتابیں ان پورے اور مکمل مضامین پر مشتمل تھیں جن کا آپ اپنی ابتدائی تصنیف میں احاطہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے بلکہ اور بہت سے دیگر مضامین بھی ان کتب میں بیان ہوتے چلے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے نہ صرف اپنے وعدہ کو پورا کیا بلکہ اسلام کی تائید وحمایت میں وعدوں سے بڑھ کر تصنیفی کام کر دکھایا اگرچہ ابتداءً امقرر کردہ نام اور عنوان میں تبدیلی

آتی رہی۔ یہ بہت حیران کن بات ہے کہ آپ نے کسی منشی اور کارندہ کی مدد کے بغیر قریباً اکیلے تن تنہا اتنا وسیع لٹریچر کیسے پیدا کر دکھایا؟ جو کتابیں، مکتوبات، مقالہ جات اور رسالے آپ نے تصنیف کیے ان کی تعداد ایک سو دس کے لگ بھگ ہے۔ یہ آپ کے تصنیفی کارنامے ہی نہیں تھے جو پورے برّصغیر میں آپ کی شہرت اور ناموری کا موجب بنے بلکہ آپ کے روحانی اوصاف اور تاثیرات نے بھی وسیع پیمانہ پر آپ کو حاصل ہونے والی شہرت اور عزت واحترام میں بنیادی اہمیت کا کردار ادا کیا۔[13]

بلند وبالا اور وسیع سے وسیع تر ہونے والی شہرت کے جھٹپٹے میں آپ کو خدا کی طرف سے اس امر پر مامور کیا گیا کہ آپ آخری زمانہ کے مصلح کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھائیں۔ جس کی بعثت کے تمام مذاہب منتظر ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ کے رو سے آپ المہدی یعنی خدا کی طرف سے ہدایت یافتہ مصلح تھے۔ نیز عیسائیوں اور مسلمانوں ہر دو کے نقطۂ نگاہ کے رو سے آپ مسیح کی بعثت ثانیہ سے متعلق پیشگوئیوں کو پورا کرنے والے مسیح موعود تھے۔ تاہم خدا کی طرف سے اس عظیم منصب پر فائز کیے جانے کے نتیجہ میں آپ کو اس تمام شہرت اور مقبولیت سے ہاتھ دھونا پڑے جو آپ کو عندالناس حاصل ہوئی تھی۔ آخری زمانہ کے لئے خدا کی طرف سے مبعوث کردہ مصلح حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام کے دعویٰ ماموریت کو نہ صرف دوسرے مذاہب کے ماننے والوں نے فوراً ہی مسترد کر دیا بلکہ خود ہندوستان کے مسلمان یک دم آپ کا ساتھ چھوڑ کر زیادہ شدت کے ساتھ آپ کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے حالانکہ آپ اسلام اور ان کے مفادات کی کمال درجہ جرأت و دلیری اور مہارت سے وکالت کر رہے تھے۔

آپ کے لئے عملاً یہ ایک نئی روحانی پیدائش تھی جیسا کہ آپ دنیا میں اکیلے آئے تھے اسی طرح آپ کو مذہب کی دنیا میں بھی اکیلے تن تنہا انسان کی حیثیت سے زندگی کا آغاز کرنا پڑا۔ وہ تمام لوگ جو پہلے حمایتی کی حیثیت سے آپ کے اردگرد جمع تھے آپ کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ لیکن خدا نے آپ کو نہیں چھوڑا۔ لوگوں کی طرف سے انتہائی شدید مخالفت کے باوجود آپ کو خدا کی طرف سے بار بار نازل ہونے والے الہاموں کے ذریعہ یہ یقین دلایا گیا کہ وہ آپ کی تائید و نصرت فرمائے گا۔ خدا نے اپنے ایک الہام میں فرمایا:

”دنیا میں ایک نذیر آیا پر دنیا نے اس کو قبول نہ کیا لیکن خدا اسے قبول کرے گا اور بڑے زور آور حملوں سے اس کی سچائی ظاہر کر دے گا۔“

13 اس تعداد میں وہ ہزاروں خطوط شامل نہیں جو آپ نے اپنے معتقدین کو لکھے۔ پبلشر

ایک اور موقع پر خدا نے آپ کو الہاماً بتایا:

”میں تیری تبلیغ کو زمین کے کناروں تک پہنچاؤں گا“

یہ ہیں بعض ابتدائی الہامات جو مخالفوں کی طرف سے رد کیے جانے اور اکیلا چھوڑ دیئے جانے کے دوران آپ کے لئے خاص سہارے اور تقویت کا موجب ہوئے۔ اس وقت سے اب ایک سو سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے اور اس عرصہ میں آہستہ آہستہ لیکن کمال تقویت اور دلجمعی کے انداز میں صورت احوال کی جو تصویر ابھری ہے وہ آپ کے دعاوی، پیش گوئیوں اور الہامات کی صداقت کو پوری طرح آشکار کر رہی ہے۔

وہ اکیلا شخص بڑھ کر دنیا کے پانچ براعظموں میں پھیلے ہوئے 134 ممالک میں اب ایک کروڑ انسانوں کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اس کا پیغام کیا مشرق اور کیا مغرب ہر طرف زمین کے آخری کناروں تک پہنچ چکا ہے۔ امریکہ، یورپ، افریقہ اور ایشیا میں نیز بحر الکاہل کے جنوب مشرقی حصہ میں واقع دور و دراز جزیروں جیسے فجی، توالو، سولومن وغیرہ میں اسے مہدی اور بعثت ثانیہ کے رنگ میں ظاہر ہونے والا مسیح موعود تسلیم کرنے والے بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ اس کے باوجود ابھی اس کے ماننے والوں کے بلحاظ جسامت دنیائے عیسائیت کے سمندر کے بالمقابل ایک بے حیثیت چھوٹا سا تالاب قرار دیا جا سکتا ہے۔

حضرت مرزا غلام احمد کی قائم کردہ جماعت کی کامیابیوں کو تفصیل سے بیان کرنے کی اس مختصر مقالہ میں گنجائش نہیں لیکن اس امر کی طرف بطور خاص توجہ دلانا ضروری ہے کہ موجودہ زمانہ میں کوئی اور مذہبی تحریک ایسی نہیں ہے جس نے آپ کی جماعت کی طرح مضبوط قدم اٹھاتے ہوئے اس تیزی سے ترقی کی ہو۔ آپ کی جماعت کی حیثیت نہ کسی مسلک کی ہے اور نہ یہ مقبول عوام پر شوق مشغلہ کی آئینہ دار ہے۔ یہ ایک نہایت سنجیدہ اور اہم پیغام کی حامل ہے اور اس پیغام پر عمل پیرا ہونے کے لئے انتھک جدوجہد اور نظم و ضبط کی ضرورت ہے۔ اور اس میں کامیابی سے ہمکنار ہونا پہاڑ کی چوٹی سر کرنے کے مترادف ہے۔ جو لوگ اس پیغام پر عمل پیرا ہونے کے لئے آمادہ ہوتے ہیں وہ اپنے اندر عظیم ذمہ داریاں ادا کرنے کا پختہ عزم پیدا کر کے زندگی بھر ان ذمہ داریوں کو نبھاتے چلے جاتے ہیں۔ یہ پاکیزگی و طہارت اور اخلاقی اصولوں کی اسی طرح پابندی کی قائل ہے جس طرح ابتدائی ایسین سوسائٹی (Essene Society) کے افراد ان کے پابند تھے۔ مسیح موعود علیہ السلام کی حیثیت سے حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام کے دعوٰی کو تسلیم کرنا رومانوی انداز کے کسی بے قید مشغلہ کی طرح ہنسی کھیل نہیں ہے بلکہ یہ آئینہ دار ہے ایک پختہ عہد کو زندگی

بھر نبھانے اور مسلسل نبھاتے چلے جانے کے عزم مصمم کا۔ اور پھر اس عزم مصمم کو عملاً پورا کر دکھانے کا جو لوگ صدق دل سے آپ کے دعوی کو قبول کر کے اس پر ایمان لاتے اور اس طرح آپ کی قائم کردہ جماعت میں داخل ہوتے ہیں انہیں دنیوی زندگی کے بے مقصد عیش و آرام کو خیر باد کہنا پڑتا ہے لیکن تارک الدنیا راہبوں کی طرح وہ دنیا سے بالکل لاتعلقی اختیار نہیں کرتے۔ انہیں پورے یقین، پختہ ایمان اور دلی بشاشت وطمانیت کے ساتھ زندگی کے صرف بے مقصد مشاغل سے علیحدگی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ یہی چیز انہیں مسلسل قربانیاں کرنے اور اپنے مقصد میں حقیقی کامیابی حاصل کرنے کے قابل بناتی ہے۔ آپ نے اپنی قوت قدسیہ کے زیر اثر ایک ایسی عالمگیر جماعت قائم کر دکھائی جو بڑھ چڑھ کر مسلسل مالی قربانیاں پیش کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اس میدان میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ اس جماعت کے روزی کمانے اور آمد پیدا کرنے والے افراد کو یہ پختہ عہد باندھنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی آمدنی کا کم از کم سولہواں حصہ غلبۂ اسلام کے مقدس مقصد کی خاطر باقاعدگی سے ادا کرتے چلے جائیں گے۔ دنیا بھر میں پھیلی ہوئی اس جماعت کے افراد میں رضاکارانہ قربانی کے جذبے اور رضاکارانہ بے انداز عملی خدمت انجام دینے کی روح دیکھ کر دنیا والے ورطۂ حیرت میں پڑے بغیر نہیں رہتے اور یہ سب کچھ کسی بھی نوعیت کے خفیف سے خفیف جبر کے بغیر خود کار مشینوں کے متحرک پرزوں کی طرح ظہور میں آتا ہے۔ جو اراکین جماعت مالی قربانی اور رضاکارانہ عملی خدمت میں حصہ لینے کی سعادت سے بہرہ ور ہوتے ہیں وہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتے ہیں کہ انہیں ایسا کرنے کی توفیق نصیب ہوئی۔

یہ ایک ایسی جماعت ہے جو اپنے مالی معاملات میں کلی طور پر آزاد اور خود کفیل ہے۔ رضاکارانہ حصہ لینے کا یہ عالمی نظام کمال تقدّس اور پورے استحکام کے ساتھ استواری کی شرط پر پورا اترتے ہوئے قائم و دائم چلا آرہا ہے۔ ایک صدی سے زاید عرصہ گزرنے کے باوجود اس کا خارجی اثرات سے مکمل طور پر محفوظ رہنے کا تمام راز اس کے اس بے نظیر نظام میں ہی مضمر ہے۔ یہ جائزہ تو صرف ایک زاویۂ نگاہ سے اس کے صرف ایک پہلو تک محدود ہے۔ اس جماعت کے اراکین کی کارکردگی کی کیفیت اور معیار کا دوسرے زاویہ ہائے نگاہ سے جائزہ لینے کے نتیجہ میں جو منظر نامہ ابھرتا ہے وہ کچھ کم دل موہ لینے والا نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی جماعت ہے جو اپنے اخلاق، پر امن بقائے باہمی، ایک دوسرے سے محبت اور انسانی اقدار کے احترام میں دوسروں کے بالمقابل نمایاں حیثیت کی حامل نظر آتی ہے۔ یہ ایک ایسی مذہبی جماعت ہے جس کی قانون کے احترام نیز بلاامتیاز مذہب وملت اور بلاتفریق رنگ و نسل مہذبانہ انسانی تعلقات کی خصوصی پاسداری کی

وجہ سے ساری دنیا میں تعریف کی جاتی ہے۔

ایک قاری شاید محسوس کرے کہ ہم جماعت احمدیہ کے اس تفصیلی ذکر کی وجہ سے ایک ایسی سمت کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں جس کا موضوع زیر بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نہایت ادب سے عرض کروں گا کہ اگر کسی قاری کو ایسا گمان گزرتا ہے تو اصل نکتہ تک اس کی رسائی نہیں ہو سکی اس بحث کے ربط کو یسوع مسیح کے ایک ارشاد کی روشنی میں بخوبی سمجھا جا سکتا ہے اور وہ ارشاد یہ ہے۔ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔

”یا تو درخت کو بھی اچھا کہو اور اس کے پھل کو بھی اچھا، یا درخت کو بھی برا کہو اور اس کے پھل کو بھی برا، کیونکہ درخت پھل ہی سے پہچانا جاتا ہے۔“

(متی باب 12 آیت 33)

آج اگر کوئی حضرت مرزا غلام احمد کے دعویٰ کی صداقت کو پرکھنا چاہتا ہے تو بہترین اور سب سے زیادہ قابل اعتماد و یقین معیار صداقت یہی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس درخت کا پھل کیسا ہے؟ اس معیار کے رو سے اس امر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آیا آپ ہی وہ موعود مسیح ہیں جس کے آنے کی پیش گوئی نہ صرف خود یسوع مسیح نے کی تھی بلکہ مقدس بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جس کے ظہور کی بشارت سے نوازا تھا۔ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ آپ نے کس قسم کے پیرو پیدا کئے اور گزشتہ ایک صدی نے ان پر کیا اثر ڈالا ہے بہت مفید اور نتیجہ خیز ثابت ہوئے بغیر نہ رہے گا سوال یہ بھی پیدا ہوگا کہ کیا زمانہ کے لوگوں نے ان کے ساتھ ویسا سلوک کیا ہے جیسا کہ پہلی صدی عیسوی میں یسوع مسیح کے ماننے والوں کے ساتھ کیا گیا تھا؟ پھر یہ سوال بھی ضرور ابھر کر سامنے آئے گا کہ جب آپ کو اور آپ کی جماعت کو صفحۂ ہستی سے نابود کرنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں تو آپ کے ساتھ خدا کا سلوک کیسا تھا؟ کیا خدا کا سلوک آپ کی مظلوم جماعت کے حق میں تھا یا کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ خدا کا سلوک آپ کی جماعت کے خلاف تھا؟ کیا حضرت مرزا غلام احمد کے ماننے والوں نے ابتدائی مسیحیوں کی طرح تمام نامساعد حالات اور مشکلات و مصائب کے دوران خدا کی زبردست تائید و نصرت کو اپنے حق میں نازل ہوتے مشاہدہ کیا؟ اگر ایسا ہوا کہ جب بھی انہیں مصائب و شدائد کی چکی میں پیسا گیا تو پیسے جانے اور سفوف میں تبدیل کیے جانے کی بجائے وہ اس میں سے اور ابھی زیادہ تعداد میں اور پہلے سے بھی بڑھ کر طاقتور بن کر نکلے اور دنیا کے سامنے اور زیادہ نمایاں ہو کر آئے اور زیادہ معزز ٹھہرائے گئے تو پھر یقیناً ایسے مدعی کے دعویٰ کو معمولی سمجھ کر نظر انداز

نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے دعوٰی کو نہ کسی مجنون کی بڑ قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اسے خوابوں کی دنیا میں کھو جانے والے کسی شیخ چلی کے خیالی پلاؤ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ احمدیت ایک ایسی حقیقت ثابتہ کی حیثیت اختیار کر چکی ہے کہ آج ایک صدی کے بعد اس کا مشاہدہ ایک ایسے افق پر کیا جاسکتا ہے جو پہلی صدی عیسوی کے اختتام کے افق سے کہیں زیادہ وسیع تر اور نمایاں تر واقع ہوا ہے۔

یہ ہے معاملہ اور حال احوال ایک ایسے مسیح کا کہ جو کسی فسانہ کا کردار نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت کے طور پر آج سے دو ہزار سال پہلے مبعوث ہوا تھا اور اس زمانہ میں پھر ایسے مسیح کا معاملہ درپیش ہے جس کی بعثت ثانیہ اتنی ہی حقیقی ہے جتنی کہ ایک مامور من اللہ کی حیثیت سے اس کی پہلی بعثت حقیقی تھی۔ اب یہ کلیۃً اس زمان کے لوگوں پر منحصر ہے کہ وہ اگر چاہیں تو قصوں، کہانیوں اور تخیلات کی دنیا میں اپنی زندگی جاری رکھیں اور اپنے اپنے مذہب اور عقیدہ کے مطابق اپنے اپنے موعود مصلح کا ابد تک انتظار کرتے رہیں یا پھر تخیّلات کی دنیا سے باہر آکر اس زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کو قبول کریں۔ ایک بات ایسی ہے جس سے سب کو ضرور اتفاق کرنا چاہیے کہ ایک نہیں بہت سے مذہبی رہنما ایسے گزرے ہیں جن کا مرتبہ عام انسانی درجہ سے بڑھا کر انہیں معبود قرار دے دیا گیا۔ پھر ایک دفعہ نہیں بلکہ بہت مرتبہ ایسا ہو چکا ہے کہ مذہبی رہنماؤں کے متعلق یہ تصور کر لیا گیا کہ وہ مرے نہیں بلکہ زندہ ہی آسمان پر چلے گئے اور وہاں کہیں دور خلاؤں میں واقع اپنی آرام گاہوں میں انتظار کر رہے ہیں کہ وہ وقت آنے پر دوبارہ کرّۂ ارض پر نازل ہوں۔ اس کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے کہ کوئی کیوں ان جملہ دعاوی میں سے ایک دعوٰی کو قبول کرے اور دوسرے کو مسترد کر دے کیونکہ یہ محض دعاوی ہیں۔ ان کی تائید میں کوئی مثبت، حتمی اور سائنسی ثبوت پیش نہیں کیا جاتا اور نہ پیش کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ یا تو سب دعاوی کو قبول کیا جائے یا سب کو ہی مجموعی طور پر مسترد کر دیا جائے۔ یہی ایک منصفانہ اور دیانت دارانہ طرز عمل ہو گا۔ خیالی طور پر آسمان پر زندہ پہنچائے جانے والے مذہبی رہنماؤں کے متعلق ایک بات یقینی ہے کہ ایک دفعہ اپنی زمینی زندگی ختم کر کے یہاں سے جانے کے بعد (بلالحاظ اس کے کہ ان کے ماننے والوں کے نزدیک وہ کس طریق پر یہاں سے رخصت ہوئے) نوع انسانی کی پوری تاریخ میں ان میں سے کوئی ایک بھی زمین پر واپس نہیں آیا۔ مزید برآں ایک اور بات بھی حتمی اور یقینی ہے کہ وہ سب مقدّس روحانی رہنما جنہیں خداؤں کا درجہ دیا گیا یا جنہیں خدا کا شریک ٹھہرایا گیا انہوں نے اپنی زندگیاں عام عاجز انسان کی زندگی ہی گزاری یہاں تک کہ موت نے انہیں آلیا۔ یہ صرف ان کے پیروکار ہی تھے جنہوں نے بعد میں انہیں خدا قرار

دے ڈالا۔ مگر یاد رکھیے ان میں سے کبھی کسی ایک نے بھی قدرت کے نظام کو چلانے میں کسی قسم کا کوئی کردار ادا کرنے کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ہمیشہ سے ایک ہی ہاتھ قوانین قدرت پر حکمرانی کرتا چلا آرہا ہے۔ آسمانوں اور قوانین کے آئینہ میں ہر سطح پر صرف اور صرف ایک خدا کا چہرہ منعکس ہو کر اپنی جلوہ نمائی کر رہا ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے:

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا۔ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا۔ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا۔ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا۔ وَمَا يَنْۢبَغِي لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا۔

(مریم:89-93)

ترجمہ: اور یہ (لوگ) کہتے ہیں کہ (خدائے) رحمان نے بیٹا بنالیا ہے۔ (تو کہہ دے) تم ایک بڑی سخت بات کہہ رہے ہو۔ قریب ہے کہ (تمہاری بات سے) آسمان پھٹ کر گر جائیں اور زمین ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر (زمین پر) جا پڑیں اس لئے کہ ان لوگوں نے (خدائے) رحمان کا بیٹا قرار دیا ہے۔

اختتامی الفاظ

جہاں تک تحقیق و تدقیق کا تعلق ہے ہم نے اپنی طرف سے اس کا حق ادا کرنے میں پوری دیانتداری اور انصاف سے کام لیا ہے لیکن قبل اس کے کہ ہم اس بحث کو یہیں لپیٹ دیں ہم عیسائی دنیا سے بڑے خلوص کے ساتھ پرزور اپیل کرنا چاہتے ہیں کہ وہ زندگی کے ٹھوس حقائق کا سامنا کرنے کے لئے اپنے گھڑے ہوئے بناوٹی عقیدہ کے گنبد بے در یا تنہائی کے خول سے باہر نکلیں۔

یسوع مسیح اپنے دور اور زمانہ کے لحاظ سے بہر طور ایک کامل انسان تھا، انسان سے بڑھ کر کچھ اور نہ تھا۔ وہ خدا کے ایک خاص پیغمبر کی حیثیت سے جسے مسیح کے لقب سے ملقب کیا گیا تھا ان رفعتوں تک پہنچا جن تک پہنچنا اس کے لئے مقدر تھا۔ ان رفعتوں نے اسے موسیٰ علیہ السلام سے لے کر اپنی بعثت تک کے درمیانی زمانہ کے تمام نبیوں میں ایک لاثانی مقام کا حامل بنا دیا۔

یقیناً ہر نبی کے سپرد ایک بہت مشکل کام کیا جاتا ہے اور ایک اہم مشن اسے سرانجام دینا ہوتا ہے۔ اسے مکمل طور پر بگڑے ہوئے اور قسم ہا قسم کی برائیوں میں ملوث انسانوں کی اصلاح کے اہم اور

عظیم الشان کام پر مامور کیا جاتا ہے۔ جہاں تک مسیح کا تعلق ہے اس کے سپرد جو کام کیا گیا تھا وہ اور ابھی زیادہ مشکل تھا کیونکہ اس نے معاشرہ میں عام پائی جانے والی برائیوں اور بدیوں کے خلاف زبردست اصلاحی مہم کا ہی آغاز نہیں کرنا تھا بلکہ اس نے یہودی قوم کے رویہ، رجحان اور طرزِ عمل میں ایک بنیادی تبدیلی لانا تھی۔

جیسا کہ ہر مذہب کے ماننے والوں کے ساتھ ہوتا ہے وہ زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ صداقت کے راستہ سے ہٹنے لگتے ہیں حتی کہ گمراہی و ضلالت اور گناہ کے ویرانہ میں بھٹکنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہودی قوم کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ مسیح کے مبعوث ہونے تک وہ حقیقی معنوں میں روحانی طور پر مردہ ہو چکے تھے۔ روحانی زندگی کا پانی جزر کی حالت اختیار کر کے کم ہوتے ہوتے بالکل معدوم ہو گیا تھا حتی کہ وہ پورے طور پر پتھر دل بن گئے تھے۔ مسیح کے سپرد جو کام کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ وہ ان پتھر دلوں کو روحانی طور پر دوبارہ دھڑکتے ہوئے انسانی دلوں میں تبدیل کر کے انہیں اس قابل بنادے کہ ان میں سے ہمدردی کے چشمے پھوٹنے لگیں۔ یہ وہ عظیم معجزہ تھا جو مسیح کے ذریعہ رونما ہوا اور اس معجزہ میں ہی اس کی عظمت پنہاں ہے۔

آج دنیائے اسلام اور دنیائے عیسائیت مشترکہ طور پر مسیح کی آمدِ ثانی کا انتظار کر رہی ہیں۔ مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کو یہ امر فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ جس مسیح کا اس آخری زمانہ میں آنا مقدر تھا اس نے اپنی خوبو، اوصاف و کردار اور مقصد بعثت کی امتیازی شان کے لحاظ سے لازمی طور پر اسی طرح اور انداز کا مسیح ہونا تھا جیسا مسیح پہلے مبعوث ہوا تھا۔ تاہم بانیٔ اسلام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئیوں کے مطابق اس مسیح نے اپنی بعثت ثانیہ کے وقت دنیائے عیسائیت میں نہیں بلکہ دنیائے اسلام میں مبعوث ہونا تھا بایں ہمہ جو عظیم معجزہ اس نے دکھانا تھا وہ وہی تھا جو اس نے اپنی پہلی بعثت کے وقت دکھایا تھا لیکن اس مرتبہ اس کے سپرد ہونا تھا آخری زمانہ کے مسلمانوں کے دلوں کو بدلنے کا کام۔ اس کی بعثت ثانیہ کے مقصد کی اس تفہیم کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض دوسری احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے پیش گوئی فرمائی تھی کہ آخری زمانہ میں مسلمانوں کی حالت بگڑے ہوئے زمانہ کے یہودیوں کی حالت سے اس درجہ مشابہ و مماثل ہو گی کہ جس طرح جوتیوں کے جوڑے کی ایک جوتی دوسری جوتی کے عین مشابہ ہوتی ہے۔

پس اگر پہلے جیسی بیماری ہی لاحق ہونا تھی تو علاج بھی بعینہٖ پہلے جیسا ہی ہونا تھا۔ مراد یہ کہ مسیح کو واپس آنا تھا اسی عاجزانہ طریق کے مطابق جس عاجزانہ طریق کے مطابق وہ پہلے آیا تھا لیکن اس بار بھی اللہ تعالیٰ

کی سنت قدیمہ کے مطابق جسمانی طور پر نہیں بلکہ روحانی طور پر آنا تھا۔یعنی اسی خُو بُو، انہیں اوصاف اور اسی امتیازی کردار کے ساتھ ایک دوسرے وجود کے طور پر آنا تھا۔ چنانچہ یہی کچھ ہوا اور ظہور میں آیا ہے۔ دنیا میں انقلاب برپا کرنے والی مقدس ہستیاں غیر معروف اور عاجز انسانوں کی طرح ہی پیدا ہوتی ہیں اور عاجزانہ زندگی بسر کرتی ہیں۔ ایسے مقدس لوگ دوبارہ دنیا میں آتے ہیں لیکن آتے ہیں روحانی طور پر البتہ آتے ہیں اسی پہلے والے انداز سے اور پھر ان کے ساتھ وہی کچھ ہوتا ہے جو پہلے ہوا تھا۔ دنیا ویسی ہی درشتی، قساوت قلبی، عصبیت اور جنون کی حد کو پہنچی ہوئی دشمنی کا مظاہرہ کرنے یں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی۔ انہیں کبھی آسانی سے شناخت نہیں کیا جاتا کہ یہ انہیں کے نمائندہ ہیں جنہوں نے ان کی دوبارہ آمد کا وعدہ کے رنگ میں ذکر کیا تھا۔

اپنی بعثت اولیٰ میں مسیح کو یہودیوں کی طرف سے جس سلوک کا سامنا کرنا پڑا تھا لازمی طور پر وہی سلوک اس کے ساتھ اس کی آمد ثانی کے وقت ہونا تھا۔ لیکن اس دفعہ ہونا تھا مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کی طرف سے کیونکہ دونوں ہی اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کو اپنے دوبارہ آنے سے متعلق دونوں کی سراسر لایعنی اور غیر حقیقی توقعات کا سامنا کرنا تھا۔ دنیوی کامیابیوں کے انہیں خیالی مقاصد کے حصول کی تمناؤں سے اس کا واسطہ پڑنا کرنا تھا، اور خود اپنے بارہ میں انہی غیر حقیقی کارناموں کی انجام دہی کے نرالے نظریات سے اس کو دوچار ہونا تھا جن کا مظاہرہ یہودیوں نے یسوع مسیح کی بعثت کے وقت کیا تھا۔ بعثت ثانیہ کے وقت مسلمانوں اور عیسائیوں نے اسی کردار کا اعادہ کرنا تھا۔ یہ امر مقدر تھا کہ تاریخ اپنے آپ کو بعینہٖ پھر اسی طرح دہرائے۔

پیچھے مڑ کر دیکھنے اور تاریخ کے گزرے ہوئے اس دور میں جھانکنے سے اس امر کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ یہودی اپنے مسیح کو شناخت کرنے میں کیوں ناکام رہے تھے۔ ہم ان کی مشکل کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں اور ان کے المیہ سے سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ صحائف کی لفظی اور یکسر سطحی تفہیم نے انہیں گمراہ کیا۔ ان سب باتوں پر پہلے گفتگو ہو چکی ہے لیکن اس مسئلہ پر زور دینے کی خاطر ہم اس کا دوبارہ حوالہ دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ متوقع مذہبی مصلحین کے بارہ میں ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ اکثر لوگ انہیں شناخت کرنے میں ناکام رہتے ہیں کیونکہ ان کی نشانیوں کو غلط رنگ میں لیا جاتا ہے اور ان کے غلط معنی نکالے جاتے ہیں۔ حقیقتوں کو کہانیوں کا درجہ دے دیا جاتا ہے اور استعاروں کے اصل مفہوم سے صرف نظر کر کے انہیں ظاہری الفاظ تک محدود سمجھ لیا جاتا ہے۔

حضرت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ السلام کے وجود میں مسیح کی آمد ثانی کے وقت وہی کہانی پھر دہرائی گئی۔ آسمان سے ایلیا نبی کے نزول کے عقیدہ کے مطابق (جس کا مسیح کے وقت میں یہود انتظار کر رہے تھے) خیال یہ کیا جارہا تھا کہ ایک شخص اپنے انسانی جسم کے ساتھ آسمان سے اترے گا لیکن اس مرتبہ خود یسوع مسیح کے متعلق یہی توقع کی جارہی تھی کہ وہ جسمانی طور پر آسمان سے نازل ہوگا۔

جہاں تک یہود کا تعلق ہے وہ یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ مسیح بڑی شان و شوکت اور جاہ و جلال کے ساتھ آئے گا اور وہ آتے ہی ایک ایسے دور کا آغاز کرے گا کہ جس میں انہیں اپنے رومی آقاؤں پر غلبہ و تسلّط حاصل ہو جائے گا۔ مسیح ناصری کے آنے کے بعد ان کی یہ من مانی توقعات خاک میں ملے بغیر نہ رہیں۔ مسیح کی آمد کی جو خیالی تصویر یہودیوں کے ذہنوں میں صدیوں سے بنتی اور نکھرتی چلی آرہی تھی اس سے آنے والے مسیح کا دور کا بھی کوئی تعلق واسطہ نہ تھا۔

حضرت مرزا غلام احمد قادیانی کے وجود میں مثیل مسیح کی آمد کے وقت مسیح کی بعثت اولیٰ کے واقعات سے ملتے جلتے واقعات کا نمایاں طور پر پھر اعادہ ہوا۔ آپ کے مخالفین نے بالکل وہی کردار ادا کیا جو پہلے مسیح کے ... نے ادا کیا تھا۔ فرق صرف ناموں ہی کا تھا۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کی غالب اکثریت نے یکساں طور پر مسیحِ اوّل کے زمانہ کے یہودیوں کا ہو بہو کردار اپنا لیا۔ اعتراضات میں یکسانیت ہے اور دعویٰ کو مسترد کرنے کی منطق بھی بعینہٖ وہی ہے لیکن خدا نے اپنے اس عاجز بندہ کے لیے سابقہ مسیح کے زمانہ کے بالمقابل اپنی تائید و نصرت کے زیادہ عظیم الشان نشان ظاہر فرمائے اور اس کے پیغام کو دنیا کے تمام براعظموں کے کثیر التعداد ملکوں میں مقابلۃً بہت زیادہ تیزی اور سرعت سے پھیلایا۔ یہ ایسے مبرہن حقائق ہیں جو اپنی دلیل آپ ہیں لیکن انہی کے لیے جو سننے کے واسطے تیار ہوں۔ یہ وہ حقائق ہیں جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ نمایاں اور اجاگر ہوتے جارہے ہیں۔ لیکن انہی کے لیے جو دیکھنے پر آمادہ ہوں۔ مزید برآں ہم عصر مسلمانوں اور عیسائیوں کے طرزِ عمل کے متعلق میں مسیحیائی کے آئینہ دار پیغام کی روح بھی مختلف نہیں ہے لیکن اثر وہی قبول کریں گے جو اپنی آنکھیں اور کان بند نہیں رکھتے بلکہ ان کو کھلا رکھتے ہیں۔

ہم آخر میں عیسائیوں اور مسلمانوں کو جو گزشتہ کئی صدیوں سے مسیح کے دوبارہ ظاہر ہونے کا انتظار کر رہے ہیں اس دور آخر کے لئے خدا کے مقرر کردہ مسیح مرزا غلام احمد قادیانی کے پیش گوئی پر مشتمل الفاظ میں خبردار کرتے ہیں:

”یاد رکھو کوئی آسمان سے نہیں اترے گا۔ ہمارے سب مخالف جو اب زندہ موجود ہیں وہ تمام

مریں گے اور کوئی ان میں سے عیسیٰ بن مریم کو آسمان سے اترتے نہیں دیکھے گا۔ اور پھر ان کی اولاد جو باقی رہے گی وہ بھی مرے گی اور ان میں سے بھی کوئی آدمی عیسیٰ بن مریم کو آسمان سے اترتے نہیں دیکھے گا۔ اور پھر اولاد کی اولاد مرے گیاور وہ بھی مریم کے بیٹے کو آسمان سے اترتے نہیں دیکھے گی۔ تب خدا ان کے دلوں میں گھبراہٹ ڈالے گا کہ زمانہ صلیب کے غلبہ کا بھی گزر گیا اور دنیا دوسرے رنگ میں آگئی مگر مریم کا بیٹا عیسیٰ علیہ السلام اب تک آسمان سے نہ اترا۔ تب دانشمند یک دفعہ اس عقیدہ سے بیزار ہو جائیں گے اور ابھی تیسری صدی آج کے دن سے پوری نہیں ہو گی کہ عیسیٰ کے انتظار کرنے والے کیا مسلمان اور کیا عیسائی سخت نومید اور بدظن ہو کر اس جھوٹے عقیدہ کو چھوڑ دیں گے۔"

(تذکرۃ الشہادتین، روحانی خزائن جلد 20 ص 67)

پس آپ لوگ انتظار کریں یہاں تک کہ ایک نئی نسل پیدا ہو جائے۔ اور اس نئی نسل کے لوگ ابھی انتظار کریں گے تاکہ آنکہ ان کی حیات کا عرصہ بھی پورا ہو جائے گا اور ایک نئی نسل ان کی جگہ لے لے گی۔ انتظار کی یہ کیفیت چاہے دنیا کے اختتام تک جاری رہے آسمان سے کوئی مسیح جسمانی طور پر نازل نہیں ہو گا۔ وہ کتنی ہی تمنا کریں اس کی شخصی اور جسمانی واپسی کی لیکن ان کا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہو گا۔ وہ بھی اپنے لئے ایک دیوار گریہ بنالیں جیسے کہ یہود نے تین ہزار سال پہلے ایک دیوار گریہ بنائی تھی لیکن جو چھ یہود کے معاملہ میں ہوا اب بھی وہی ہو گا۔ ان کے مسلسل یعنی نسلاً بعد نسلٍ گریہ وزاری کرنے اور انتظار کی اذیت اٹھاتے چلے جانے کے باوجود وہ کسی مسیح کو آسمان سے اترتے نہیں دیکھیں گے۔ مستقبل میں مسیح کی آمد کے متعلق امیدوں اور توقعات کے وہ خواہ کتنے ہی ہوائی قلعے کیوں نہ تعمیر کریں کبھی ختم نہ ہونے والی خلا اور جوف غیر مختتم کے سوا ان کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔

ان مسیحیوں کے لئے جو پوری سنجیدگی کے ساتھ مسیح کو خدا کا حقیقی بیٹا یقین کرتے ہیں ہم اس بحث کا اختتام قرآن مجید کے اس انذار پر کرتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا۔ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْؕ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا۔

(الکہف:5،6)

”ترجمہ: اور (نیز اس نے اس لئے اسے اتار ہے کہ) تا وہ ان لوگوں کو (آنے والے عذاب سے) آگاہ کرے جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ نے (فلاں شخص کو) بیٹا بنالیا ہے۔ انہیں اس بارہ میں کچھ بھی تو علم (حاصل) نہیں اور نہ ان کے بڑوں کو (اس بارہ میں کوئی علم تھا)۔ یہ بہت بڑی خطرناک بات ہے جو ان کے مونہوں سے نکل رہی ہے (بلکہ) وہ محض جھوٹ بول رہے ہیں۔“

ضمیمہ

پارتھینو جینیسس Parthenogenesis کی اصطلاح افزائش نسل کے اس نظام کے لیے بولی جاتی ہے۔ جس کے تحت کسی جنسی اختلاط کے بغیر ہی مادین (مؤنث) کا بیضہ تولید از خود زرخیز ہو جاتا ہے۔

یہ نظام تولید حشرات اور مچھلیوں میں بہت عام ہے اور دیگر بھی جانوروں میں بھی پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ تیلی (Aphid) میں۔ جہاں تک رینگنے والے جانوروں کا تعلق ہے تو یہ عمل چھپکلیوں میں جہاں کم اور غیر متوقع بارشیں ہوتی ہیں وہاں اس کے یقینی ثبوت ملتے ہیں۔ 1955ء میں Lancet میں یہ واقعہ رپورٹ ہوا کہ ایک عورت نے ایک بیٹی کو جنم دیا اور اس عمل میں پارتھینو جینس کے عمل کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ یہ عمل ممالیہ (Mammals) میں بھی بطور تجربہ استعمال ہوا ہے۔ لیکن ابھی تک ممالیہ میں ایسی کسی پیدائش کا بیّن ثبوت نہیں ہے۔ اب تک اس حد تک یہ تجربہ کامیاب ہوا ہے کہ چوہے اور خرگوش اس عمل سے حاملہ ہو جاتے ہیں لیکن مدتِ حمل کے دوران ہی وہ مردہ ہو جاتے ہیں اور ان کا اسقاط حمل ہو جاتا ہے۔

اس تحقیق میں یہ عمل دھرایا گیا کہ تازہ انسانی بیضہ اور پہلے سے موجود غیر بارآور بیضہ کو الکوحل اور کیلشیم Ionophore کے ساتھ ملایا گیا اور اس کے متحرک ہونے کا مشاہدہ کیا گیا۔ اس عمل سے یہ بات ابھری کہ انسانی بیضہ کو کیلشیم Ionophore استعمال کرتے ہوئے Parthenogenetically متحرک کیا جاسکتا ہے لیکن یہ تناسب چوہوں میں پائے جانے والے تناسب سے کم ہے۔ انسانی بیضہ آٹھ خلیوں کی تقسیم تک خود باور ہو سکتا ہے۔ ان اعداد و شمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم میں ممکن ہے کہ ایسے بہت سارے انسانی اسقاط حمل ہوئے ہوں جو اس عمل کی وجہ سے زرخیز ہوئے ہوں۔

انسانوں میں جزوی Parthenogenesis کا ایک واقعہ New Scientist کے 7 اکتوبر 1995 کے مضمون "The boy whose blood has no father" کے تحت بیان ہوا۔

مرد کی صورت میں تمام خلیوں میں Y کروموسوم کا ہونا لازم ہے۔ لیکن اس تین سالہ بچے کے سفید خون کے خلیوں میں صرف XX کروموسوم موجود تھے۔ اس خبر کے رپورٹر کے مطابق بعض اوقات chromosomal مادہ کے X کروموسوم میں ہی مردانہ جین موجود پایا گیا۔ تب محققین کا خیال تھا ان کا یہ کیس شاید اسی (Syndrome) کی مثال ہے۔ لیکن جب انھوں نے DNA کی باریک بین تکنیک استعمال کی

تو ان کے علم میں آیا کہ اس لڑکے کے خون کے سفید خلیوں میں Y کروموسوم موجود ہی نہ تھے۔ جبکہ بچے کی جلد جینیاتی طور سے اس کے خون سے مختلف تھی اس میں XY دونوں کروموسوم موجود تھے۔

ایک مزید گہری تحقیق سے ثابت ہوا کہ بچے کے جلد اور خون میں موجود X کروموسوم والدہ سے مشابہ اور والدہ ہی کی طرف سے آئے تھے۔ اسی طرح خون میں موجود دیگر 22 کروموسوم کے جوڑے مشابہ تھے اور تمام والدہ کی طرف سے آئے تھے۔اس کی توجیہہ محققین نے یہ پیش کی کہ غیر زرخیز بیضہ خود ہی متحرک ہو کر مشابہ خلیوں میں تقسیم ہونے لگ گیا اور ان میں سے ایک سیل والد کے نطفہ سے متحرک ہوا اور اس کے نتیجہ میں بننے والے خلیوں کے آمیزے سے نیا embryo جنم لینے لگ گیا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ممالیہ میں جو خلیے parthenogenetically پیدا ہوتے ہیں لازم نہیں کہ وہ معذور ہوں۔ اس بچے کے کیس میں وہ ایک معمول کا نظام خون پیدا کرنے کے قابل تھے۔

Hermaphroditism ایک ایسی معمول سے ہٹ کر جنس ہے۔ جس میں نر اور مادہ دونوں اندرونی جنسی اعضاء موجود ہوں۔ اور بیرونی اعضاء دونوں جنسی اعضاء کی خصوصیات ظاہر کرتے ہوں اور کروموسوم نر اور مادہ (xx/xy) Mosaicism[14] ظاہر کرتے ہوں۔

1990 میں ہالینڈ میں ہونے والی گھریلو خرگوشوں پہ کی گئی ایک تحقیق جس کو Combined Hermaphroditism and Auto-fertilization کا نام دیا گیا محققین کے مطابق ایک حقیقی hermaphrodite خرگوش نے بہت سی مادہ خرگوشوں کے ساتھ اختلاط کیا اور جس میں سے دونوں جنس کے 250 بچے پیدا ہوئے۔ اگلے breeding موسم میں ایک ایسی مادہ خرگوش حاملہ ہوئی جس کو تنہا رکھا گیا تھا اور اس نے دونوں جنس کے 7 صحت مند بچوں کو جنم دیا۔ اُس کو بالکل علیحدگی میں رکھا گیا اور جب Autopsy[15] کی گئی تو اس میں دو متحرک بیضہ دانیاں اور دو غیر زرخیز testes موجود تھے۔جب کروموسوم کا معائنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ Autosomes کی تعداد دوگنی تھی اور دو جنسی کروموسوم غیر یقینی ترتیب کے ساتھ موجود تھے۔

اس تحقیق میں lymphocytes[16], fibroblasts[17], red cell antigens[18] اور انسانی

[14] جب کسی شخص میں جینیاتی طور پر دو مختلف خلیوں کا گروپ پایا جاتا ہو۔

[15] وفات کے بعد لاش کا طبی معائنہ۔

[16] خون میں پایا جانے والا سفید لمفی خلیہ۔

[17] ایسا خلیہ جو جڑے ہوئے ریشوں سے بنا ہو۔

[18] کوئی بیرونی مادہ خصوصاً زہریلا جو جسم میں داخل ہو کر مدافعاتی نظام کو متحرک کر دے۔

سرخ خون کے، خون کے سفید خلیوں کے کروموسوم اور Y-chromosome کی موجودگی اور deoxyribonucleic acid کا مطالعہ کیا گیا۔ نتائج کا موازنہ والدین اور بہن بھائیوں کے خون کے گروپ کے data کے ساتھ کیا گیا۔

اس مطالعہ سے یہ ظاہر ہوا کہ ہمارا مریض ایک Chimera[19] ہے۔ ایک ایسا جاندار جس میں کم از کم دو قسم کے ٹشوز موجود ہوں اور ان کی جنیاتی ساخت مختلف ہو۔ اگرچہ ماں اور باپ دونوں کا حصہ موجود ہو۔ اس کے باوجود کہ اس میں ovotestis موجود ہوں حمل ٹھہرا اور اس نے بچے کو جنم دیا۔

[19]کوئی نامیاتی جسم جس میں کئی طرح کی جینیائی نسیجیں پائی جاتی ہوں۔